شعور و آگہی

افادات : امام عبیداللہ سندھیؒ

مرتب : سید مطلوب علی زیدی

تقدیم و تحقیق : مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

www.rahimia.org

شعور و آگہی

(افکارِ ولی اللّٰہی)

اِفادات

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

مرتب

سیّد مطلوب علی زیدی

تقدیم و تحقیق

مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org

info@rahimia.org /rahimiainstitute

www.rahimia.org

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	—◈—	شعورو آگہی (افکارِ ولی اللّٰہی)
افادات	—◈—	امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ
مرتب	—◈—	سیّد مطلوب علی زیدی
تقدیم و تحقیق	—◈—	مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
سالِ طباعت	—◈—	جنوری 2022ء
ناشر	—◈—	رحیمیہ مطبوعات، لاہور

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org

info@rahimia.org /rahimiainstitute

www.rahimia.org

عرضِ ناشر

بہترین اور عمدہ کتابیں سوسائٹی کی تعمیر و ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ ''شعور و آگہی'' ایک ایسی کتاب ہے جو کہ گزشتہ تقریباً پینتیس سال سے نوجوانوں کو سماجی شعور اور اجتماعی تقاضوں کو سمجھنے کے لیے بڑی ممد و معاون رہی ہے۔ انسانی سماج میں ترقی کے بنیادی اساسی امور کیا ہیں؟ دینِ اسلام کی تعلیمات اس حوالے سے کیا رہنمائی کرتی ہیں؟ اس خطے کے عظیم مفکر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات اور افکار اس سلسلے میں کیا رہنمائی کرتے ہیں؟ ان تمام سوالات کا شافی جواب اس کتاب میں موجود ہے۔ اسی لیے اب تک اس کتاب کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ''رحیمیہ مطبوعات'' لاہور کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں یہ سب سے پہلی شائع ہونے والی کتاب تھی۔ چناں چہ 2009ء میں اس کتاب کا بارھواں ایڈیشن بعض مقالات کے عنوانات میں جزوی تبدیلی کے ساتھ پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ پھر اسی ترتیب کے ساتھ مزید تین چار ایڈیشن شائع ہوئے۔

اب تقریباً دس سال کے بعد یہ کتاب ولی اللّٰہی فکر و فلسفے پر گہری نظر رکھنے والے مفکر جناب مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ کی تحقیق و تخریج اور ترتیبِ نو کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ اس ایڈیشن میں چار نئے مقالات کے اضافے کے ساتھ ساتھ مضامین کے ذیلی عنوانات بھی قائم کر دیے گئے ہیں، تاکہ کتاب کے مطالب سمجھنے میں آسانی ہو۔ نیز تفصیلی حواشی کا بھی آخر میں اضافہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ نیز تین ''سعید'' شخصیات کی تقریظات اور حرفِ فکر بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ امید ہے یہ ایڈیشن قارئین کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ناظم رحیمیہ مطبوعات، لاہور

www.rahimia.org

انتساب

برعظیم پاک و ہند کی آزادی کے عظیم انقلابی رہنما

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیرِ مالٹا

کے نام

جن کی تعلیم و تربیت سے

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ

میں حریتِ فکر اور انقلابی شعور بیدار ہوا۔

www.rahimia.org

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
01	عرضِ ناشر	3
02	اِنتساب	4
03	تقریظ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ	23
04	تقریظ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ	24
05	حرفِ فکر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن	25
06	تقدیم مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری	29
07	حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ؛ نقوشِ زندگی	33
08	امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ؛ شخصیت و کردار	45
09	ابتدائیہ سیّد مطلوب علی زیدی	65
	مقالہ 1 انسانیت کے چار بنیادی اَخلاق	**73-86**
1	اَخلاقی نظریات میں وحدتِ فکر اور طبقاتی فکر کا موازنہ	75
2	اسلام اور عالم گیر وحدتِ انسانیت	76
3	ہر اچھائی قبول کرنے اور ہر بُرائی کو چھوڑنے کا اصول	77
4	قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد	78
5	شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا خاص کمال	79
6	قرآن حکیم تمام قوموں کو ایک نظریے پر جمع کرتا ہے	81

www.rahimia.org

7	انسانیت کے چار بنیادی اَخلاق کا تعارف اور اہمیت	81
8	1۔ پہلا خُلق ؛ طہارت	82
9	2۔ دوسرا خُلق ؛ اِخبات	82
10	3۔ تیسرا خُلق ؛ سماحت	83
11	4۔ چوتھا خُلق ؛ عدالت	84
12	عصرِ حاضر میں دین کے صحیح تعارف کی ضرورت	86
	مقالہ 2 خدا پرستی ۔ انسان دوستی	87-98
1	دینِ حق معلوم کرنے کا طریقہ	89
2	قرآن حکیم کل انسانیت کی کتاب	90
3	انسانی تاریخ کے مطالعے کی اہمیت	90
4	شریعتوں اور ملتوں کے اختلاف کا پسِ منظر	90
5	قرآن حکیم کی حکمت ابدی ہے	91
6	’’حکمت‘‘ اور ’’قانون‘‘ میں فرق	92
7	قرآن حکیم کا اصل مقصد ؛ انسانیتِ عامہ کا تزکیہ	92
8	قرآن کا نصب العین ؛ ایمان باللہ، انصاف اور اخوت	93
9	خدا پرستی کی اہمیت	93
10	انسان دوستی کی اہمیت	93
11	انسان دوستی؛ سیرتِ رسولؐ کی روشنی میں	94
12	انسان دوستی ؛ صوفیائے کرامؒ کی نظر میں	94
13	انسان دوستی پر حضرت ابراہیمؑ کی ایک حکایت	95
14	انسان دوستی کی اہمیت پر حدیثِ نبویؐ	96
15	انسان دوستی اور نظریۂ جہاد کی حقیقت	97

www.rahimia.org

مقالہ 3

99-108
وحدتِ انسانیت

1 نظریۂ زندگی کی اہمیت 101
2 اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں نظریے اور جدوجہد کا باہمی تعلق 101
3 ولی اللّٰہی رہنماؤں نے انسانیت کا نظریہ سکھایا 102
4 قرآن مجید بہ حیثیت ترجمان فکرِ انسانیت 102
5 تمام آسمانی کتابیں؛ ضمیرِ انسانی کی ترجمان 103
6 اسلامی تعلیمات کا اصل نصب العین 103
7 نظریۂ کفر؛ قرآن حکیم کی نظر میں 104
8 قرآنی نظریۂ وحدتِ انسانیت کے عملی تقاضے 105
9 بے روح رسومات و روایات کی حقیقت 105
اصل مذہب اور رسوم کا بنیادی فرق 106
10 افراد و اقوام کا تشخص اور وحدتِ انسانیت 107
11 وحدتِ کائنات کا تصور اور کثرتِ کائنات کا تجزیہ 107

مقالہ 4

109-120
نظریۂ تمدّن

1 تشکیلِ تمدن اور انسانی فطرت 111
2 زوالِ تمدن کا حقیقی سبب 111
3 نئے تمدن کی تشکیل کا راستہ؛ تبدیلیٔ نظام 112
4 تبدیلیٔ نظام کا طریقۂ کار اسوۂ حسنہ کی روشنی میں 113
5 تمدن کی تشکیل و تہذیب میں اَخلاق و فکر کا کردار 114
6 ذہین طبقے کا المیہ؛ تملُّق اور شرک 115
7 معاشرے پر نظامِ نبوت کے انقلابی اور دیرپا اثرات 115

www.rahimia.org

8	قرآن کا پیغامِ انقلاب	116
9	برعظیم پاک و ہند کے نظام کی شکست	118
10	برعظیم کے نظام کی شکست کا تجزیہ	119
11	اپنے فکر پر نیا تمدن اور نظام بنانے کی ضرورت	119
12	نئے تمدن کی بنیاد؛ ماضی کی وراثت اور نئے عناصر کا اِمتزاج	120

مقالہ 5

غلبہ ٔ دین کی عصری اہمیت 121-132

(مولانا سندھیؒ کا ایک معرکہ آرا خطاب)

1	ہندوستان سے باہر جانے کا سبب	123
2	چوبیس سالہ جلاوطنی کے مشاہدات	123
3	تاریخی مطالعے کی روشنی میں میرے اَفکار وتجربات	124
4	تباہ ہوتی ہوئی سلطنتوں اور نظاموں کا مطالعہ	124
5	دیارِ حرم میں حاضری؛ اپنے علوم وافکار پر غور وفکر	125
6	حرمِ اقدس میں غور وفکر کے نتائج اور وطن واپسی کا سبب	125
7	میرے مشاہدات اور تجزیات کا خلاصہ	126
8	1۔سوویت انقلاب کی قوت، وسعت اور شدت کا مشاہدہ	126
9	2۔مسلمان معاشروں کی بے خبری	127
10	3۔تمھارے علما اور اہلِ دانش کی کوتاہ نظری	127
11	4۔طبقاتی مفادات کے حامل تمھارے سیاست دان	127
12	5۔متوسط طبقے کی غفلت اور عوامی حالت	128
13	6۔تمھارے اہلِ فکر وقلم کی محدود دنیا	128
14	دنیا میں آنے والے زلزلوں کو آنکھیں کھول کر سمجھو!	128
15	عالم گیر انقلابات کے بنیادی اسباب	129

www.rahimia.org

16	1۔کماؤ طبقے کی پس ماندگی اور کھاؤ طبقے کی عیاشی	129
17	2۔علم، لٹریچر اور مذہب کے طبقاتی معیارات	129
18	3۔مشین کی ایجاد اور مزدوروں کا اس پر قبضہ	130
19	اس انقلاب میں پس ماندہ طبقوں کی للکار	130
20	اس انقلاب کے فلسفے کا تجزیہ	131
21	انقلاب کے لادینی فلسفے سے بچنے کا واحد راستہ	131
22	انقلاب کے دینی فلسفے کی اہمیت	132
23	دینی انقلاب کا پیغام	132

مقالہ 6

133-140

جہاد اور انقلاب

1	عالم گیر اور ہمہ گیر ایجابی نظریۂ زندگی	135
2	جذبۂ اِنقلاب کے انسانی زندگی پر اثرات	136
3	جہاد و انقلاب کے بارے میں منفی تاثر کی وضاحت	137
4	انقلاب کا اصل مفہوم اور نوعیت	137
5	مستقبل کے انقلابات کی نوعیت	138
6	سائنسی ترقیات کے بارے میں متوازن تجزیہ	139
7	اسلام کا جامع نظریہ	139
8	انسان کا روح الکل سے تعلق ضروری ہے	140
9	اسلام؛ مادی ترقی کا تتمہ اور تکملہ	140

مقالہ 7

141-152

قرآن حکیم کا اعجاز

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اعجازِ قرآن)

1	امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات	143

2 شاہ صاحبؒ کا حکمتِ عملی کی اساس پر نظریۂ اعجازِ قرآن 144
3 اس نظریۂ اعجازِ قرآن کے دو اصول 144
4 اعجازِ قرآن سے متعلق دیگر نظریات 144
5 شاہ صاحبؒ کے نظریۂ اعجازِ قرآن کی اہمیت 145
6 انسانی اَخلاق کے لیے متوازن اقتصادی نظام کی ضرورت 145
7 نظامِ نبوت اور انسانی زندگی کا باہمی تعلق 147
8 شاہ صاحبؒ بہ حیثیتِ مفکر و داعیٔ انقلاب 147
9 امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ بہ حیثیت بین الاقوامی مفکر و عظیم الشان حکیم 150

مقالہ 8

قرآنِ حکیم کی انقلابی تاثیر 153-160

(قرآنی تعلیمات کی تاثیر کا ولی اللّٰہی نظریہ)

1 [1] قرآن بہ حیثیتِ داعیٔ انقلاب 155
2 [2] خیر القرون کی اجتماعی تحریک بہ طورِ تفسیرِ قرآن 156
3 [3] غلبۂ دین کا نظریہ 157
4 [4] انسانیت کے بنیادی چار اَخلاق 158
5 [5] عربِ اوّل کی سیرت بہ طورِ معیارِ عمل 159

مقالہ 9

قرآنی حکمتِ عملی 161-170

1 ارسطو کی حکمتِ نظری اور متکلمین پر اس کے اثرات 163
2 شاہ عبدالرحیم دہلویؒ اور حکمتِ عملی و عقلِ معاشی 163
3 شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے حکمتِ عملی پر مبنی چند اقوال 164
4 1۔ جمہور انسانوں کے لیے کام کرنا 164
5 2۔ عقل مندوں کا طریقۂ زندگی 164

6	3۔ عام مجلس میں گفتگو میں احتیاط کرنا	165
7	4۔ کسی پوری قوم کی بُرائی نہ کرنا	165
8	5۔ اولوالعزم لوگوں کا طریقہ اختیار کرنا	165
9	امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حکمتِ عملی	165
10	شاہ صاحبؒ کے نظریۂ حسن و قبح یعنی برّ و اِثم کی اہمیت	167

مقالہ 10

تصوف؛ تہذیبِ نفوسِ انسانی کا طریقۂ کار

171-186

1	جذبۂ تصوف کی حقیقت	173
2	جذبۂ تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات	174
3	1۔ ایمان اور عقیدے کی پختگی	174
4	2۔ اَنا اور خودی کی بیداری	175
5	3۔ اخلاص و استقامت اور للّٰہیت	175
6	4۔ جرأت اور ہمت کی بالیدگی	176
7	حکمتِ عملی کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت	177
8	امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کے اثرات	177
9	تصوف پر رجعت پسندی اور جمود کے الزام کی حقیقت	178
10	امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ تصوف	179
11	عام صوفیا کے نقطۂ نظر کا نقص	180
12	شاہ صاحبؒ کے نظریۂ تصوف کی جامعیت	181
13	شریعت و طریقت میں وحدت	182
14	شاہ صاحبؒ کے نظریۂ تصوف پر اُن کی کتابیں	183
15	تصوف کے منکرین متجدّدین	184
16	شاہ صاحبؒ کے نزدیک تصوف کی اہمیت	185

www.rahimia.org

مقالہ 11

187-206

ارتفاقات (ارتفاقِ اوّل و دوم)

1	ارتفاق کا مفہوم اور اس کی حقیقت	189
2	ارتفاقات کی چار منزلیں	190
3	ارتفاقِ اوّل	191
4	مفہوم اور حقیقت	191
5	حضرت آدمؑ پر ارتفاقِ اوّل کا الہام	191
6	انسان کی تین بنیادی خصوصیات	192
7	1۔ ''الرّأی الکُلّی'' یعنی رفاہِ عام کا تخیل	192
8	2۔ ''الظّرافۃ'' یعنی شوقِ حسن و جمال	192
9	3۔ ''الإیجاد و التّقلید'' یعنی ایجادات کرنا اور اُن کی تقلید کرنا	193
10	الف: ایجادات کا الہام	193
11	ب: ایجادات کی تقلید	194
12	ارتفاقِ اوّل کا تعارف	194
13	ارتفاقِ اوّل اور قیادت کی ضرورت	194
14	ارتفاقِ اوّل کے بنیادی امور	195
15	1۔ غذائی اجناس کی دریافت اور کاشت کاری	195
16	2۔ کھانے پینے کے طریقے	196
17	3۔ پانی کے حصول کے طریقے	196
18	4۔ اظہار ما فی الضمیر کے لیے زبان کی ایجاد	196
19	5۔ حیوانات کو اپنے کاموں کے لیے استعمال کرنا	197
20	6۔ رہائش کے لیے مکان بنانا	197
21	7۔ جسم ڈھانپنے کے لیے لباس کا استعمال	198

www.rahimia.org

22	8۔ نکاح اور منکوحہ بیوی کا خاص اُسی کے لیے متعین ہونا	198
23	9۔ صنعتی آلات کی تیاری	198
24	10۔ تعاونِ باہمی اور اشیا کے تبادلے کا طریقہ	199
25	11۔ اپنے سربراہ کا انتخاب اور اُس کی اطاعت	199
26	12۔ جھگڑے نمٹانے کا مسلمہ طریقۂ کار کی دریافت	199
27	بہترین اجتماع	199
28	ارتفاقِ دوم	200
29	ارتفاقِ دوم کی حقیقت اور مفہوم	200
30	ارتفاقِ دوم میں مفادِ عامہ کا لحاظ رکھنا	201
31	ارتفاقِ دوم کے بنیادی اُمور	201
32	ارتفاقِ دوم کے پانچ بنیادی شعبے	202
33	1۔ حکمتِ معاشیہ Science of Livelihood	202
34	2۔ حکمتِ اکتسابیہ Science of Professions	202
35	3۔ حکمتِ منزلیہ Science of Home	203
36	الف: خاوند بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق اور اَحکام	203
37	ب: اولاد اور ماں باپ کے باہمی حقوق	204
38	ج: خدمت گاروں کے حقوق	204
39	د: صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے حقوق	205
40	4۔ حکمتِ تعاملیہ Science of Trade	205
41	5۔ حکمتِ تعاونیہ Science of Co-operation	205

مقالہ 12

ارتفاقات (ارتفاقِ سوم و چہارم)

207-222

1	ارتفاقِ سوم	209

2	ارتفاقِ سوم کی حقیقت اور مفہوم	209
3	قومی سیاسی، معاشی اور عسکری نظام کی ضرورت اور فرائض	210
4	حکمران کا انتخاب اور اُس کے اوصاف اور فرائض	210
5	حکومتی شعبے اور ان کے ذمہ داران کے فرائض	211
6	بیت المال کا قیام اور مالی وسائل کی فراہمی	211
7	عسکری طاقت پیدا کرنا اور فوجی نظام کا قیام	212
8	انسانی سماج کی درستگی کے پانچ بنیادی اُمور	212
9	1۔ حرص، بخل اور حسد سے بچانا	212
10	2۔ بداَخلاق لوگوں سے بچانا	212
11	3۔ استحصال کرنے والے شرپسندوں سے بچانا	213
12	4۔ عدل وانصاف کا قیام	213
13	5۔ اَخلاقی اَقدار کا فروغ	213
14	ارتفاقِ چہارم	214
15	ارتفاقِ چہارم کی حقیقت اور مفہوم	214
16	ان ارتفاقات پر تمام عالَم کا اتفاق	215
17	انسانی معاشرے میں ارتفاقات کی چار منازل	216
18	سماجی اداروں کی کمزوری کے اسباب اور ضرورتِ انقلاب	217
19	1۔ مفادِ عامہ کی پامالی	217
20	2۔ حکمرانوں کی نفس پرستی	217
21	3۔ بھاری ٹیکسوں کا بوجھ	218
22	4۔ بے کاری اور بے روزگاری	218
23	5۔ غیرصحت مند پیشوں کا انتخاب	218
24	6۔ مطلوبہ پیداوار میں کمی	218

www.rahimia.org

25	سماج کی درستگی کے لیے عادلانہ معاشی نظام کی ضرورت	219
26	معاشرے کی حقیقت شاہ صاحبؒ کی نظر میں	219
27	حکمتِ الٰہی کا تقاضا اور سماجی بھلائی کا اُصول	220
28	ضرورتِ انقلاب	221
29	غلبۂ دین کے لیے سماجی حکمتِ عملی	222

مقالہ 13

223-236

تاریخِ اسلام کا اجتماعی نقطۂ نظر اور قرآنی انقلاب

1	مطالعۂ تاریخ کے انفرادی نقطۂ نظر کا تجزیہ	225
2	مطالعۂ تاریخِ اسلام کے اجتماعی نقطہ نظر کی اہمیت	226
3	اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے مطالعۂ قرآن	226
4	قریش کا تاریخی تسلسل	227
5	قریش کی اجتماعی حیثیت	228
6	قُصی بن کلاب کی سربراہی میں قریش کی حکومت	228
7	اس حکومت کی بین الاقوامی سوچ	229
8	بنی اسرائیل کی باہمی کش مکش	229
9	قریشِ مکہ کی جدید تنظیم اور جماعتی زندگی	230
10	صحابہؓ کی اجتماعی جدوجہد کی اہمیت	231
11	قرآن؛ ایک جامعِ انسانیت کا نظریہ	232
12	قرآنی نظریے پر جدوجہد کے لیے انقلابی جماعت کی اہمیت	234
13	قرآنی انقلابی جماعت کے تین عناصر	234
14	قرآن کی انقلابی جماعت کا پہلا نمونہ؛ دورِ خلفائے راشدینؓ	235
15	قرآن کی انقلابی جماعت کا دوسرا نمونہ	236

مقالہ 14

اسلام کے عالم گیر انقلاب کی پہلی منزل 237-260

تاریخ اسلام کا عہدِ اوّل

(دورِ نبویؐ و خلافتِ راشدہ)

(ا ر نبوی تا ۴۱ ہجری / 610ء تا 660ء)

1	اسلام کی جامعیت	239
2	قریش کی امتیازی حیثیت	240
3	قرآن کا خطاب؛ قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف	240
4	مکہ میں قریش کا با قاعدہ نظام	241
5	قریش کے اس نظام کی چند بنیادی خرابیاں	241
6	کسی نظام کے مشکل مسائل اور اُن کے حل کی کوشش	242
7	اسلام؛ ظلم کے اس نظام کے خلاف انقلاب	243
8	رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کے دو مقاصد	243
9	بعثتِ محمدیؐ کے بارے میں مؤرّخین کی غلطی	245
10	بعثتِ محمدیؐ کی عمومی نوعیت کا سمجھنا ضروری ہے	245
11	بعثتِ محمدیؐ کی قومی حیثیت کی تکمیل کا دور	245
12	الف: مکی دور؛ انقلابی جماعت کی تیاری	245
13	قرآنی نظریے پر جدوجہد کے لیے انقلابی جماعت کی اہمیت	246
14	ب: بعثتِ نبویؐ کا مدنی دور؛ انقلابی جماعت کی حکومت	247
15	قریش کے تصورِ قومیت میں کل انسانیت کے لیے وسعت	248
16	بعثتِ محمدیؐ کی بین الاقوامی حیثیت کی تکمیل کا دور	249
17	اِرتداد اور ردِ انقلاب کی ناکام کوشش	250
18	قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافتِ راشدہ	251

19 قریش کی قیادت ؛ بعثتِ محمدیؐ کا لازمی نتیجہ 252
20 صحابہ کرامؓ کی مرکزی جماعت میں اختلافِ رائے کی نوعیت 253
21 جماعتِ صحابہؓ کے اختلافات کا درست تجزیہ 256
22 انقلابات کی ایک بنیادی حقیقت 257
23 پارلیمانی نظام حالتِ امن میں کام کرتا ہے 258
24 غیر معمولی حالات میں انقلابیوں کے رویے اور کردار 258
25 اسلام ؛ ایک انقلابی تحریک 259

مقالہ 15

اسلام کے عالم گیر انقلاب کی دوسری اور تیسری منزل 261-278

عربوں کی قومی حکومتوں کا دور

(دورِ اُموی اور دورِ عباسی)

(۴۱ھ تا ۱۳۲ھ/ 660ء تا 749ء)

1 انقلاب کی دوسری منزل ؛ اُموی دور (۴۱ھ تا ۱۳۲ھ/ 660ء تا 749ء) 264
2 بنواُمیہ کے ساتھ مؤرّخین کی ناانصافی 264
3 انقلاب کی دوسری منزل میں نئی انقلابی حکمتِ عملی 265
4 اس دور میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت کی بحالی 266
5 اُموی دور میں اسلام کے زرّیں کارنامے 266
6 اُموی فتوحات کے انقلابی کارنامے 267
7 انقلاب کی تیسری منزل ؛ عباسی دور 269
(۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ/ 749ء تا 1258ء)
8 عرب (اُموی و عباسی) دورِ حکومت کا جائزہ 271
9 تاریخ کے مطالعے کا صحیح طریقہ 271
10 حکومتوں پر فقہا کی نگرانی اور تنقید 274

11	امام ابوحنیفہؒ کا نظریۂ انقلاب	275
12	حکمرانوں پر صوفیاؒ کی نگرانی اور حق کی دعوت	277

مقالہ 16

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا چوتھا دور 279-300

غیر عرب سلطنتیں اور حکومتیں

(1288ء تا 1918ء)

1	غیر عرب قوموں کی اہمیت اور اُن کا دورِ حکومت	281
2	بعثتِ محمدیؐ کا بین الاقوامی تقاضا؛ غیر عرب قومی حکومتیں	282
3	اسلامی اجتماع کی قیادت کے ارتقائی مراحل	283
4	تاریخی مراحل اور ادوار متعین کرنے کے اُصول	283
5	برصغیر کی تاریخ کے پانچ مراحل	285
6	پہلا مرحلہ؛ خلافتِ اسلامیہ عربیہ میں کچھ ہندی علاقوں کی شمولیت	285
7	1۔ پہلا دور (کابل میں اسلام کی آمد)	285
8	2۔ دوسرا دور (سندھ میں اسلام کی آمد)	285
9	دوسرا مرحلہ؛ خلافتِ عربیہ میں ہندی علاقوں پر غیر عربی اقوام کی حکومت	286
10	3۔ تیسرا دور (غیر عربی اقوام کی ہندوستان پر حکومت)	286
11	تیسرا مرحلہ؛ خلافتِ عربیہ کے ماتحت ہندوستانی اقوام کی حکومت	286
12	4۔ چوتھا دور (خلافتِ عربیہ کے ماتحت ہندوستانی اقوام کی سلطنت)	286
13	5۔ پانچواں دور (خلافت کے ماتحت سلطنت اسلامیہ)	286
14	چوتھا مرحلہ؛ ہندوستان میں مستقل ہندوستانی سلطنت کا قیام	286
15	6۔ چھٹا دور (خودمختار ہندوستانی سلطنت کا آغاز)	286
16	7۔ ساتواں دور (خودمختار وطنی سلطنت اور حکومت)	287
17	8۔ آٹھواں دور (ہندوستان کی وطنی سلطنت کا دورِ عروج)	287

18	9۔ نوواں دور (قومی سلطنت میں دین اسلام کی تجدید و تکمیل)	287
19	پانچواں مرحلہ: ہندوستان میں مسلمان، مرہٹہ اور انگریز ملتیں	287
20	10۔ دسواں دور (مرہٹوں اور مسلمانوں کی کشمکش)	287
21	11۔ گیارہواں دور (انگریزوں اور مسلمانوں کی کشمکش)	288
22	12۔ بارہواں دور (انگریز سامراج کی غلامی کا دور)	288
23	ان تاریخی ادوار کے اہم نکات	288
24	چوتھے دور (۴۱۲ھ/ 1021ء تا ۵۴۷ھ/ 1152ء) کے اہم نکات	288
25	ہندوستان کی فتح میں صوفیائے کرامؒ کی کاوشیں	289
26	اس دور میں اللہ کی ''محبتِ ذاتیہ'' کا استنباط کرنے والے اہم صوفیا	289
27	پانچویں دور (۵۴۲ھ - ۷۹۰ھ/ 1147ء - 1388ء) کے اہم نکات	291
28	چھٹے دور (۷۹۰ھ تا ۸۵۵ھ/ ستمبر 1388ء تا نومبر 1451ء) کے اہم نکات	293
29	ساتویں دور (۸۵۵ھ تا ۹۸۲ھ/ 1451ء تا 1575ء) کے اہم نکات	294
30	آٹھویں دور (۹۸۷ھ تا ۱۰۳۶ھ/ 1579ء تا 1627ء) کے اہم نکات	295
31	نوویں دور (۱۰۳۶ھ/ 1627ء تا ۱۱۱۸ھ/ 1707ء) کے اہم نکات	296
32	حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے تجدیدی کام کی اہمیت	298
33	اسلام کی اساسی حکمت، بین الاقوامی ہے	299
34	غیر عرب اقوام کا شاہی دور	300

مقالہ 17

قومی جمہوری تحریکات اور حکومتوں کا جمہوری دور 301-310

(1731ء تا 1941ء)

1	قومی جمہوری حکومتوں کا دور	306
2	قومی آزادی؛ مسلمانوں کی نجات کا راستہ	308
3	قومی تحریکوں کی مخالفت درست نہیں!	309

www.rahimia.org

4 اسلام کے نظریہ سازوں کا موہوم تصور 309

مقالہ 18

311-332

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیاسی تحریک

1 ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط 313
2 اس خطے کے علما اور رہنماؤں کی بالغ نظری 314
3 شاہ ولی اللہؒ کا انقلابی پروگرام 314
4 ولی اللّٰہی تحریک کے ارکانِ اوّل 315
5 ولی اللّٰہی تحریک کا وسیع حلقۂ اثر 316
6 اورنگ زیب عالم گیرؒ کا عہد 316
7 سلطنتِ مغلیہ کا زوال 317
8 انگریز اور علما کے درمیان کشمکش 317
9 شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کا نظریۂ حکمرانی 318
10 شاہ ولی اللہؒ کے اقتصادی اصول 318
11 سیاسیات کے بنیادی اصول 320
12 بنیادی انسانی حقوق 321
13 بین الاقوامی تحفظات 321
14 مذہبیات 321
15 جہاد 322
16 مندرجہ بالا اصول کی تشریح و اقتباسات 322
17 ملکی تباہی کے اسباب 323
18 اقتصادی حالات کا اثر روحانی ترقی پر 324
19 برصغیر کی اقتصادی تباہ حالی اور اس کی وجوہات 325
20 عوام کی خوش حالی کا اُصول 328

www.rahimia.org

21 امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ جہاد 329
22 جہاد کا مفہوم اور دائرۂ کار 329
23 تحریکِ ولی اللّٰہی کا نصب العین؛ ہمہ گیر انقلاب 331
24 فَکُّ کُلِّ نِظَام؛ پروگرام 332

مقالہ 19

333-342

ولی اللّٰہی نظریۂ نبوت، انسانی اجتماعیت اور اقتصادیات

1 امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ نبوت 335
2 علامہ ابنِ خلدونؒ کا نظریۂ نبوت 338
3 ابن خلدونؒ کے اس نظریے کے عربوں کی ذہنیت پر بُرے اثرات 339
4 انسانی اَخلاقیات اور اقتصادیات کا باہمی تعلق 340
5 اقتصادی ضروریات پوری ہونے سے ہی روحانیت ترقی کرتی ہے 341
6 اقتصادی مصیبت سے نجات؛ نبوت کا ایک مقصد 341
7 شاہ صاحبؒ کے فکر کی جامعیت اور عالم گیریت 342

مقالہ 20

343-358

باشعور اور اہل انقلابی قیادت کی عصری اہمیت

1 تُرکوں اور عربوں کا باہمی اختلاف 345
2 مسلمان معاشروں کے فرسودہ طبقات 346
3 مسلمان معاشروں کی نا اہل قیادت 346
4 انقلابی اصولوں پر کام کرنے کی اہمیت 347
5 انقلابی پروگرام کی ترتیب اور اس کی اشاعت 347
6 زمینوں کو وقف کرنے کے دلائل 348
7 زمینوں کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت 348
8 زمینوں کو وقف کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے دلائل 348

www.rahimia.org

9	زمینوں سے متعلق صحابہ کرامؓ کا متفقہ فیصلہ	350
10	زمینوں کے وقف کے سلسلے میں فقہا کی رائے	350
11	حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے	351
12	انقلابی پروگرام کے تقاضے	352
13	مسلمانوں نے اعلیٰ درجے کے مفکرین کی بے قدری کی	353
14	مسلمانوں کی ترقی کا پروگرام؛ نوجوانوں پر اعتماد	354
15	انقلابی پروگرام کے اہم نکات	354
16	1۔ اسلام؛ انسانیت کا عالم گیر پروگرام	354
17	2۔ قومی جمہوری نظام کی اہمیت	355
18	3۔ اسلامی تعلیمات کی اساس پر قومی جمہوری جماعت کی اہمیت	355
19	4۔ اپنی پارٹی کو ان اعلیٰ اصول پر منظّم کیجیے	356
20	5۔ قوم کی صحیح تعریف قبول کیجیے	356
21	دینی انقلاب میں دنیا و آخرت کی جامعیت	356
22	تعلیماتِ انبیاؑ میں ایک انقلابی کے لیے توحید پر ایمان کی شرط	357
23	انسانی روح کا بنیادی تقاضا اور ''محبتِ ذاتیہ'' کی حقیقت	357
24	توحیدِ الٰہی سے انسان میں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوتا ہے	358
--	**حوالہ جات وحواشی**	**359**

☆

تقریظ

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

سابق صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، و پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند (انڈیا)

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ ان عظیم علما اور مفکرینِ اسلام میں سے ہیں، جن کی ہر تحریر اور تقریر اربابِ ذوق کے لیے حرزِ جاں ہوتی ہے۔ مولاناؒ کی اور مولاناؒ پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور علما میں مقبول ہیں۔

اگرچہ مولاناؒ کے خیالات و افکار کو قلم بند کرنے والوں میں سے بعض نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کردی ہیں، جو غلط ہیں، تاہم ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولاناؒ کے جو مقالات اِدھر اُدھر مختلف مجلّات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، وہ بجائے خود بہت مفید ہیں۔

محترم سیّد مطلوب علی زیدی صاحب نے خوب کیا کہ ان منتشر مضامین کو یک جا کر کے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مولاناؒ کے یہ مضامین جو مختلف عنوانات پر ان کے خاص افکار کے حامل ہیں، ان کا بہ یک وقت مطالعہ ہوسکے گا۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

سعید احمد اکبر آبادی

www.rahimia.org

تقریظ

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نوّر اللّٰہ مرقدہٗ

مسند نشین رابع سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

دینی فہم و بصیرت اور عقل وشعور ہر دور کا اہم ترین تقاضا رہا ہے۔ قرآنی تعلیمات، انبیا علیہم السلام کی سیرت و کردار اور اکابر اولیاء اللہ کے ملفوظات میں اس پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ بالخصوص آج زوال کے دور میں جب کہ ظالمانہ نظام کے پیدا کردہ ماحول میں نوجوان نسل کو گمراہ کر کے دین سے دور کیا جا رہا ہے اور عقل وخرد سے بیگانہ کر کے دنیا و آخرت کی تباہی کا سامان پیدا کیا جا رہا ہے، بڑی ضرورت ہے کہ اکابر اولیاء اللہ کی سچی تعلیمات کا تعارف نوجوان نسل کے سامنے رکھا جائے۔ خاص طور پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کی وہ جامع تعلیمات جو دینی عقل وشعور پیدا کرنے اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا جامع نظریہ اور نظامِ فکر وعمل پیش کرتی ہے، کا تعارف بڑا ضروری ہے۔

اس دور میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بہترین شارح امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کے رکن رکین ہیں۔ وہ ان کے فکر وعمل کے صحیح وارث ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں مولانا سندھیؒ کے ان علوم وافکار کو جمع کیا گیا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تعلیمات سے خوشہ چینی پر مبنی ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو نوجوان نسل تک پہنچانے والوں کے اس جذبہ کو قبول کرے اور نوجوانوں کو اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق دے۔

سعید احمد رائے پوری

۱۲ مئی ۲۰۰۹ء، لاہور

حرفِ فکر

بیسویں صدی عیسوی میں عالمی استحصالی قوتیں مسلسل اندرونی مزاحمت اور عالمی حالات کے دباؤ کے نتیجے میں اپنی مقبوضہ دنیا پر براہِ راست قبضہ اور غلامی کی سیاست سے پسپا ہوئیں۔ اس طرح تیسری دنیا کی اقوام کو آزادی کی نوید ملی، مگر جدید نوآبادیاتی دور پاکستان اور دیگر سابقہ مقبوضات میں نظریاتی اُلجھاؤ، فروعی مباحث، آلۂ کار سیاست، قرضے کی معیشت اور فرسودہ ریاستی نظام کا منفی پیغام لایا۔ جس کے سبب یہ معاشرے فکری انارکی، معاشی استحصال، سیاسی انتشار، اَخلاقی اِنحطاط اور سماجی شکست و ریخت کی آماج گاہ بن گئے۔ چوں کہ موجودہ تمدن کی بُنت ہی طبقاتی تانے بانے سے ہوئی ہے، اس لیے اصلاح و ترمیم اور تبدیلی کی ہر کوشش راستے میں دم توڑ جاتی ہے اور صورتِ حال مزید بھیانک ہوجاتی ہے۔

تمدن کی اس فرسودگی کو برعظیم ہند پر بدیشی نوآبادیاتی حکومت کے مسلط ہونے سے کہیں بیشتر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آشکار کردیا تھا۔ انھوں نے ایک صالح اور انسان دوست سماج کے قیام کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے روگی سماج اور عوام الناس پر بوجھ بننے والے نظام اور اس کے عناصر سے مکمل بے زاری کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس نظام کے خلاف انقلاب لانے کے لیے ایک مربوط اور ترقی بخش نظامِ فکر دیا، تاکہ سوچنے سمجھنے والا طبقہ اپنی فکر کو وسعت اور بالیدگی سے آراستہ کرے۔ اپنے ذہن میں کل انسانیت کی فلاح کو اپنے مقصدِ جدوجہد کے طور پر متعین کرے۔ ہمہ قسم کی فرقہ واریت، نسل پرستی، طبقاتیت اور تقسیمِ انسانیت کی تمام صورتوں کو مظاہرِ کفر تصور

کر کے رد کر دے۔ سوسائٹی کا باشعور طبقہ معیشت، سیاست، علم و ادب اور مذہب سمیت جملہ شعبہ ہائے زندگی کے طبقاتی معیارات کو کسی شکل میں قبول نہ کرے۔

اسلام نے ایمان باللہ کا ایک جامع عقیدہ اور متحرک نظریہ اسی لیے عطا کیا ہے کہ وہ انسان اور اجتماعِ انسانی کی ہمہ جہت ترقی کی اساس مہیا کرتا ہے۔ اس کی نظر میں انسانی سماج کی مادی ترقی بھی اس لیے ضروری قرار پاتی ہے کہ وہ اس کو حیوانی دائرے سے اُٹھا کر انسانی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے۔ جہاں سے اس کی ذہنی ترقی کا اُفق' ذاتِ الٰہی کے ماورا مادہ تصور سے ربط و تعلق کے لائق قرار پاتا ہے۔ اس کے سبب انسانی ذہن، تنگنائیوں اور محدودیتوں سے نکل کر وسعتوں سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

اسلام نے ایمان باللہ کے اعلیٰ نصب العین کی عملی تشکیل کے لیے قرآن حکیم کو نصابِ زندگی متعین کیا اور اس کا تفصیلی لائحۂ عمل' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تربیت یافتہ اجتماعیت نے مرتب کیا۔ اس کے نتیجے میں مکہ مکرمہ میں خلافتِ باطنہ کی صورت میں قائم اجتماعی نظام اور مدینہ منورہ میں خلافتِ ظاہرہ کی شکل میں ظہور پذیر ہونے والا ریاستی نظام' بعد کے ادوار کے لیے اُسوہ اور نمونہ قرار پایا۔

اُمتِ مسلمہ کا قرآن حکیم کے معجزہ ہونے پر تو اجماع و اتفاق ہے، مگر اس کو محض مقدس جان کر اجتماعی اور عملی رہنمائی کے تقاضوں سے ماورا تصور کر لیا گیا، جب کہ حقیقت اس سے کہیں مختلف، بلکہ متضاد ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تو قرآن حکیم کے اعجاز کا مظہر اس کے بیان کردہ نظامِ حیات کو قرار دیا ہے، جس میں معاشی توازن و اعتدال اور حقِ معیشت میں مساوات کو اَساسی اور لازمی حیثیت حاصل ہے۔

شاہ صاحبؒ کی فکر میں نیکی اور بدی کے تصورات انفرادی اَخلاقیات کے بجائے انسانیت کے اجتماعی تقاضوں کے تناظر میں متعین ہوتے ہیں۔ اسی لیے انسانیت گیر اجتماع کی تشکیل کے لیے وہ اَخلاقِ اربعہ — طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت — کو بنیاد و اَساس قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں اجتماعی نظریۂ انقلاب کے لیے تہذیبِ نفس اور تزکیۂ قلب کو ناگزیر اہمیت حاصل ہے کہ شعوری ایمان کی پختگی، اخلاص و استقامت،

انسانی خودی کی بیداری اور جرأت و بلند ہمتی ہی عادلانہ سماج کے قیام اور اس کی بقا کے لیے جدوجہد کی راہ دکھاتی ہے اور اس راہ پر ثابت قدم رکھتی ہے۔ نیز ہر قسم کی مایوسی، تنگ نظری اور رجعت پسندی سے حفاظت کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ غیر طبقاتی سماج اور عادلانہ معاشرے کے قیام کے لیے محض جذبات کا اظہار ناکافی، بلکہ بسا اوقات بے معنی ہوجاتا ہے۔ جب تک کہ سماجی تبدیلی کے نظریے کی شعوری اور علمی اساس کی وسعت اور گہرائی سے آگہی نہ ہو کہ اس کی بنیاد پر ہی تربیت و تنظیم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ دراصل شوقِ انقلاب کے ساتھ ذوقِ انقلاب کی آبیاری بھی ضروری ہے۔ جو تخلیقی اور تعمیری سوچ کی صورت گری کرتا ہے اور مثبت رویوں کو استحکام بخشتا ہے۔

اس کے نتیجے میں نئے اور عادلانہ تمدن کی تشکیل کا سفر صِفر سے شروع کرنے کے بجائے آگے بڑھنے کے لیے معروضی تقاضوں کا فہم و ادراک ناگزیر قرار پاتا ہے۔ چناں چہ ضروری ہوجاتا ہے کہ انسانی سماج کے تاریخی تسلسل کے صالح اجزا کا درست ادراک کیا جائے اور ان سے بھرپور استفادہ کرکے ان کو نئی تعمیر کے لیے حسبِ ضرورت پیشِ نظر رکھا جائے اور فاسد اجزا اور عناصر کا مکمل قلع قمع کیا جائے۔ یہی وہ مقدس جہاد ہے، جس میں بدی کے محور سے کسی طور سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

زیرِ نظر 'بصیرت افروز اور فکر انگیز مقالات' درحقیقت موجودہ فرسودہ اور ناکارہ نظام کی جگہ ایک نئے، بہتر اور صحت بخش عادلانہ نظام کی شعوری تشکیل کے تقاضوں کی آگہی مہیا کرتے ہیں اور ان کی اساس پر ذہنی، نفسیاتی، اَخلاقی، سیاسی اور سماجی تربیت کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ان مقالات سے ولی اللّٰہی فکر کی درست سمت میں تفہیم کا باب کھلتا ہے۔ اس فکر نے ایک روشن تاریخی تسلسل کے ساتھ عہدِ حاضر تک جو سفر کیا اور فکری و عملی جدوجہد کے جو سنگِ میل عبور کیے، یہ مجموعۂ مقالات اس کی خاطر خواہ نمائندگی کرتا ہے۔

خاص طور پر امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے ولی اللّٰہی فکر کے معروضی تقاضوں کو جس انداز سے اُجاگر کیا اور اس کی ترویج و تشریح میں جو بے مثال اور انتھک کردار ادا کیا، وہ آج کے باشعور طبقے کے لیے ایک قابلِ قدر فکری اَثاثے کی حیثیت

رکھتا ہے۔ یہ انداز و اُسلوب نوجوانوں کو فکری جمود، ذہنی مرعوبیت، پژمردگی اور حالات کے سامنے سِپر ڈالنے سے روکتا ہے۔ انھیں مایوسی کے عالَم میں ایسی قباحتوں کے مقابلے اور قیامت کے انتظار کے بجائے حوصلہ اور ولولہ عطا کرتا ہے۔

عصرِ حاضر میں امامِ عزیمت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کی اس روشن اور جان دار فکر کے فروغ اور اس کو نوجوانوں کے حلقوں تک منتقل کرنے کے لیے بے لوث اور غیر متزلزل جہدِ مسلسل کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ اس کے نتیجے میں ان کی صدائے فکر و عمل نے نوجوانوں میں عزمِ انقلاب کی روح پھونک دی ہے اور یوں منفی اَفکار اور فرسودہ تصورات کے خلاف فکری مزاحمت کی ایک داستان رقم کی ہے۔

مجموعۂ مقالات کا زیرِ نظر ایڈیشن اس حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مطبوعہ مقالات میں مفید اضافے کیے گئے اور جہاں تشریح طلب اُمور تھے، ان کی وضاحت شامل کی گئی ہے۔ مثلاً نظریۂ نبوت کے بارے میں علامہ ابن خلدونؒ اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت ان کی اپنی عبارات کی روشنی میں کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ چار مقالات مزید شامل کیے گئے ہیں، جن سے اس مجموعے کی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔ اس تمام علمی کاوش کی ترتیبِ جدید میں حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلۂ نے اپنے رفقا کے تعاون سے جو شبانہ روز کاوش اور محنت کی ہے، وہ لائقِ استفادہ اور قابلِ تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اکابرِ حق کے فیض کو جاری و ساری رکھے، تاکہ شعور و آگہی کے دیوں سے دیے جلتے رہیں۔ بالآخر ظلمتوں کے نظام کو دیس نکالا ملے اور ہمیں اس فیضِ فکر سے استفادے کی توفیقِ مرداں عطا کرے۔ آمین!

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن
سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان
۱۲/ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ/ 10/ دسمبر 2019ء

تقدیم

دورِ حاضر کا تقاضا ہے کہ انسانی معاشروں میں پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے غور وفکر اور شعور و آ گہی سے کام لیا جائے۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ اس دور کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایک روشن نظامِ فکر وعمل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں میں دینی تعلیمات کے تناظر میں سیاسی، معاشی اور سماجی حوالے سے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے ایک جامع نظریۂ زندگی اور پُر جوش نظامِ فکر وعمل ملتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکارِ عالیہ کو متعارف کرانے میں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی سعی، کوشش اور جدوجہد کا بڑا اہم کردار ہے۔ حضرت سندھیؒ نے برصغیر پاک و ہند کی آزادیٔ وحریت اور قومی اور بین الاقوامی سیاست کے میدان میں پچاس سال خدمات سرانجام دی ہیں۔ انھوں نے اس دور کے سلگتے ہوئے سیاسی، معاشی اور فکری مسائل پر مسلسل غور وفکر کیا۔ اس حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دور کے مسائل کے حل کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ کے افکارِ عالیہ کو دورِ جدید کے تقاضوں کے تناظر میں مرتب و مدوّن کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔

زیرِنظر کتاب ''شعور و آ گہی'' حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے اُن افادات پر مشتمل ہے، جو انھوں نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کی اساس پر جدید اسلوب میں مرتب و مدوّن فرمائے ہیں۔ اس کتاب میں اُن کے افکارِ عالیہ کے اقتباسات

مرتب کر کے یک جا کر دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں شامل تمام مقالات اور مضامین کا بنیادی ماخذ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شاہکار کتابیں **"حُجّةُ اللّٰه البالغه"**، **"إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء"**، **"البُدور البازغه"**، **"سطعات"** اور **"التّفهيمات الإلٰهيه"** وغیرہ ہیں۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ان کتابوں پر گہری نظر رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کے مطابق اپنے علوم و افکار مرتب اور مدوّن کیے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا سندھیؒ کی اپنی تحریر کردہ کتابیں، خاص طور پر **"التّمهيد لتعريف أئمّة التّجديد"**، "خطبات و مقالات" اور اُن کی زندگی میں شائع ہونے والی اُن کی تعلیمات اور حالاتِ زندگی پر مشتمل کتابوں کے اقتباسات سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب دورِ جدید کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے غور وفکر کے کئی نئے زاویے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کا مقصد نوجوانوں کے سامنے روایتی اور رسمی اندازِ فکر و عمل کے بجائے انقلابی حوالے سے شعور و آگہی کے نئے زاویے پیش کرنا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سوچنے سمجھنے والے نوجوانوں کے سامنے دورِ حاضر کے سلگتے ہوئے اجتماعی مسائل پر بحث و مباحثہ اور غور وفکر کے دروازے کھلے۔ ان میں جمود و تنگ نظری کے بند دریچوں سے نکل کر انسانی مسائل کے حل کرنے کی عقل و دانش پیدا ہوئی۔ یہ کتاب فتویٰ کی زبان میں نہیں لکھی گئی، بلکہ سوچنے سمجھنے اور مسائل کو نئے زاویے سے پرکھنے اور اس پر مکالمہ کرنے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس میں روایتی اندازِ فکر سے ہٹ کر کوئی چیز ہے تو وہ بحث و مباحثے کے لیے ہے، جس پر غور وفکر کر کے حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی نگرانی میں ہوئی۔ وہ ایک ایسی عظیم شخصیت ہیں، جنھوں نے پاکستان میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے سلسلے سے وابستہ علمائے ربانیین سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امامِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور اُن کے تلامذہ بالخصوص امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے علوم و افکار کو نوجوانوں کے ذہنوں میں منتقل کرنے کے لیے پچاس سال تک خدمات سرانجام دی ہیں۔

انھوں نے نہ صرف نوجوانوں کو ولی اللّٰہی فکر کے انقلابی پہلوؤں سے آگاہ کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے، بلکہ علمائے محققین اور جدید عصری تعلیم کے پروفیسرز اور ڈاکٹرز میں بھی اس حوالے سے بڑا کام کیا ہے۔ چناں چہ حضرت اقدس رائے پوریؒ نے ایسے جدید و قدیم تعلیم کے حاملین کی ایک مجلس ترتیب دی۔ انھوں نے آج سے تقریباً چالیس سال پہلے یہ کتاب ''شعور و آگہی'' مرتب اور مدوّن کی۔ اس مجلسِ ترتیب کے ناظم اور ناشر جناب سیّد مطلوب علی زیدی نے بعدازیں اس کتاب کی نوک پلک سنواری اور اشاعت کا اہتمام کیا۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے بعد محققین علمائے کرام نے اس پر تقریظات لکھیں۔ چناں چہ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے تلمیذِ رشید مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ جیسے نام ور لوگوں نے اس کتاب کے مقالات میں بیان کردہ علوم و افکار کی تصدیق و تائید کی۔ مولانا اکبرآبادیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل، ندوۃ المصنّفین دہلی سے شائع ہونے والے مؤقر جریدے ''برہان'' دہلی کے مدیرِ اعلیٰ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی دینیات فیکلٹی کے سربراہ، شیخ الہندؒ اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے ڈائریکٹر اور سینکڑوں کتابوں اور مقالہ جات کے مصنف ہیں۔

اسی طرح خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے چوتھے مسند نشین حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ نے نہ صرف اس کتاب کی ترتیب و تدوین کی نگرانی کی، بلکہ اس پر اپنی وقیع رائے دیتے ہوئے ایک مؤقر تقریظ قلم بند فرمائی۔ آپؒ حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے خلیفہ مجاز، حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کے جانشین اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے فکر کے وارث تھے۔ انھوں نے ہزاروں نوجوانوں کو اس برعظیم پاک و ہند کے سچے علمائے ربانیین، بالخصوص ولی اللّٰہی سلسلے کے علمائے حق سے متعارف کرایا، اور انھیں دینی شعور سے وابستہ کرنے کے لیے بڑی عظیم

جدوجہد اور کوشش کی۔ ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی تلمیذِ رشید حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے پیر جھنڈو (سندھ) میں ایک ملک گیر اجتماع میں فرمایا کہ: ''اس زمانے میں حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ حضرت سندھیؒ کے فکری جانشین ہیں۔''

اسی طرح پاکستان کے مؤقر تعلیمی ادارے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ علومِ اسلامیہ کے سابق سربراہ ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن نہ صرف اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں شریک رہے، بلکہ انھوں نے اس کتاب پر وقیع ''حرفِ فکر'' لکھ کر مقالات کی اہمیت واضح کی۔ اس طرح تین ''سعید'' روحوں نے اس کتاب کی اہمیت اور واقعیت واضح کی ہے۔

اس کتاب نے اپنی پہلی اشاعت (1985ء) سے لے کر اب تک سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں اور فکر و شعور کے متلاشی علم دوست احباب کی علمی اور فکری تشنگی کو دور کیا ہے۔ انھیں سوچنے سمجھنے کے نئے انداز سے آگہی بخشی ہے۔ کتاب کے قارئین نے فکرِ فردا کا شعور حاصل کیا ہے۔ اپنے فکر و عمل کی تگ و تاز میں اس سے رہنمائی حاصل کی ہے۔

کتاب کے زیرِ نظر ایڈیشن میں ترتیبِ نو کرتے ہوئے چار مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کے کل مقالات 20 ہوگئے ہیں۔ خاص طور پر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی کتاب ''التّمهيد لتعريف أئمّة التّجديد'' اور ''خطبات و مقالات'' سے ماخوذ ایک اہم مقالہ ''باشعور اور اہل انقلابی قیادت کی عصری اہمیت'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے اس کتاب کے حوالہ جات کی مکمل تخریج اور تحقیق کی ہے۔ بعض جگہوں پر بریکٹ میں مفید اضافے، وضاحتیں اور مقالات کی ترتیبِ نو بھی کی ہے۔ خاص طور پر مضامین کے ذیلی عنوانات بھی قائم کردیے گئے ہیں۔ اس طرح مطالعہ کرنے کے لیے یہ ایڈیشن زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔

مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور
۱۴/ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ/ 12/دسمبر 2019ء

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ

نقوشِ زندگی

امامِ انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنے افکارِ عالیہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کے افکار و نظریات اور اُن کی حکمت اور فلاسفی کی اساس پر مرتب و مدون فرمائے ہیں۔ اس لیے کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نقوشِ زندگی کا ایک مختصر خاکہ ''شعور و آگہی'' کے قارئین کے لیے پیش کر دیا جائے۔ تاکہ اس دور کے مجدد حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی کے حالات و افکار اور اُن کی کتابوں میں بیان کردہ نظریات کے ارتقا وتطوّر کا صحیح طور پر اندازہ ہو جائے۔

www.rahimia.org

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ

اسم مبارک اور خاندان

شاہ صاحب کا نام ''احمد'' ہے اور ''ولی اللہ'' عرفیت ہے۔ آپؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ ابوالفیض ہیں۔ جو اپنے وقت کے جید علما میں سے تھے۔ وہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک رہے تھے۔ آپؒ کی والدۂ ماجدہ سیدہ ''فخر النساء'' ہیں، جو شیخ محمد پھلتیؒ کی بیٹی تھیں اور نہایت عابدہ، زاہدہ اور عالمہ خاتون تھیں۔ شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی جانب سے حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔ اور والدۂ ماجدہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظمؒ اور حضرت علیؓ تک جاتا ہے۔ [1]

وِلادت با سعادت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ولادت باسعادت ضلع مظفر نگر کے قریب واقع قصبہ ''پُھلت'' میں ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ/ 21؍فروری 1703ء، بروز بدھ، بوقت طلوعِ آفتاب ہوئی۔ یہ سال علویّین (سورج اور چاند) کے قِران کا سال تھا۔ آپؒ کے شاگرد مولانا محمد اعظم کشمیریؒ نے تاریخ ولادت درجِ ذیل کے مصرعے سے نکالی ہے: ع [2]

''ابرِ کرم ، بحرِ حِکم ، عالی نسب ، والا مکان''

تعلیم و تربیت

شوال ۱۱۱۹ھ/فروری 1708ء میں پانچ سال کی عمر میں مکتب میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے اور سات سال کی عمر میں قرآن حکیم ختم کیا اور دہلی میں مروّجہ نصابِ تعلیم کے

www.rahnuma.org

مطابق علوم وفنون اور تفسیر واحادیث کی کتابوں کی تعلیم میں مشغول ہوگئے۔ دس برس کی عمر میں تھے کہ از خود مطالعے سے کتابوں کو حل کرنے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ آپؒ نے 15 سال کی عمر میں اپنے دور کے تمام علوم وفنون پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ چناں چہ خود لکھتے ہیں:

''پندرہ سال کی عمر میں میں نے تمام علوم وفنون پڑھ لیے تھے، اور اسی سال قرآن حکیم میں کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعے کے ساتھ والدِ ماجد کے درسِ قرآن میں حاضری کی توفیق ملی۔ اس طرح کئی بار میں نے حضرت والد ماجد سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں ''فتح عظیم'' کا باعث ہوا۔''(3)

شادی

۱۱۲۸ھ/ 1716ء میں چودہ سال کی عمر میں آپؒ کی شادی ہوئی۔

باطنی تربیت

۱۱۲۹ھ/ 1717ء میں ظاہری تعلیم مکمل ہوئی اور اس کے بعد تربیتِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ خود لکھتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغالِ صوفیا، خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مصروف ہوگیا اور ان کی توجہ اور تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آدابِ طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کرلیا۔''(4)

والدِ گرامی کے جانشین

۱۲/صفر ۱۱۳۱ھ/ 4 جنوری 1719ء کو جب آپؒ کی عمر سولہ سال پانچ ماہ تھی، تو آپؒ کے والد گرامی (شاہ عبدالرحیم دہلویؒ) کا انتقال ہوا۔ آپؒ نے مرض الموت کے دوران شاہ صاحبؒ کو بیعت وارشاد کی اجازت دی اور یہ جملہ فرمایا: ''یَدُہٗ کَیَدِیْ'' (اس کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے) اور اپنا قائم مقام بنایا۔(5)

www.rahimia.org

مسندِ درس و تدریس

شاہ صاحبؒ اپنے والد گرامیؒ کے وصال کے بعد ''مدرسہ رحیمیہ'' دہلی میں ان کی مسندِ درس پر درس و تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ آپؒ مسلسل 12 سال کتب ِ تفسیر، حدیث اور دیگر علوم وفنون کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ اس دوران ہر علم میں خاص درک اور ملکہ حاصل کیا۔ اس دوران علمی صلاحیت و استعداد کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ آپؒ نے زندگی کے عملی پہلوؤں کے حوالے سے حکمتِ عملی اوراس کے بنیادی اُمور کا فہم بھی پیدا کیا، جو آپؒ کے والد گرامی کی عملیت پسند طبیعت کے سبب تھا۔ (6)

حج کے ارادے سے پہلا سفر

۱۱۳۵ھ/ 1723ء میں 20 سال کی عمر میں پہلی مرتبہ سفرِ حج کے ارادے سے دہلی سے روانہ ہوئے۔ متعلقین، علما اور طلبا کی ایک جماعت آپؒ کے ساتھ تھی۔ طویل سفر طے کر کے ساحل سمندر پر سورت کے قریب شہر ''کھنبایت'' میں چند روز قیام فرمایا۔ حجاز کے لیے حج کے جہازوں کی روانگی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے بہ القائے خداوندی سفرِ حج کا ارادہ ملتوی کر کے واپس دہلی تشریف لائے۔ اس سفر میں بہت کچھ تجربات، مشاہدات اور مکاشفات ظاہر ہوئے۔ اس دوران آپؒ مُفَهّمِيّت اور مُحَدّثِيّت سے مشرف ہوئے۔ اس مقام کے اَسرار وعلوم آپؒ نے اپنی تصنیف ''التّفهيماتِ الإلٰهيه'' میں بیان فرمائے ہیں۔ (7)

''المقدّمه فی قوانین التّرجمه'' کی تالیف

۱۱۴۰ھ/ 1728ء میں آپؒ نے قرآن حکیم کے ترجمے کا آغاز کیا اور مختلف تراجم کے اُسلوب کا جائزہ لے کر ترجمہ نگاری کے اصول وقوانین پر ایک جامع رسالہ ''المقدّمه فی قوانین التّرجمه'' تالیف فرمایا۔ اپنے طے کردہ ان اصولوں اور قوانین کی روشنی میں قرآن حکیم کا ترجمہ شروع کیا، جو ''زہراوین'' یعنی سورت البقرہ اور سورت آلِ عمران تک سفرِ حج سے پہلے مکمل ہوا۔

سفرِ حرمین شریفین

۸؍ ربیع الآخر ۱۱۴۳ھ/ 21؍ اکتوبر 1730ء کو دوسری مرتبہ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً کے مبارک سفر پر روانہ ہوئے۔ یہ سفر دہلی سے براستہ پانی پت، سرہند، لاہور، ملتان، سندھ میں ٹھٹھہ سے ہوتے ہوئے سورت کی بندرگاہ تک ہوا۔ پھر وہاں سے بحری جہاز پر سوار ہوئے۔ اس سفر میں لاہور، ملتان اور ٹھٹھہ کے علما اور طلبا نے آپؒ سے خوب استفادہ کیا۔ خاص طور پر مخدوم محمد معین ٹھٹھویؒ اور دیگر اہلِ سندھ نے آپؒ سے بیعت ہوکر شرفِ اجازت حاصل کی۔ (8)

حج بیت اللہ کی سعادت

۱۵؍ ذوقعدہ ۱۱۴۳ھ/ 22؍ مئی 1731ء کو مکہ معظّمہ میں پہنچے اور عمرۂ تمتع ادا کیا۔ پھر اسی سال ذی الحج میں حج کی سعادت حاصل کی اور بیت اللہ الحرام کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے۔ مکہ معظّمہ میں قیام کے دوران وہاں کے اکابر علما اور فضلا نے آپؒ سے خوب استفادہ کیا اور علمی تبادلۂ خیالات کیا۔ علمی اور فکری مسائل میں مشکل مقامات کو حل کرنے اور عقل وشعور اور فہم و تدبر کے اظہار کی وَجہ سے آپؒ مکہ معظّمہ میں ہر دل عزیز ہوگئے اور لوگ جوق در جوق استفادہ کے لیے آنے لگے۔ (9)

مدینہ منورہ حاضری

ماہِ ربیع الاول ۱۱۴۴ھ/ ستمبر 1731ء میں آپؒ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور روضۂ اقدس پر حاضری ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار عنایات وتوجہات سے مشرف ہوئے۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران وہاں کے علما نے آپؒ سے خوب استفادہ کیا۔ خاص طور پر شیخ عبد الکریم انصاریؒ (جو حضرت انس ابن مالکؓ کی اولاد میں سے تھے) اور مسجد نبویؐ کے اُستاد شیخ محمد طیبؒ جو مدینہ کے بڑے عالم اور فاضل اساتذہ میں سے تھے، نے آپؒ سے استفادہ کیا۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران خود شاہ صاحبؒ نے مدینہ کے سن رسیدہ بزرگ عالم دین اور محدث حضرت شیخ ابوطاہر کُردی مدنیؒ سے تلمذ

حاصل کیا اور ان سے بہت متأثر ہوئے۔ صحاح ستہ کی اجازت لی اور اپنی سندِ حدیث کو بلند کیا۔

دوبارہ مکہ معظّمہ آمد

۱۵/ شعبان ۱۱۴۴ھ/ 12/ فروری 1732ء کو مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ دوبارہ تشریف لائے اور ماہِ رمضان میں مسجد الحرام میں اعتکاف کیا اور فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے۔ اسی دوران کتاب "**فُیوض الحرمین**" تحریر فرمائی، جس میں آپؒ نے "**فَکُّ کُلِّ نِظَام**" (ہر بوسیدہ نظام کو توڑ دو) کے اصول پر انقلاب کا نظریہ دیا۔

مکہ معظّمہ کے قیام کے دوران ہی آپؒ کی والدۂ محترمہ سیّدہ فخر النساءؒ کا دہلی میں انتقال ہوگیا۔ اطلاع ملنے پر حرم شریف کے تمام علما اور معززین نے آپؒ سے تعزیت کی۔ اسی سال ذی الحج میں آپؒ نے دوسرا حج ادا کیا۔ (10)

حج سے واپس دہلی تشریف آوری

ربیع الآخر ۱۱۴۵ھ/ 1732ء میں حجاز سے روانہ ہوکر 23 روز میں سورت کی بندرگاہ پہنچے اور دکن کے راستہ سے گوالیار اور آگرہ ہوتے ہوئے ۱۴/ رجب ۱۱۴۵ھ بروز جمعۃ المبارک/ 2/ جنوری 1733ء کو شاہ جہان آباد (دہلی) واپس تشریف لائے۔ (11)

"حُجَّۃُ اللّٰہِ البالِغہ" کی تالیف

حرمین شریفین کے سفر سے واپس آنے کے بعد وہاں سے حاصل کردہ علوم و معارف اور فیوضات و برکات کی اساس پر آپؒ نے اپنے فکر و فلسفے کو مرتب کرنے کی طرف اپنی پوری توجہ فرمائی۔ چناں چہ تقریباً دو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد ۱۱۴۷ھ (1734ء) میں آپؒ نے اپنی شاہکار کتاب "**حُجَّۃُ اللّٰہِ البالِغہ**" تصنیف فرمائی۔ (12)

"حُجَّۃُ اللّٰہِ البالِغہ"؛ ولی اللّٰہی فکر و فلسفے کا خلاصہ

اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے اپنا فکر و فلسفہ جامع اور مکمل شکل میں مدوّن فرمایا

ہے۔ آپؒ نے قرآنی علوم کے عمیق مطالعے سے کائنات میں جاری ''کمالاتِ اربعہ'' یعنی ''ابداع''، ''خلق''، ''تدبیر'' اور ''تدلّی'' کا تعین کیا۔ یہ بیان کیا کہ کائنات' اللہ تعالیٰ کے ان کمالاتِ اربعہ کا ظہور ہے، اور یہ چاروں کمالات دین کی تفہیم کے اساسی اُمور ہیں۔ انھیں سمجھے اور مانے بغیر شریعت کے احکامات کے راز معلوم نہیں ہوسکتے۔

انسان کی حقیقت و ماہیت کی وضاحت کرتے ہوئے ''**تجلّیات**'' کے ذریعے سے اللہ سے تعلق پیدا کرنے کا نظام، ''**شعائر اربعہ**'' یعنی ''**القرآن**''، ''**الکعبہ**''، ''**النّبی**'' اور ''**الصّلوٰۃ**'' کی صورت میں بیان کیا۔ ان شعائر اللہ کے ذریعے سے انسانیت میں اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بنیادی اخلاق کا تعین، ''اخلاقِ اربعہ'' یعنی ''طہارت''، ''اخبات الی اللہ''، ''سماحت'' اور ''عدالت'' کی صورت میں کیا۔

پھر انسانی معاشروں میں ''عدالت'' کی اساس پر قائم ہونے والے ''ارتفاقاتِ اربعہ'' کے مراحل کی نشان دہی کی ہے۔ ''ارتفاقِ اوّل'' کے مرحلے میں عدل کے اصول پر ایک فرد کی ذات کو حاصل ہونے والی سہولیات کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسرے مرحلے میں خاندان اور عائلی سہولیات اور ترقیات کا ''ارتفاقِ دوم'' بیان فرمایا۔ تیسرے مرحلے میں ''ارتفاقِ سوم'' یعنی عدل کے اصول پر قومی سطح کے سیاسی، معاشی، عمرانی نظام اور سماجی معاملات کی اہمیت بیان کی ہے اور اسے بنیادی ارتفاق قرار دیا ہے۔ چوتھے مرحلے میں ''ارتفاقِ چہارم'' کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر ممالک اور اقوام کے درمیان عدل و انصاف پر مبنی تعلقات کے بنیادی اُمور کی نشان دہی کی ہے۔

اس طرح انسانیت کے اللہ تعالیٰ سے تعلق سے لے کر دوسرے تمام انسانوں کے ساتھ ذاتی، عائلی، قومی اور بین الاقوامی تعلقات کا ایک مربوط نظام اور اس کا بنیادی فکر و فلسفہ شاہ صاحبؒ نے متعین کیا اور نیکی اور بدی کے تصورات کی وضاحت کی ہے۔ تمام قرآنی احکامات کو انھیں 16 اُمور کے تناظر میں سمجھنے کا طریقہ بیان فرمایا۔ پھر احادیث نبوّیہ کے اَسرار بھی اسی تناظر میں بیان فرمائے ہیں۔

اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے نہ صرف اپنا فکر و فلسفہ بیان کیا ہے، بلکہ اس فکر و فلسفے کی اساس پر عملی طور پر اقدامات کرنے اور انقلاب کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہمیت بھی بیان کی ہے۔ ''ارتفاقات'' کی بحث کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

''یجب بذل الجُهد علیٰ أهل الآراء الکُلّیة فی إشاعة الحقّ و تمشیتهٖ، و إخمال الباطل، وصدِّهٖ. فرُبما لم یمکن ذٰلک إلاَّ بمخاصمات أو مقاتلات، فیعدُّ کلّ ذٰلک من أفضل أعمال البرّ.''[13]

(مفادِ عامہ کی سوچ رکھنے والوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ حق کے پھیلاؤ اور غلبے اور باطل کو مٹانے اور روکنے کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں۔ بسا اوقات یہ کام اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا، جب تک کہ فرسودہ نظام کو توڑنے کے لیے جہاد و قتال کا عمل نہ کیا جائے۔ ایسے زمانے میں یہ کام کرنا نیکیوں کے تمام اعمال سے افضل ہے۔)

''ھمعات'' کی تالیف

جمادیٰ الاخریٰ ۱۱۴۸ھ/ اکتوبر، نومبر 1735ء میں آپؒ نے اپنی کتاب ''**ھمعات**'' کی تالیف مکمل فرمائی۔[14] اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے طریقت کی تاریخ اور اس کا فلسفہ متعین کیا ہے۔ اسی دوران آپؒ نے اپنی دیگر تصانیف بھی تحریر فرمائیں۔ اندازہ ہے کہ آپؒ کی عربی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں اسی دور کی ہیں۔ حرمین شریفین سے واپسی پر آپؒ نے زیادہ تر تصنیف و تالیف کے کام سرانجام دیے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کا قصبہ پُھلت میں قیام

سال ۱۱۴۸ھ/ 1735ء شروع ہوا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے پیشین گوئی فرمائی کہ اہلِ دہلی پر مصائب و مشکلات پیدا ہونے والی ہیں۔ چناں چہ دَکنی فوج کا حملہ اور نادر شاہ کا قتلِ عام وغیرہ برپا ہوئے اور دہلی اور گرد و نواح کو لوٹ لیا گیا۔[15]

۲۴/شعبان ۱۱۵۰ھ/ 17/دسمبر 1737ء کو حضرت شاہ صاحبؒ قصبہ پُھلت تشریف لائے اور کچھ عرصہ یہاں قیام فرمایا۔ ساداتِ بارہہ سے مغلیہ فوج کی لڑائی کے زمانے میں آپؒ پُھلت میں ہی قیام پذیر رہے۔ (16)

"إزالة الخِفاء عن خِلافة الخُلَفاء" کی تالیف

اسی زمانے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی معرکہ آرا تالیف "إزالة الخِفاء عن خِلافة الخُلَفاء" تحریر فرمائی۔ اس میں آپؒ نے خلافت کی حقیقت و ماہیت، خلافت ِراشدہ یا خلافتِ نبوت اور خلافتِ عامہ کے مفاہیم کا فرق اور خلفائے راشدینؓ بالخصوص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کے علوم و افکار اور قائم کردہ نظام کی تفصیل بیان کی۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں دین اسلام کے بین الاقوامی نظام کے قیام کے لیے جن اساسی علوم کی بنیاد رکھی گئی تھی، انھیں واضح کیا۔ خاص طور پر علم شریعت کے حوالے سے رسالہ "فقہِ عمر فاروق"، علم طریقت کے حوالے سے رسالہ "تصوفِ عمر فاروق" اور علم سیاست اور اجتماعیت کے حوالے سے رسالہ "حکمت و سیاستِ عمر فاروق" پر تین بہترین رسائل لکھ کر دین کا جامع نظامِ فکر و عمل واضح کیا۔

"فتح الرّحمٰن بترجمة القُرآن" کی تکمیل

اوائل رمضان ۱۱۵۱ھ/ دسمبر 1738ء کو آپؒ نے اپنا تحریر کردہ ترجمہ قرآن حکیم "فتح الرّحمٰن بترجمة القُرآن" مکمل فرمایا۔ حرمین شریفین کے سفر سے قبل ہی آپؒ نے ترجمہ قرآن لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن حرمین شریفین کے سفر کی وَجہ سے یہ کام رُک گیا۔ حرمین سے واپس آنے کے بعد دیگر تصانیف میں مشغولیت کی وَجہ سے کئی سال تک ترجمہ قرآن کریم کی طرف توجہ نہ ہوسکی۔ بالآخر ۱۰/ذی الحج ۱۱۵۰ھ/ 31/مارچ 1738ء کو آپؒ نے اس کام کو دوبارہ شروع کیا۔ اوائل شعبان ۱۱۵۱ھ/ نومبر 1738ء میں اس کا مسودہ تیار ہوا۔ نظرِ ثانی کے بعد اوائل رمضان میں ترجمہ قرآن کریم مکمل ہوا۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۱۵۶ھ/ 1743ء میں آپؒ کے اولو العزم شاگرد مولانا خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہیؒ کی

محنت و ہمت سے اس ترجمے کے پڑھنے پڑھانے کا رواج عام ہوا۔[17]

''المسوّٰی من أحادیث المؤطّا'' اور ''المصفّٰی'' کی تالیف

علومِ قرآنیہ کے حقائق و معارف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ نے علوم الحدیث کی جامع تدوین کے لیے بھی کام کیا۔ فقہا، محدثین کے نقطہ نظر کے مطابق ''مؤطّا'' کی احادیث کا ایسا انتخاب کیا، جس میں مشہورِ عالم فقہی مکاتبِ فکر؛ حنفی، مالکی اور شافعی کی آرا کو سامنے رکھ کر دین اسلام کا مکمل نظامِ شریعت مرتب اور مدوّن کیا۔ اس کے لیے ''المسوّٰی من أحادیث المؤطّا'' تالیف فرمائی۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ ''المصفّٰی'' کے عنوان سے کیا۔ اس طرح فقہی اختلافات کو ختم کرنے کے لیے حدیث و فقہ پر ایک جامع اور مربوط کتاب منصۂ شہود پر آئی۔

رمضان میں اعتکاف اور حقائق و معارف کا بیان

شعبان، رمضان ۱۱۵۶ھ/ اکتوبر 1743ء میں حضرت شاہ صاحبؒ نے چالیس روز کا اعتکاف فرمایا اور ان دنوں میں بے شمار حقائق و معارف بیان فرمائے۔ اس کے بعد اپنی وفات تک ہر سال شعبان اور رمضان میں اپنے مخصوص احباب کے ہمراہ چالیس روز کا اعتکاف فرماتے رہے۔ جس میں خاص طور پر مولانا نور اللہ بڈھانویؒ، مولانا محمد عاشق پھلتیؒ اور دیگر اہم علما اور صاحبزادگان اہتمام کے ساتھ شرکت فرماتے تھے۔ ان ایام میں آپؒ پر خاص کیفیت طاری ہوتی اور آپؒ پر بے انتہا علوم و معارف، حقائق و مکاشفات، معارفِ خاصہ اور اسرارِ غامضہ ظاہر ہوتے تھے۔ آپؒ پورے انشراح اور بسط کے ساتھ مخصوص احباب کی مجلس میں انھیں بیان فرماتے تھے۔[18]

''سطعات'' کی تالیف

رمضان ۱۱۶۸ھ/ جون 1755ء میں اعتکاف کے دوران جن مضامین کا القا ہوا، اُن کی اساس پر آپؒ نے اپنی کتاب ''سطعات'' تحریر فرمائی۔[19] جس میں آپؒ نے کائنات کا ''طلسم الٰہی'' تجلیات و تدلیات کے تناظر میں بیان کیا ہے اور آیت اَللّٰهُ نُوْرُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (20) کی تشریح و تفسیر فرمائی ہے۔

دہلی سے ہجرت اور قصبہ بُڈھانہ میں قیام

۱۱۷۳ھ/1759ء کے فتنے کے زمانے میں آپؒ نے اہالیانِ قصبۂ بڈھانہ کی درخواست پر دہلی سے ہجرت کر کے قصبۂ بڈھانہ ضلع مظفرنگر میں قیام فرمایا۔ اس سال ماہِ رمضان المبارک کا اعتکاف بھی یہیں فرمایا۔ اس رمضان میں آپؒ پر بڑے ''واردات'' ہوئے، جس کی تفصیل ''القولُ الجلی فی مناقبِ الولی'' میں ہے۔ آپؒ ۸/ ذی الحج ۱۱۷۵ھ/ یکم/ جون 1762ء تک اپنی زندگی کے آخری دو سال بڈھانہ میں ہی تشریف فرما رہے۔ (21)

''لمحات'' کی تالیف

ماہِ رمضان ۱۱۷۴ھ/اپریل 1760ء میں آپؒ نے بڈھانہ میں ہی اعتکاف فرمایا اور اس دوران معارفِ اسرارِ شریعہ اور حقائقِ الٰہیہ کونیہ بیان فرمائے۔ اسی دوران آپؒ نے ان حقائق کو ''لائحات'' (لمحات) کے نام سے تحریر فرمایا، جس کی تفصیل ''القول الجلی فی مناقب الولی'' میں ہے۔ (22)

بُڈھانہ سے دہلی تشریف آوری

ماہِ شعبان رمضان ۱۱۷۵ھ/ فروری، مارچ 1762ء حسبِ معمول آپؒ نے قصبۂ بڈھانہ میں اعتکاف فرمایا۔ اسی دوران ۸/ رمضان/ 2/ اپریل 1762ء کو آپؒ کے بازو میں تکلیف شروع ہوئی۔ کافی علاج معالجہ ہوتا رہا، لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر ۸/ ذی الحج ۱۱۷۵ھ/ یکم/ جون 1762ء کو آپؒ بڈھانہ سے دہلی تشریف لائے۔ دہلی میں بھی مسلسل طبیعت خراب رہی۔ تمام اطبا حاضر رہے۔ ہر ایک نے اپنی تشخیص کے مطابق مختلف تدابیر کیں، لیکن کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ ان ایام میں رِقتِ قلبی بہت بڑھ گئی تھی۔ (23)

www.rahmia.org

وِصال مبارک

۳۰؍محرم الحرام ۱۱۷۶ھ/ 21؍اگست 1762ء بروز ہفتہ کو صبح کے وقت حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ آپؒ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ اُن کی آمد پر تخلیہ کرایا گیا۔ چند مخصوص احباب کے علاوہ سب کو کمرے سے باہر کر دیا گیا اور حلقۂ مراقبہ قائم ہوا۔ آدھ گھنٹہ مجلس قائم رہی۔ مجلسِ مراقبہ ختم ہوئی تو مرزا صاحبؒ نے اجازت چاہی۔ اُسی وقت آپؒ کا مزاج متغیر ہونا شروع ہوا اور آناً فاناً وصال کے آثار ظاہر ہوئے۔ اُسی روز ظہر کے وقت آپؒ کی روحِ پاک عالمِ قدس کی طرف پرواز کر گئی اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملی۔ (24)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جانشین جماعت

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی زندگی میں اپنی جانشین جماعت تیار کی۔ یوں اکسٹھ سال کے مختصر عرصے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی نے انسانی زندگیوں کو سنوارنے کا ڈھنگ، جینے کی اُمنگ، قلب کی پختگی، عقل کا شعور اور روح کی بالیدگی میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ آپؒ کے جانشین حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ہوئے۔

☆

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

شخصیت کا خاکہ

درمیانہ قد، گول چہرہ، متوازن نقش و نگار، ذہانت کی آئینہ دار موٹی موٹی چمک دار آنکھیں، گورا رنگ، سفید داڑھی چہرے کے رنگ کے عین مطابق، ننگا سر بالوں سے بے نیاز، سفید کھدر کا لمبا کرتہ، سفید کھدر کی شلوار زیبِ تن، جاذبِ قلب و نظر شخصیت کے مالک اور بڑے متحرک، اسلوبِ کلام پر اعتماد اور شانِ جلالی ہر لفظ میں نمایاں۔

www.rahimia.org

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

شخصیت و کردار

وِلادت

مولانا عبیداللہ سندھیؒ ۱۲/محرم الحرام ۱۲۸۹ھ/ 10 مارچ 1872ء بروز جمعۃ المبارک طلوعِ فجر سے پہلے، پنجاب کے مردم خیز ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''چیانوالی'' میں ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ذہانت وفطانت کے آثار ظاہر تھے۔ آپؒ کے والد آپؒ کی پیدائش سے چار ماہ پہلے فوت ہو چکے تھے۔ آپؒ کی پیدائش کے دو سال بعد دادا کا بھی انتقال ہوگیا۔ ان کی والدہ انھیں لے کر اپنے والدین کے گھر شہر ''جام پور'' ضلع ڈیرہ غازی خان (پنجاب) چلی گئیں۔

ابتدائی تعلیم

۱۲۹۵ھ/ 1878ء میں چھ سال کی عمر میں ''جام پور'' کے اُردو مڈل سکول میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپؒ نے اپنے تعلیمی دور میں ریاضی، الجبرا، اُقلیدس اور تاریخ ہند سے متعلق علوم وفنون بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ تاریخ و فلسفہ اور ریاضی آپؒ کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ اسی دوران آپؒ کو کتابوں کے مطالعے کی عادت ہوگئی۔ جو کتاب بھی دستیاب ہوتی، اُسے پڑھ ڈالتے تھے۔

''تُحفۃُ الھِند'' سے اسلام کی حقانیت کا ادارک

۱۳۰۱ھ/ 1884ء میں کتاب ''تُحفۃُ الھِند'' آپؒ کے ہاتھ لگی، جو ایک ہندو برہمن

www.rahimia.org

سے مسلمان ہونے والے عالم مولانا مولوی عبید اللہ مالیر کوٹلوی المعروف ''مولوی پنڈت'' کی لکھی ہوئی تھی۔ اس میں ہندوؤں کے عقائد کی کمزوری دلائل سے واضح کی گئی تھی۔ حضرت سندھیؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے اس کتاب کا مطالعہ بڑی پابندی سے کیا۔ یہاں تک کہ میں اسے اچھی طرح سمجھ گیا، بلکہ اسے حفظ کرلیا۔ اس کتاب کی بدولت اللہ تعالیٰ نے مجھے عقائدِ اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔''(25)

''تقویۃُ الإیمان'' سے ایمان کی مضبوطی

اس کے بعد تین سال تک خفیہ طور پر نماز روزہ اور شریعت کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی دوران حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب ''تقویۃُ الإیمان'' پڑھی۔ اس سے اسلام کے عقائد مزید پختہ ہوگئے۔ اسی دوران رمضان ۱۳۰۴ھ/ 1887ء کے کچھ روزے بھی رکھے، لیکن گھر والوں کی سختی کی وجہ سے اس رمضان کے باقی روزے ترک کرنا پڑے۔

اظہارِ اسلام اور ''عبید اللہ'' نام

۲۴/ ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ/ 15 اگست 1887ء کو، جب کہ آپؒ مڈل کلاس کی تیسری جماعت میں پڑھتے تھے، اظہارِ اسلام کے لیے اپنے وطن سے نکلے اور ''کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ'' جا پہنچے۔

۹/ ذی الحج ۱۳۰۴ھ/ 29 اگست 1887ء کو سنتِ تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد آپؒ کے رشتہ دار آپؒ کا تعاقب کرنے لگے، تو سندھ میں جا کر اسلام کا اعلان کیا۔ کتاب ''تُحفةُ الهِند'' کے مصنف (مولانا عبید اللہ) کے نام پر آپؒ نے اپنا نام ''عبید اللہ'' پہلے ہی رکھ لیا تھا۔ اسی دوران عربی صرف و نحو کی کتابیں ایک طالب علم سے پڑھنا شروع کردیں۔

راشدیہ قادریہ طریقے میں بیعت

صفر ۱۳۰۵ھ/ 1888ء میں سید العارفین شیخ المشائخ حضرت حافظ محمد صدیقؒ آف بھرچونڈی شریف (سندھ) کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انھوں نے کلمہ طیبہ کی تلقین کی۔ وہ مشہور سلسلۂ طریقت ''راشدیہ قادریہ'' کے امام تھے۔ انھوں نے حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی صحبت و رفاقت میں کچھ عرصہ گزارا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے بالاکوٹ کی طرف جاتے ہوئے ''پیر جو گوٹھ'' سندھ میں اُن کے پیر حضرت پیر صبغت اللہ شاہ راشدیؒ (اوّل) کے پاس قیام فرما ہوئے تھے۔

ذکر اَذکار کی مجالس میں شرکت

مولانا سندھیؒ نے سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق صاحبؒ کے پاس تقریباً دو ماہ قیام کیا، اور اُن کی مجالس اور حلقۂ ذکر میں بڑی پابندی سے شریک رہے۔ اور حضرتؒ کی توجہ بھی آپؒ کی طرف انتہا درجہ رہی۔ اس دوران اُن کی صحبت میں رہ کر آپؒ کی توجہ اور محبت سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ انھوں نے حضرت سندھیؒ کو اپنا بیٹا بنا کر توجۂ باطنی ڈالی۔ اس اجتماعِ صالح کی برکت سے مولانا سندھیؒ کے قلب میں معاشرتِ اسلامیہ راسخ ہوگئی۔ انھوں نے آپؒ کے لیے یہ دعا بھی کی کہ: ''خدا کرے عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالہ پڑ جائے۔'' یہ اسی دعا کا اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی خدمت میں دیوبند پہنچا دیا۔

درسِ نظامی کی تعلیم کا آغاز

ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ/ 1887ء میں سیّد العارفین کے خلیفہ اوّل حضرت مولانا ابوالسراج غلام محمد دین پوریؒ کے پاس دین پور نزد خان پور (پنجاب) تشریف لے آئے۔ چھ ماہ تک یہاں قیام کیا اور ''ھِدایۃُ النّحو'' تک کی عربی صرف و نحو کی کتابیں یہیں مولانا عبدالقادر سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے ان کی والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آ گئیں اور آپؒ کو جام پور واپس لے جانے کے لیے بڑا زور لگایا، مگر مولانا سندھیؒ ثابت قدم رہے اور والدہ کے

ساتھ نہیں گئے۔

شوال ۱۳۰۵ھ/ جون 1888ء دین پور سے ''کوٹلہ رحم شاہ'' ضلع مظفر گڑھ چلے آئے، اور مولانا خدا بخش صاحب سے نحو کی مشہور کتاب ''کافیہ'' پڑھی۔

دارالعلوم دیو بند میں درسِ نظامی کی تکمیل

صفر ۱۳۰۶ھ/ اکتوبر 1888ء میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوئے اور پانچ چھ مہینے تک ''قُطبی'' تک منطق اور فلسفے کے رسائل، متفرق اساتذہ سے پڑھتے رہے۔ ایک فاضل استاذ سے عربی کتابوں کے مطالعے کا صحیح طریقہ سیکھ لیا اور ذاتی محنت سے علوم میں ترقی کا راستہ کھلتا چلا گیا۔ اس سال کے باقی کچھ مہینے ''رام پور'' میں مولانا احمد حسن کان پوریؒ (شاگرد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کے مدرسے میں رہ کر منطق اور فلسفے کی اعلیٰ کتابیں مکمل کیں۔

صفر ۱۳۰۷ھ/ اکتوبر 1889ء میں دوبارہ دیو بند تشریف لائے اور ابتدائی دو تین ماہ مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیو بند سے اصولِ فقہ اور علمِ کلام کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور فقہ اور اصولِ فقہ کی کتابیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے پڑھیں۔ شعبان ۱۳۰۷ھ/ اپریل 1890ء میں سالانہ امتحان میں شریک ہوئے اور اپنی کلاس میں اوّل آئے۔ سالانہ امتحان میں مولانا سید احمد دہلویؒ مدرس اوّل دارالعلوم دیو بند نے حضرت سندھیؒ کے جوابات کی بڑی تعریف کی اور یہ فرمایا:

''اگر اس کو کتابیں ملیں تو یہ شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔''

مبشراتِ مبارکہ

اسی دوران حضرت سندھیؒ نے بہت اچھے خواب دیکھے۔ چناں چہ آپؒ نے خواب میں امامِ اعظم امام ابو حنیفہؒ کی زیارت کی اور پھر کچھ عرصے بعد خواب میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

تصنیف و تالیف کا آغاز

رمضان ۱۳۰۷ھ/ اپریل 1890ء میں ''اصولِ فقہ'' پر آپؒ نے ایک رسالہ لکھا، اس کا نام ''مَراصِدُ الوُصولِ إلیٰ مَقاصِدِ الاُصول'' رکھا۔ اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے سامنے یہ رسالہ پیش کیا تو آپؒ نے اسے بڑا پسند فرمایا۔ اس رسالے میں ''متشابهات'' کے بارے میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ ''راسخين في العلم'' (علم میں رسوخ رکھنے والے حضرات) اپنے وہبی علم کے ذریعے ان کی تأویل اور تفہیم جانتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت

شوال ۱۳۰۷ھ/ مئی 1890ء میں دارالعلوم دیوبند میں کتاب ''تفسير بيضاوی'' پڑھی اور ۱۳۰۸ھ/ 1890ء میں دورۂ حدیث کی تمام کتابوں میں شریک ہوئے۔ ''جامع ترمذی'' حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے پڑھی۔ اسی دوران حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تمام کتابیں از خود مطالعہ کیں اور حضرت شیخ الہندؒ سے انھیں خوب اچھی طرح سمجھا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں

۱۳۰۸ھ/ 1890ء میں ہی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ''گنگوہ'' جاکر ''سُنن ابو داؤد'' پڑھی۔ مولانا سندھیؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے حضرت شیخ الاسلام (گنگوہیؒ) سے ''سنن ابو داؤد'' کا ایک بڑا حصہ انتہائی فقہی تحقیق کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح تحقیقی نقطۂ نگاہ سے ان سے پڑھنے سے مجھے بڑا نفع ہوا۔ میں نے آپؒ سے بہت زیادہ نفع اٹھایا اور یہ انھی کی صحبت کا میرے دل پر اثر ہے کہ اِس نے مجھے ہر طرح کے مشکل حالات میں اپنے نظریات تبدیل کرنے سے روکے رکھا۔ یہ انھی کی صحبت کا اثر ہے کہ ولی اللّٰہی طریقہ روشن ہو کر میرے سامنے آگیا۔ اس طرح میں نے فقہ کے اہم مقامات، سلوک و طریقت کے بنیادی قاعدے، عربی زبان اور کتاب و

سنت کی اصولی اور معقولی مباحث کو صحیح طور پر سمجھ لیا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے کہ آپؒ بلاشبہ مذہبِ امام ابوحنیفہؒ کے مجتہد اور ماہر امام تھے۔ بلاشبہ ہمارے شیخ (گنگوہیؒ) اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ کے طریقے پر استقامت کا پہاڑ تھے۔ آپؒ ولی اللّٰہی تھے اور صدرالحمید حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔''(26)

دہلی میں علاج اور سندھ واپسی

ربیع الثانی ۱۳۰۸ھ/ نومبر 1890ء میں بیمار ہوگئے اور علاج کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی سفارش سے حکیم محمود خان سے علاج کروایا، جس سے بہت افاقہ ہوا۔ اسی دوران حکیم صاحب کے کتب خانے میں موجود بہت سی کتابیں مطالعہ کیں۔ صحت مند ہونے کے بعد حضرت شیخ الہند کی اجازت سے دہلی سے سیدھا سندھ تشریف لے آئے۔ رجب ۱۳۰۸ھ/ فروری 1891ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے درس و تدریس کا اجازت نامہ تحریر فرما کر روانہ کر دیا۔

شیخِ طریقت کا انتقال اور تدریس کا آغاز

۲۰/ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ/ فروری 1891ء کو دہلی سے سیدھا سندھ میں ''بھرچونڈی شریف'' پہنچے۔ آپؒ کے پیر و مرشد حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیقؒ آپ کے آنے سے 10 دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رمضان ۱۳۰۸ھ/ اپریل 1891ء تک آپؒ نے بھرچونڈی شریف میں قیام کیا اور اس دوران مولوی کمال الدین نے آپؒ سے ''سُنن ابوداؤد'' پڑھی۔

اِمروٹ شریف میں شادی اور تعلیم و تدریس

شوال ۱۳۰۸ھ/ مئی 1891ء سے سید العارفین حافظ محمد صدیقؒ کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود امروٹیؒ کے پاس ''اِمروٹ''، ضلع سکھر (سندھ) تشریف لے گئے۔ انھوں نے آپؒ کی شادی کرائی۔ ۱۳۱۵ھ/ 1897ء تک سات سال امروٹ شریف میں

کتبِ حدیث، تفسیر اور اس کے تمام متعلقات کی درس و تدریس اور مطالعۂ کتب میں مصروف رہے۔ اور اس دوران سندھ سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم کی بہت بڑی جماعت نے آپؒ سے تعلیم حاصل کی۔

ان سات سالوں میں مولانا سندھیؒ نے تفسیر قرآن کے حوالے سے امام ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں ''فتح الرّحمٰن بترجمة القُرآن''، ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' بڑی توجہ سے پڑھائیں۔ آیاتِ قرآنیہ کا ربط اور پھر سورتوں کے ابواب اور فصول مقرر کرنے کا کام کیا۔ علم حدیث اور فقہ کی تفہیم کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں ''حجّة اللّٰه البالغه''، ''المسوّٰی فی احادیث المؤطّا''، علم تاریخ و سیاست کی تفہیم کے لیے ''إزالةُ الخِفاء عن خِلافة الخُلَفاء'' پڑھائیں۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں کے منتخب مقالات بڑی پابندی سے طلبا کو پڑھائے۔ اس طرح آپؒ کو ان سات سالوں میں ولی اللّٰہی طریقے پر تعلیم و تدریس میں بڑا ملکہ پیدا ہوگیا۔[27]

اس دور کی تصنیفات و تالیفات

اِمروٹ میں اپنے قیام کے دوران آپؒ نے درجِ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں:

(۱) **تعلیق علٰی معانی الآثار للإمام الطحاوی**

(علم حدیث پر امام طحاویؒ کی کتاب ''معانی الآثار'' پر تعلیق و حواشی)

(۲) **تعلیق علٰی فتح القدیر لمحقق ابن الهمّام**

(علم فقہ پر محقق ابن ہمامؒ کی کتاب ''فتح القدیر'' پر تعلیق و حواشی)

(۳) **فتح السّلام فی شرح بلوغ المرام**

(''فتح السلام'' کے نام سے ''بلوغ المرام'' کی شرح)

(۴) **شرح سفر السعادة للفیروز آبادی**

(علامہ فیروز آبادیؒ کی کتاب ''سفر السعادة'' کی شرح)

(۵) تخریج مافی الباب للامام الترمذی (علم حدیث کی مشہور کتاب "جامع ترمذی" میں "ما فی الباب" کے عنوان سے بیان کردہ تمام احادیث کی تخریج)

(۶) تخریج احادیث غنیة الطالبین للشیخ عبد القادر جیلانی (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب "غنیة الطالبین" میں بیان کردہ احادیث کی تخریج)

(۷) ازالة الشبه عن فرضیة الجمعة (یہ رسالہ جمعہ کی فرضیت کے سلسلے میں چند شبہات کے ازالے کے لیے لکھا۔ یہ ایک مستقل تصنیف ہے۔)

(۸) تهذیب رفع الیدین للإمام البخاری
(امام بخاریؒ کے رسالے "رفع الیدین" کی تہذیب و ترتیبِ جدید)

(۹) تنسیق احادیث بدء الوحی من الجامع الصحیح (امام بخاریؒ کی کتاب "الجامع الصحیح" کے "باب بدء الوحی" کی احادیث میں ربط و تعلق پر ایک رسالہ)

(۱۰) حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ نے سندھی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا۔ اس میں آپؒ نے معاون کے طور پر کام کیا۔

"مطبع محمودیه" کا قیام

اِمروٹ شریف میں قیام کے دوران نشر و اشاعت کا ایک ادارہ "مطبع محمودیه" قائم کیا۔ اپنے اس مطبع سے سندھی زبان میں ایک ماہنامہ "هدایت الإخوان" کے نام سے شروع کیا۔ اسی مطبع کی جانب سے امام طحاویؒ کی کتاب "العقیدة للإمام الطحاوی" شائع کی۔

حضرت دین پوریؒ اور حضرت اِمروٹیؒ سے اجازت و خلافت

امروٹ شریف میں اس قیام کے دوران طریقۂ راشدیہ مجددیہ میں آپؒ نے سلوک و

احسان کی منازل بھی طے کیں۔ اس کی تکمیل پر حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ اور حضرت مولانا ابوالسراج غلام محمد دین پوریؒ نے آپؒ کو اجازت و خلافت عنایت فرمائی اور متعلقین کو طریقت کی تلقین کا حکم فرمایا۔ اسی طرح بعد میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے سلسلۂ چشتیہ، بلکہ تمام سلاسل کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ''دارالرشاد'' کا قیام

رمضان ۱۳۱۵ھ/ نومبر 1897ء کو آپؒ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی صحبت اُٹھائی اور حضرت کی خدمت میں اپنی تصانیف پیش کیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے انھیں بہت پسند فرمایا۔ اسی موقع پر حضرت شیخ الہندؒ نے سیاسی کام کرنے کا حکم دیا اور اُس کے لیے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر سندھ میں ایک مدرسہ ''دارالرشاد'' قائم کرنے کا حکم فرمایا۔

شوال ۱۳۱۹ھ/ 1901ء کو آپؒ نے حیدر آباد سندھ کے قریب ''گوٹھ پیر جھنڈا'' میں ایک دینی مرکز ''دار الرشاد'' کے نام سے قائم کیا۔ اس مرکز میں بیٹھ کر آپؒ نے سات سال تک علمی اور سیاسی کام سرانجام دیے اور انقلابی نظریے پر علما تیار کیے۔ اس دینی مرکز میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا شیخ حسین بن محسن انصاری یمانیؒ بھی تشریف لائے۔ تعلیم و تربیت کے حوالے سے پورے نظامِ تعلیم کا جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ دارالرشاد میں قیام کے دوران آپؒ نے خواب میں امام مالکؒ کی زیارت کی نیز خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

دارالعلوم دیوبند میں آمد اور ''جمعیت الانصار'' کا قیام

رمضان ۱۳۲۷ھ/ 1909ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے آپؒ سندھ سے مستقل طور پر دیوبند تشریف لے آئے۔ ۲۷/ رمضان ۱۳۲۷ھ/ 12/ اکتوبر 1909ء کو آپؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی زیر سرپرستی ''جمعية الأنصار'' قائم کی۔ آپؒ اس کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ اس کے تحت آپؒ نے دارالعلوم دیوبند کے گزشتہ چالیس سال کے فاضلین کی

تعلیم و تربیت کا نظام قائم کیا۔ نیز عوام میں تحریکِ حریت پیدا کرنے کے لیے اجلاس ہائے عام اور اجتماعات منعقد کیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم کے مطابق چار سال تک اس میں آپؒ نے بڑی محنت اور جدوجہد سے کام کیا۔

دیوبند سے دہلی اور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا قیام

1912ء میں جب حکومت برطانیہ نے اپنا دار الحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کرلیا اور دہلی ہندوستان کی سیاسیات کا نیا مرکز بن گیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی بھیج دیا۔ [28] چناں چہ ۱۳۳۱ھ/ 1913ء کو آپؒ نے مسجد فتح پوری چاندنی چوک دہلی میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کی سرپرستی حضرت شیخ الہندؒ، حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک نے کی۔ اس ادارے میں حضرت سندھیؒ نے قرآن حکیم کی تفسیر ''الفوز الکبیر'' کے اصولوں کی روشنی میں فن اعتبار کے تناظر میں پڑھانا شروع کی۔ اور ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' کا درس سیاسیاتِ حاضرہ کو سامنے رکھ کر دینا شروع کیا۔ دہلی کے اس قیام میں حضرت شیخ الہندؒ نے آپؒ کا تعارف ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ سے کرایا۔

دہلی سے کابل اور ''جنود اللہ الربانیہ'' کا قیام

جمادیٰ الثانیہ ۱۳۳۳ھ/ 1915ء میں آپؒ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل افغانستان جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اور انگریز جاسوسوں سے بچنے کے لیے چار مہینے تک سندھ میں سفر کی خفیہ تیاری کرتے رہے۔ ۳/ شوال ۱۳۳۳ھ/ 15 اگست 1915ء کو سندھ سے قندھار کے لیے روانہ ہوئے۔ کوئٹہ بلوچستان ہوتے ہوئے ذی الحج ۱۳۳۳ھ/ اکتوبر 1915ء کے پہلے عشرے میں کابل پہنچے۔ آپؒ سات سال تک کابل میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران آپؒ نے ''جنود اللّٰہ الربانیہ'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ یہ جماعت ہندوستان اور افغانستان کی آزادی کے لیے جدوجہد اور کوشش کرتی رہی۔ نیز اس جماعت نے جنگِ عظیم اول کے اختتام کے بعد افغانستان کی حکومت کے اہلکاروں کی

تربیت کے لیے بھی کام کیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ جمہوری اصولوں پر خلافتِ اسلامیہ چلانے کی اہلیت اُن میں پیدا کی جائے۔ تمام مسلمان جماعتوں کو اقتصادیات، سیاسیات اور علوم و افکار کی تعلیم و تربیت دینا بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔

کابل میں عبوری حکومتِ ہند کا قیام

۱۳۳۴ھ/ 1916ء میں آپؒ نے ہندوستان کے لیے کابل میں ''عبوری حکومت ہند'' قائم کی۔ آپؒ اس حکومت کے وزیر خارجہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1922ء میں آپؒ نے ''کانگریس کمیٹی کابل'' بنائی اور اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کا الحاق نیشنل کانگریس آف انڈیا نے اپنے اجلاس منعقدہ ''گیا'' میں منظور کیا۔

کابل سے روس

۱۳۴۰ھ/ 1922ء میں کابل سے خفیہ طور پر ترکی جانے کے لیے براستہ روس روانہ ہوئے۔ اس دوران ماسکو میں سات ماہ قیام فرمایا۔ چوں کہ نیشنل کانگریس آف انڈیا سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا، اس لیے سوویت روس نے اپنا مہمان بنایا اور روسی انقلاب کے مطالعے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں:

> ''میرے اس مطالعے کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی دینی تحریک کو، جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کی ایک شاخ ہے، اُس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کے لیے تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔'' (29)

ترکی میں قیام اور ''آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ'' کی تیاری

۱۳۴۱ھ/ 1923ء میں آپؒ انقرہ، ترکی پہنچے۔ یہاں چار ماہ قیام فرمایا۔ ترکی میں قیام کے دوران عصمت پاشا، رؤف بِک وغیرہ انقلابی رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نیز مصر کے مشائخ میں سے شیخ عبد العزیز جاویشؒ سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ اس کے بعد ترکی کے دار الحکومت استنبول تشریف لے گئے اور تین سال وہاں قیام فرمایا۔ اس دوران یورپ کی تاریخ کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ فرمایا۔ خاص طور پر خلافتِ عثمانیہ، اس کے ادارے، قومی

جمہوری تحریکات، برطانوی ترقیات اور فرانسیسی انقلاب کا مطالعہ کیا۔

15/ ستمبر 1924ء کو آپؒ نے استنبول سے ہی ہندوستان کے مستقبل کے سیاسی اور معاشی اُمور حل کرنے کے لیے ''آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ'' کے عنوان سے ایک سیاسی منشور جاری فرمایا۔ جس میں عوامی جمہوری نقطہ نظر سے ہندوستان میں غیر سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت وحکومت قائم کرنے کے خدوخال کی نشان دہی کی۔

ترکی سے مکہ مکرمہ کا سفر

۱۳۴۴ھ/ جون 1926ء میں مکہ مکرمہ میں موسم حج کے موقع پر ''المؤتمر الاسلامی'' کا اجلاس منعقد کیا جا رہا تھا۔ آپؒ ترکی میں تین سال قیام کے بعد مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والے اس عالمی اجتماع میں شرکت کے لیے آنا چاہتے تھے۔ چوں کہ براہِ راست آنے میں خطرات تھے، اس لیے آپؒ استنبول سے اٹلی اور پھر سوئٹزرلینڈ تشریف لے گئے۔ یہاں پر کچھ عرصہ قیام کر کے جدید اٹلی اور یورپ کی سیاسیات کا مطالعہ کیا۔ پھر افریقا کے ساحل پر اٹلی کے نوآبادیاتی شہر ''مصوّع'' آئے۔

مکہ مکرمہ آمد اور حرم میں درس و تدریس

صفر ۱۳۴۵ھ/ اگست 1926ء میں ''مصوّع'' سے روانہ ہو کر مکۃ المکرّمہ تشریف لائے۔ مکۃ المکرّمہ میں قیام کے دوران آپؒ نے مسجد حرام میں درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ حرمِ مکی کے علما نے آپؒ سے درجِ ذیل کتابیں پڑھیں:

(۱) ''مؤطّا إمام مالک''

(۲) ''مؤطّا إمام محمّد''

(۳) ''الرّسالة للإمام الشّافعی''

(۴) ''مسوّیٰ من أحادیث المؤطّا''

(۵) ''الفوز الکبیر للإمام شاہ ولی اللّٰہ دھلویؒ''

(۶) ''اصول الفقه للإمام محمّد إسماعیل شهیدؒ''

(۷)　**"شرح النُّخبة لابن حجر"**

(۸)　**"مقدمه صحيح مسلم"**

(۹)　**"كتاب العلل"**

(۱۰)　**"جامع ترمذی"**

اسی طرح امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں: **"فتح الرّحمٰن"**، **"فیوض الحرمین"**، **"إزالة الخفاء"** اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتابیں: **"صراطِ مستقیم"**، **"منصبِ امامت"**، **"عبقات"**، **"تقوية الإيمان"** اور حضرت نانوتویؒ کی کتابیں بھی علما اور طلبا کو آپؒ نے پڑھائیں۔ آپؒ خود لکھتے ہیں:

"میں تقریباً تیرہ چودہ سال سے **"قرآن عظیم"** اور **"حجة اللّٰه البالغه"** کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کرتا رہا، تفسیر قرآن میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے، حرم کے قیام کے زمانے میں مَیں نے انھیں امام ولی اللہ دہلویؒ کے اصول پر بالاطمینان حل کرلیا۔......

مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس (موجودہ) زمانے میں قابل عمل تعلیم کا ایک اعلیٰ نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تأ ثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔ میں نے امام ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً **"بدورِ بازغه"**، **"خیر کثیر"**، **"تفهیماتِ الٰهیه"**، **"سطعات"**، **"لمحات"**، **"الطاف القدس"** وغیرہ۔ ان کتابوں کے لیے بہ طورِ مفتاح (کنجی) میں نے مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ کی **"تکمیل الأذهان"** اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی **"عبقات"** اور مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) کی **"قاسم العلوم"** (مکتوبات)، **"تقریر دلپذیر"** اور **"آبِ حیات"** سے استفادہ کیا۔ مجھے ان کتابوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا اور ساتھ ہی قرآن عظیم کی درس و تدریس کا کام بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات

بہت وسیع ہو گئے۔ لِلّٰہِ الحَمد (اللہ ہی کے لیے حمد و ثنا ہے)۔‘‘ (30)

’’التّمهيد لتعريف ائمّة التّجديد‘‘ کی تصنیف

حرم شریف میں قیام کے دوران مکہ مکرمہ میں آپؒ نے ولی اللّٰہی سلسلے کے علما کے تجدیدی کام، ان کے تاریخی تسلسل اور سلسلہ ہائے اسناد کے تعارف کے لیے عربی زبان میں ایک بڑی اہم کتاب لکھی۔ اس کتاب کا نام ’’التّمهيد لتعريف ائمّة التّجديد‘‘ ہے۔ بڑے سائز کے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب چار پُر مغز مقالوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی تصنیف و تالیف کا کام آپ نے ۸/ رجب ۱۳۴۹ھ/ 29 نومبر 1930ء کو مکمل کیا۔

’’الهام الرّحمٰن فی تفسير القرآن‘‘ کا املا

حرم شریف میں قیام کے دوران آپؒ نے روس کے مشہور عالم دین علامہ موسیٰ جار اللہؒ کو قرآن حکیم کی مکمل تفسیر پڑھائی۔ انھوں نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ قلم بند کیا۔ ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ/ 26 جولائی 1937ء بروز پیر سے شروع کر کے ۱۳/ ذی قعد ۱۳۵۶ھ/ 13 جنوری 1938ء تک روزانہ صبح طلوعِ آفتاب سے لے کر ظہر یا عصر تک آپؒ نے یہ تفسیر لکھوائی۔ اس طرح تقریباً چھ ماہ میں مکمل تفسیر قرآن کا املا پورا ہوا۔ یہ تفسیر ابھی تک قلمی مخطوطے کی شکل میں تین جلدوں میں محفوظ ہے۔ اس کی ابتدائی چند سورتیں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ نے ’’الهام الرّحمٰن فی تفسير القرآن‘‘ کے نام سے شائع کی ہیں۔ علامہ موسیٰ جار اللہؒ نے حضرت سندھیؒ سے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اکثر کتابیں بھی اس دوران پڑھیں۔

واپس ہندوستان آمد

1936ء میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں خاص طور پر انڈین نیشنل کانگریس، جمعیت علمائے ہند اور ہندوستان کی سربرآوُردہ شخصیات، مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا غلام رسول مہرؒ وغیرہ نے حضرت سندھیؒ کی ہندوستان واپسی کے

لیے کوششیں شروع کیں۔ انھی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہوا کہ مولانا سندھیؒ کو یکم نومبر 1938ء کو ہندوستان واپسی کی اجازت کی اطلاع ملی۔ یکم جنوری 1939ء کو ہندوستان آمد کے لیے آپؒ کو پاسپورٹ دیا گیا۔ حج کا موسم قریب آ گیا تھا، اس لیے حج ادا کر کے آپؒ ہندوستان واپس تشریف لائے۔

اہم ''خطبات و مقالات'' کی تصنیف و تالیف

۱۴ر محرم ۱۳۵۸ھ/ 7 مارچ 1939ء کو آپؒ کراچی کی بندرگاہ پر اُترے۔ حکومتِ سندھ کے وزیر اعظم اللہ بخش سومرو نے عمائدین شہر اور اپنے وزرا کے ساتھ آپؒ کا شان دار استقبال کیا۔ ہندوستان میں کراچی ساحل پر اُترتے ہی آپؒ نے دین کی اساس پر انقلابی فکر و عمل کی اہمیت کے حوالے سے ایک معرکہ آرا خطاب ارشاد فرمایا، جو آپؒ کے خطبات و مقالات کے مجموعے میں طبع شدہ ہے۔

۱۶ر ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ/ 3 جون 1939ء کو اپنی واپسی کے بعد ''جمعیت علمائے صوبہ بنگال'' کے اجتماع منعقدہ کلکتہ میں آپؒ کو صدرِ اجلاس منتخب کیا گیا۔ اس اجلاس میں آپؒ نے ہندوستان آمد کے بعد اپنا پہلا خطبۂ صدارت پڑھا۔ آپؒ کی واپسی کے بعد پورے ملک میں آپؒ کا زبردست استقبال ہوا۔ جمعیت علمائے ہند، مجلس احرارِ اسلام وغیرہ اور تمام سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں نے آپؒ کے اعزاز میں تہنیتی اجتماعات منعقد کیے، جن میں آپؒ کی خدمات کو شان دار خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

25ر اکتوبر 1941ء کو آپؒ نے ایک اہم مقالہ ''شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیاسی تحریک'' کے عنوان سے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا۔ آپؒ نے اِسے اپنے عزیز ترین شاگرد اور اَورنٹیل کالج لاہور کے پروفیسر مولانا نورالحق علوی کو پڑھایا اور اس کے مشکل مقامات سمجھائے۔ اس کے نتیجے میں مولانا نورالحق علویؒ نے اس مقالے پر حواشی لکھے۔ یہ مقالہ 11ر نومبر 1941ء کو سندھ ساگر اکیڈمی لاہور سے طبع ہوا۔ پھر پروفیسر محمد سرور مرحوم نے کالج کے نوجوانوں کے لیے مولانا علویؒ کے عربی اور فارسی میں لکھے ہوئے حواشی کا اُردو

www.rahimia.org

ترجمہ کیا اور اصل مقالے کے ساتھ ملا کر ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' کے عنوان سے دوسری مرتبہ جنوری 1944ء میں لاہور سے شائع کیا۔

ذوقعدہ ۱۳۵۹ھ/ دسمبر 1940ء میں ماہنامہ ''الفرقان'' کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے مولانا سندھیؒ نے ''امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ تحریر اور املا کروایا۔ اس مقالے کو بھی مولانا نور الحق علوی، پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور نے قلم بند کیا اور اس کے حواشی و حوالہ جات عربی اور فارسی کی کتب سے لکھے۔ پروفیسر محمد سرور مرحوم نے ''الفرقان'' میں طبع شدہ اس مقالے کو عربی اور فارسی حواشی کا اردو ترجمہ کر کے ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفہ'' کے عنوان سے مئی 1944ء میں لاہور سے شائع کیا۔ یہ مقالہ پڑھ کر مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے مدیر ''الفرقان'' کو لکھا تھا:

> ''مولانا سندھیؒ کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بے شک مولانا کی نظر حضرت شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق ہے۔'' (31)

اسی طرح مدیر ''الفرقان'' مولانا محمد منظور نعمانی نے یہ مقالہ پڑھ کر لکھا تھا:

> ''چند مقامات میں تعبیر کی غرابت اور نکارت اور ایک آدھ جگہ مولانا کی منفرد رائے سے قطع نظر یہ مقالہ شاہ صاحب کی حکمت کا اجمالی تعارف ہی نہیں، بلکہ فی الحقیقت آپؒ کے علمی کام (تجدید فی العلوم الشرعیہ) سے واقفیت اور علیٰ وجہ البصیرت (بصیرت افروز) واقفیت کے لیے اس میں کافی سامان ہے۔ ولی اللّٰہی علوم و معارف کے لیے بجا طور پر اس مقالہ کو بنیادی لٹریچر قرار دیا جاسکتا ہے۔ نیز اس کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ''ولی اللّٰہی حکمت'' پر مولانا سندھیؒ کی نظر کس قدر گہری ہے۔ اور شاہ صاحبؒ کے علوم و افکار کا انھوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے۔'' (32)

اس دوران آپؒ نے بہت سے مقالات اور خطبہ ہائے صدارت لکھے۔ آخری تحریر

www.rahimia.org

اپنے انتقال سے بیس روز پہلے ''محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل سکول''، شہداد کوٹ ضلع لاڑکانہ کے لیے 2 اگست 1944ء کو ''خطبۂ اِفتتاح'' کے عنوان سے لکھی، یہ مولانا سندھیؒ کی آخری تحریر تھی۔ مولانا سندھیؒ کے چند ''خطبات ومقالات'' سب سے پہلے پروفیسر محمد سرور مرحوم نے مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ پھر راقم الحروف نے تمام دستیاب مقالات و خطبات جمع کیے، جو ''خطبات و مقالات مولانا عبیداللہ سندھیؒ'' کے عنوان سے ستمبر 2002ء میں ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

قرآنی سورتوں کی انقلابی شعور پر مبنی تشریح و تفسیر

رجب ۱۳۵۳ھ/ جولائی 1944ء میں بیماری کے باوجود حضرت سندھیؒ کراچی سے حیدر آباد، میر پور خاص اور نواب شاہ ہوتے ہوئے گوٹھ پیر جھنڈا میں تشریف لائے۔ اور مدرسہ دار الرشاد میں قیام فرما ہوئے۔ اس موقع پر مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ، مولانا سندھیؒ کی بیان کردہ سورتِ مزمل اور سورتِ مدثر کی تفسیر ''قرآنی دستورِ انقلاب'' کے عنوان سے مرتب کر کے حضرت سندھیؒ کو دکھانے اور اس کی تصحیح کرانے کے لیے لائے۔ مولانا دین محمد وفائی لکھتے ہیں:

> ''دار الرشاد (گوٹھ پیر جھنڈا) میں حضرت امام سندھیؒ کے ایک شاگرد مولوی بشیر احمد صاحب بی۔اے لدھیانویؒ قیام پذیر تھے۔ حضرت امام سندھیؒ نے ان سے سورۃ مزمل اور سورۃ مدثر کی تفسیر سُنی۔ جو کہ وہ کتابی صورت میں کتاب ''(قرآنی دستور) الانقلاب'' کے نام سے مرتب کر کے لائے تھے۔ مولوی بشیر احمد (لدھیانوی) نے حضرت امام سندھیؒ کی خدمت میں (یہ کتاب) پیش کی اور اس کی تصحیح کروائی......
>
> دوسرے روز صبح کے وقت حضرت امام سندھیؒ نے قرآن شریف کا درس دیا۔ وہ آیات زیر درس آئیں، جن میں مکہ شریف کو قرآنی انقلاب کا مرکز بنانے کا ذکر تھا۔ قرآن شریف پر یہ آپؒ کی آخری تقریر تھی اور اتنی دلچسپ، فکر

www.rahimia.org

انگیز، عالمانہ اور بلند پایہ تقریر تھی کہ اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف ذوقِ سماعت سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس! کہ ہم اسے یاد نہیں رکھ سکے، لیکن میں نے دیکھا تھا کہ مولوی بشیر احمد لدھیانویؒ اس کو قلمبند کر رہے تھے۔''(33)

۲۸ / شعبان ۱۳۶۳ھ (18 اگست 1944ء) کو آپؒ کے نواسے مولانا ظہیر الحق دین پوریؒ آپؒ کو دین پور لے جانے کے لیے دارالرشاد پیر جھنڈا پہنچے۔ مولانا ظہیر الحق دین پوریؒ کا بیان ہے کہ مولانا سندھیؒ آخری دم تک مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ کو قرآنی تفسیر قلم بند کراتے رہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''(۲۸ / شعبان) دین پور شریف سے چند عزیزوں کے ساتھ ہم وہاں (دارالرشاد پیر جھنڈا) پہنچے، ہم نے دیکھا کہ آپؒ تکیوں کے درمیان (کمزوری کی وَجہ سے) ایک گڑیا کی طرح دھنسے ہوئے (بیٹھے) تھے۔ حضرت (سندھیؒ) بولے جارہے تھے اور ان کے سامنے جناب مولانا بشیر احمد بی۔ اے لدھیانویؒ، جو کہ آپؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے، قلم برداشتہ لکھتے جارہے تھے۔''(34)

آخری وقت تک حضرت سندھیؒ کا حضرت شیخ الہندؒ سے عشق

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ واپس ہندوستان تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مشن پر ولی اللّٰہی علوم و افکار کے فروغ کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ حضرتؒ کے مقالات اور تحریرات چھپنے شروع ہوئے تو یہاں کے بعض حلقوں نے حضرت سندھیؒ کے علوم و افکار پر تنقید شروع کی۔ اس موقع پر حضرت سندھیؒ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

''ہمارے خیالات کو کوئی صحیح یا غلط سمجھے، ہم آخر تک ملک کی ترقی اور آزادی کے لیے اپنے استاذ مولانا محمود حسن دیو بندی شیخ الہندؒ کے طریقے پر کام کرتے ہوئے مریں گے۔ اللہ ہمیں توفیق بخشے۔ بس اس طرح جینا عبادت ہے۔ اور اس دُھن میں مرنا شہادت ہے۔''(35)

انتقال سے قبل ''دارالرشاد'' سے دین پور آمد

۲۹؍شعبان ۱۳۶۳ھ / 19؍اگست 1944ء کو مولانا ظہیرالحق دین پوری کے ہمراہ آپؒ دارالرشاد پیر گوٹھ جھنڈا سندھ سے اپنے پیر و مرشد کے خلیفہ اول حضرت مولانا ابوالسراج غلام محمد دین پوریؒ کی خانقاہ، دین پور ضلع خان پور، پنجاب تشریف لائے۔

وصالِ مبارک اور تدفین

۲؍رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ / 21 اگست 1944ء بروز منگل، بوقت ظہر، روزے اور سجدے کی حالت میں اسی خانقاہ میں آپؒ کی روح عالمِ بالا کی طرف پرواز کرگئی۔ اس طرح ہجری حوالے سے تقریباً بچاسی سال کی متحرک اور انقلابی زندگی بسر کرکے واصل بہ حق ہوئے۔

اسی روز آپؒ کو خانقاہِ راشدیہ قادریہ دین پور کے بانی حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ کے قریب دین پور کے قبرستان میں سپردِ خاک کردیا گیا ع

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی زندگی کے یہ نقوش غور و فکر اور سمجھنے والوں کے لیے ہدایت کا بڑا سامان رکھتے ہیں اور فکر و شعور کی بالیدگی کا باعث ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆

باسمہٖ تعالیٰ

ابتدائیہ

جب کائناتِ ارضی تمام وسائل زندگی سے آراستہ ہوگئی تو خالقِ انسانیت نے انسان کو پیدا کیا اور اُصولِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اس کو اپنی ہدایات سے نوازا۔ نہ صرف یہ، بلکہ پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو ہی شرفِ نبوت عطا کرکے اس امر کی نشان دہی کردی کہ اللہ تعالیٰ کو انسانیت کا راہِ ہدایت پر گامزن ہونا ہی مطلوب ہے۔

جوں جوں انسانیت اپنی ترقی کی منازل طے کرتی گئی، وہ اُصولِ فطرت سے مستفید ہوتی رہی۔ جب شیطانی طاقتوں اور بدی کی قوتوں نے انسانیت کو راہِ حق سے منحرف کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے کسی اولوالعزم انسان کو منصبِ رسالت عطا فرما کر انسانیت کو راہِ حق پر چلنے کے لیے راستہ آسان کردیا۔ یہ انبیاؑ اور رُسلؑ جہاں ان غلط رسومات اور تحریفات کو ختم کرنے کی جدوجہد اور کوشش کرتے جو اُصولِ فطرت پر گرد و غبار بن جاتی تھیں، وہیں انسانیت کے ذہنی ارتقا کو مدِنظر رکھتے ہوئے روشن راستے کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔ انبیا علیہم السلام کا طویل سلسلہ اسی حقیقت کا عکاس ہے کہ انھوں نے اُصولِ فطرت کے مطابق انسانوں کو راہِ حق پر چلنے کی نہ صرف تلقین و تبلیغ کی، بلکہ اپنے پیروکاروں کو منظّم کرکے صحیح نظام قائم کرنے کی بھی جدوجہد اور کوشش کی۔

جن انبیا و رُسل علیہم السلام کے قصص، قرآن حکیم میں مذکور ہیں، وہ واضح طور پر اس امر کے غماز (اشارہ کرنے والے) ہیں کہ انھوں نے ظلم، ناانصافی، حقوق غصب کرنے اور

www.rahimia.org

بدی کے نظام کے خلاف نہ صرف صدائے حق بلند کی، بلکہ وقت کے ظالموں کو سرنگوں کرکے انسانیت کو ظلم و زیادتی کے نظاموں سے نجات دلائی، اور اس جدوجہد میں کئی برگزیدہ پیغمبروں نے اذیت ناک سزائیں جھیلیں اور بعض نے تو جامِ شہادت بھی نوش کیا۔

جب انسانیت ذہنی ارتقا کے اس مرحلے میں داخل ہوئی جس کو بین الاقوامیت کا آغاز کہا جاتا ہے تو خالقِ فطرت نے اس دور کی رہنمائی کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منتخب کیا، جن کی نسبت قرآنِ حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ [36] (میں تجھے نوعِ انسانی کا امام بناؤں گا)۔

آپؑ نے بین الاقوامی دور کے آغاز پر انسانیت کی فطرتِ انسانی کے مطابق رہنمائی کی۔ اسی کے ساتھ آپؑ کو اپنے اِردگرد موجود نظام سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس کام کے لیے آپؑ نے دو مراکز قائم کیے:

1۔ بیت اللہ الحرام مکۃ المکرّمہ: یہ مرکز آپؑ نے اپنے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کے خاندان کے لیے قائم کیا۔

1۔ بیت المقدس: یہ مرکز آپؑ نے اپنے دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے قائم کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد بیت المقدس کے مرکز سے ان کے مشن کو لے کر چلنے والے بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھی۔ چناں چہ اس سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے نظامِ مملکت میں وہ کلیدی کردار ادا کیا کہ آج کے دور میں نظاموں کی نوعیت اسی حوالے سے جانچی جاتی ہے۔ یعنی معاشیات کے شعبے میں وہ دُور رَس قدم اٹھائے کہ پوری قوم بھوک اور قحط کی آفات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکی۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نامِ نامی انتہائی نمایاں ہے کہ آپؑ نے اپنی قوم کے لیے محض اعتمادِ خداوندی کے بل بوتے پر فرعون کے ظالمانہ اور جابرانہ نظام سے ٹکر لی اور بنی اسرائیل کو آزادی دلائی۔ نیز آپؑ نے اپنی قوم کی ان حرکات و اعمال پر صبر کیا جو اس میں

فرعونی غلامی کی وَجہ سے پیدا ہوگئی تھیں۔ علاوہ ازیں بنی اسرائیل کے سلسلۂ نبوت میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا بھی نظامِ عدل کے قیام اور فاسد حکومتوں سے نبرد آزما ہونے کے حوالے سے بڑا روشن کردار رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بیت اللہ الحرام مکہ مکرمہ کے مرکز سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انسانیت کی ترقی کے لیے کردار ادا کیا۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد جب انسانیت کا ذہنی اور عملی ارتقا بین الاقوامی مرحلے کے نقطۂ عروج پر پہنچا تو سیّد الکونین خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کل انسانیت کی جانب ہوئی۔ آپؐ نے خود ارشاد فرمایا:

”و کان النّبیّ یُبعث إلٰی قومہٖ خاصّۃً و بُعثتُ إلٰی النّاس کافّۃ.“ (37)

(مجھ سے پہلے تمام انبیا علیہم السلام اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث کیے گئے تھے اور مَیں تمام انسانیت کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔)

اس سلسلے میں آپؐ نے سب سے پہلے قریش کو تیار کیا۔ اور پھر قریش کی قیادت میں تیار ہونے والی جماعتِ صحابہؓ کے ذریعے سے آپؐ نے انسانیت کی فلاح و بہبود کا بین الاقوامی نظام قائم کیا۔ اس جماعت کے ذریعے رسول اکرمؐ نے نہ صرف مکہ کے ظالمانہ نظام کو ختم کیا، بلکہ مشرق و مغرب میں موجود قیصر و کسریٰ کے نظاموں کا خاتمہ بھی کر دیا۔

رسولِ خدا ﷺ نے توحید کے حقیقی مفہوم اور عملی تقاضوں کو نہ صرف واضح اور آشکار کیا، بلکہ پس ماندہ افراد کو اپنی ہی قوم کے ظالم سرداروں سے نجات دلانے کی سعی و کاوش کی۔ اس کی ابتدا اَفراد کی ذہن سازی اور ان پر مشتمل تنظیم بندی سے کی۔ چناں چہ مکی زندگی اسی حقیقت سے عبارت ہے۔ جاں نثار اور باشعور ساتھیوں کی جماعت قائم ہونے کے بعد ہی مدنی زندگی کا آغاز ہوا، جس میں دیگر اقوام کو ظلم و جور سے نجات دلانے کے عمل کی ابتدا ہوئی۔

یہ عمل خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوار میں بھی جاری ساری

رہا، بلکہ آپؐ کی بعثت کا ایک مقصد یعنی قیصر و کسریٰ کی مغلوبیت' حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ہی عملی طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ یوں رسول اکرمؐ کے کئی مقاصد ان کی جماعت کے توسُّط سے پورے ہوئے۔ اسی لیے مکمل دین اس حدیث سے عبارت ہے:

''مَااَنَاعَلَيْهِ وَاَصْحَابِی۔'' (38)

(وہ ہے جس پر میں اور میرے صحابہؓ کے دور میں عمل ہوا۔)

خلفائے راشدینؓ کا عہدِ زرّیں اسلام کا مثالی دور ہے۔ تاہم ان کے بعد کا دور بھی اپنے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے قابلِ اطمینان ہے۔ تاریخ کو اجتماعی نقطۂ نظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے نظام میں کوئی دُور رَس تبدیلی نہیں ہوئی۔ جس تبدیلی کا مؤرخین ذکر کرتے ہیں، وہ اس دور کے تقاضوں کا دوسرا نام ہے۔

کسی بھی دور کی سیاسی، معاشی اور سماجی صورتِ حال کا جائزہ اس دور کے تقاضوں کے پسِ منظر میں ہی لیا جاسکتا ہے، تاہم ان اَدوار میں بعض نامناسب اور غیر پسندیدہ تبدیلیوں کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ دین کے حامل اہلِ حق طبقے نے ہمیشہ اجتماعیت کے حوالے سے ناپسندیدہ اُمور اور ناروا شخصی رویوں پر شدید مزاحمت کا اظہار کیا۔ ان حق گو ائمہ، علما و مشائخ کو اس تنقید کی پاداش میں حکمرانوں سے زیادتیاں بھی سہنا پڑیں، بلکہ کئی نفوسِ قدسیہ کو اس راہ میں شہادت کی منزل سے بھی گزرنا پڑا۔

یہ ایک ایسی صفت و خصوصیت ہے کہ جس کا یورپ کے کلیسائی نظام میں کہیں نام ونشان تک نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس یورپ کے پوپ اور مذہبی رہنما وہاں کے حکمرانوں کو اپنے مذہبی جنون وجمود کا آلۂ کار بنائے رہے، جس کی وَجہ سے ہر نئی سوچ رکھنے والا شخص جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ چناں چہ وہاں جب شعور کی لہر آئی تو نہ بادشاہت خود کو بچا سکی اور نہ پاپائیت اپنا تسلط برقرار رکھ سکی۔ نتیجتاً عوام میں جمہوریت کے ساتھ ساتھ مذہب کے انکار کے جراثیم بھی سرایت کر گئے۔ چناں چہ آج کا یورپ مع ریاست ہائے متحدہ امریکا

لا مذہبیت کا علم بردار ہے، جب کہ مسلمان اقوام میں بادشاہوں کے خلاف عوامی جدوجہد کا شعور، دین کے علم بردار اہلِ حق طبقے نے دیا۔ چناں چہ ماضی قریب کے برعظیم ہند میں حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیتیں اس جدوجہد میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دینی جدوجہد اس دور سے تعلق رکھتی ہے، جب بہ حیثیتِ نظام کے اہلِ ہند پستی کا شکار نہیں ہوئے تھے، تاہم فکری حوالے سے چند درباریوں سے مسلمانوں کے حق میں دُوررَس غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ چناں چہ حضرت مجددؒ کی فکری اصلاح اور موجود نظام کی خوبیاں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں مکمل طور پر ظاہر ہوئیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس دور میں آئے جب مسلمانوں کا نظام فرسودہ ہو چکا تھا۔ اس دور کا ڈھانچہ لبِ گور (قبر) کو پہنچ چکا تھا۔ دینِ حق قنوطی مذہب کی شکل اختیار کر چکا تھا اور دنیا بھر میں عنقریب ایک نئی تبدیلی کا سماج شروع ہونے والا تھا۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دور کے نظام کو سہارا دینے کے بجائے یہ نظریہ دیا:

"فَکُّ کُلِّ نِظَام" [39] (ہر فرسودہ نظام کو توڑ دینا)

یعنی جاری نظام کو مکمل طور پر بیخ و بُن (جڑ) سے اکھاڑ دیا جائے اور اس کی جگہ عادلانہ اور فلاحی نظام قائم کیا جائے۔ اس سلسلے میں آپؒ نے جو سیاسی و معاشی اُصول پیش کیے، ان کی تفصیلات آنے والے صفحات میں قارئین ملاحظہ کریں گے۔ شاہ صاحبؒ نے محض نظریہ ہی نہیں دیا، بلکہ عملی طور پر بھی کئی ایسے اقدامات کیے یا ان میں کلیدی کردار ادا کیا، جو اُن کے اعلیٰ نظریے تک پہنچنے کے لیے بہ طورِ وسیلہ اور ذریعہ ضروری تھے۔

اس حقیقت سے کوئی دانش مند چشم پوشی نہیں کرے گا کہ نئے راستوں پر عمل بہ ہر صورت تحدید (عملی حد بندی) کا متقاضی ہوتا ہے۔ نیز کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے سفر میں گردِ راہ سے بھی واسطہ ایک ناگزیر امر ہوتا ہے، لیکن اس بنا پر مقاصدِ سفر آلودہ نہیں ہوا کرتے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نظریۂ انقلاب پیش کرنے کے ساتھ ہی اپنے

دور کے تقاضوں کے مطابق حکمتِ عملی اپنائی۔ اس سلسلے میں آپؒ کا ہندوستان کے ایک صوبے 'کابل' کے حکمران احمد شاہ ابدالی سے رابطہ ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آپؒ کی دعوت پر یہاں کی غلط روش اپنانے والی مقامی طاقتوں پر حملہ بھی ہوا۔ اسی طرح آپؒ نے اس دور کی سماجی ضرورت کے تحت اپنی انقلابی دعوت کے لیے اعلیٰ طبقوں کو بہ طورِ خاص مخاطب کرنا ضروری جانا۔ یہی چیز آپؒ کی "عملیّت" کی روشن دلیل ہے۔

افسوس کہ اُس دور کے اعلیٰ طبقوں نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا، جب کہ دیگر طبقات پہلے ہی غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہو چکے تھے۔ چناں چہ جسدِ سلطنت کے کمزور ہوتے ہی بدیشی جراثیم کا حملہ کارگر ثابت ہوا اور یوں برعظیم ہند غلامی کا طوق پہننے پر مجبور ہوا۔ جس کے بعد تبدیلئ نظام کی جدوجہد اس خطے کے لوگوں کو بدیشی حکمرانوں سے نجات دلانے کے لیے جنگِ آزادی میں تبدیل ہوگئی۔

چناں چہ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحب زادے اور جانشین حضرت امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دے کر بیرونی طاقت کے خلاف جدوجہدِ آزادی کی فرضیت کا اعلان کر دیا۔ پھر آپؒ کی نگرانی میں سیّد احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئیؒ نے اس حوالے سے جدوجہد اور کوشش کی، جو بالاکوٹ میں اپنی انتہا کو پہنچی۔ دوسری طرف شاہ محمد اسحاق دہلویؒ نے اپنے نانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے حاصل کردہ فکر و نظریہ اپنے شاگردوں میں منتقل کیا۔ چناں چہ ان کے فیض یافتہ اصحاب نے 1857ء کی جدوجہدِ آزادی میں شاملی کے میدان میں انگریز سامراج کا بھرپور مقابلہ کیا، جو اگرچہ فوری طور پر بار آور نہ ہو سکا، لیکن ہندوستان کی آزادی پر اس کے دُور رَس اثرات مرتب ہوئے۔

1857ء کے بعد اس دور کے سماجی تقاضوں کے مطابق تعلیمی حکمتِ عملی نے لے لی اور یوں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی نگرانی میں دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا۔ جس سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جیسے سپوت

عالمی سیاست پر جلوہ گر ہوئے، جنھوں نے اپنے دور کے تقاضوں کو بھانپتے ہوئے محاذ آرا تعلیمی مرکز یعنی علی گڑھ کے نوجوانوں کو علمائے حق کی صف میں برابر کا ساتھی بنانے کی پالیسی اپنائی۔ دوسری جانب برادرانِ اسلام اور برادرانِ وطن کے درمیان تعاون کو اپنی سیاسی حکمتِ عملی کا حصہ بنایا۔ نیز خلافتِ عثمانیہ کے تعاون سے برعظیم ہند کو آزادی سے ہم کنار کرنے کے لیے ''تحریکِ ریشمی رومال'' کی قیادت و رہنمائی کی۔ یوں انگریزی سامراج کو ایک بار پھر علمائے حق کی جدو جہد کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ چناں چہ شیخ الہندؒ کو مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عُزیر گلؒ سمیت کئی احباب و تلامذہ کے ساتھ جزیرۂ مالٹا میں اسارت (قید و بند) سے واسطہ پڑا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے مالٹا سے رہائی کے بعد عدمِ تشدد اور کل ہند بنیاد پر قومی سیاسی جدوجہد کو متعارف کرایا۔ چناں چہ آپؒ کے افکار سے مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، حاجی فضلِ واحد ترنگزئیؒ، حکیم محمد اجمل خاںؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، خان عبدالغفار خاںؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، نواب وقار الملکؒ اور مہاتما گاندھی جیسی قومی اور بین الاقوامی شخصیات نے استفادہ کیا۔

ان حضرات میں سے ایک یعنی مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنے استاد شیخ الہندؒ کے حکم پر افغانستان کا سفر کیا۔ وہاں بیٹھ کر انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے سات سال جدوجہد اور کوشش کی۔ اس کے بعد روس، ترکی اور حجاز جا کر وہاں ہونے والی سماجی اور انقلابی تبدیلیوں کا بہ غور مطالعہ کیا۔ انھوں نے قرآنِ حکیم، احادیثِ نبویہؐ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے زاویۂ فکر سے دورِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ اور دینی تعلیمات کی روشنی میں قوموں کی آزادی کے لیے ایک جامع انقلابی فکر و عمل مرتب کیا۔ پھر 24 سالہ جلا وطنی کے بعد مارچ 1939ء میں ہندوستان آکر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اَفکار پر مبنی انقلابی فکر و عمل سے متعارف کرانے کی بھر پور جدو جہد اور کوشش کی اور کئی

www.rahimia.org

ادارے اور تنظیمیں قائم کیں۔

اس کتاب میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی روشنی میں مولانا سندھیؒ کے مرتب کردہ افکارِ عالیہ کے ضروری اقتباسات جمع کر دیے گئے ہیں۔ کتاب کے مندرجات پروفیسر محمد سرور مرحوم کی کتابوں کے علاوہ ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' مؤلفہ مولانا سیّد محمد میاںؒ اور ''شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات'' مؤلفہ پروفیسر غلام حسین جلبانیؒ پر مبنی ہیں۔

یہ کتاب آج سے تقریباً پینتیس سال پہلے حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے زیرِ نگرانی ایک مجلسِ ترتیب نے مرتب کی تھی۔ جس میں حضرت مولانا سیّد منظور احسن دہلویؒ (ساہیوال)، صاحبزادہ مولانا محمد داؤدؒ (گوجرانوالا)، حضرت مولانا مفتی سعید الرحمٰن (ملتان) اور حضرت مولانا محمد اشرف عاطف (ساہیوال) وغیرہ علما اور فضلا شریک تھے۔ اب یہ کتاب مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ کی تحقیق و تخریج اور ترتیبِ نو کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

اس ایڈیشن میں چند نئے مقالات اضافہ کیے گئے ہیں۔ اس طرح ان کی تعداد بڑھ کر 20 ہوچکی ہے۔ کتاب کے مضامین کے ذیلی عنوانات قائم ہونے اور مشکل الفاظ کی تشریحات سے بھی اس کتاب کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ اس حوالے سے حضرت مفتی صاحب رائے پوری مدظلہٗ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ اس ایڈیشن میں ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن کا ''حرفِ فکر'' بھی شامل ہے۔ امید ہے کہ اس ایڈیشن سے قارئین کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا اور وہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کی سعیٔ مشکور سرانجام دیں گے۔

سیّد مطلوب علی زیدی
مقیم جامعہ امینیہ، طہماسپ آباد، راولپنڈی
۱۷/ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ / 15/دسمبر 2019ء

☆

www.rahimia.org

مقالہ 1

اِنسانیت کے چار بنیادی اَخلاق

www.rahimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

”أنّی فهّمنی اللّٰه تعالیٰ بفضله، أنّ مرجعَها إلیٰ خصالٍ أربعٍ .... و فهّمنی أنهٔ إنّما بُعِث الأنبیاءُ لِلدّعوة إلیها، و الحثّ علیها، و أنّ الشّرائع تفصیل لها، و راجعةٌ إلیها: إحداها: الطّهارة، ... و الثّانیة: الإخبات للّٰه تعالیٰ ... و الثّالثة: السّماحة ... و الرّابعة: العدالة ... فهٰذِهِ الخصال الأربعة إن تحقّقتَ حقیقتَها و فهِمتَ کیفیة إفضائها للکمال العلمی و العَمَلی .. و فطنتَ کیفیة انشعاب الشّرائع الإلٰهیة بحسب کلّ عصر منها، أوتیت الخیر الکثیر، و کُنت فقیهاً فی الدّین ممّن أراد اللّٰه بهٖ خیراً، و الحالة المرکّبة منها تسمّٰی بِ”الفطرة“. [40]

(اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے یہ بات سمجھائی ہے کہ تمام تر نیکیوں کا منبع چار بنیادی عادات اور اَخلاق ہیں: ان میں سے ایک طہارت، دوسرا اِخبات الی اللہ، تیسرا سماحت اور چوتھی عدالت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے یہ بات بھی سمجھائی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت انھی چار اَخلاق کی دعوت دینے اور ان پر اُبھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور ان پر نازل ہونے والی شریعتیں انھی چار اَخلاق کی تفصیلات ہیں اور وہی ان شریعتوں کا محور ومرکز ہیں۔ .... اگر آپ نے ان چار اَخلاق کی حقیقت جان لی اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علمی اور عملی کمالات کی کیفیت سمجھ لی، اور یہ سمجھ لیا کہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ان سے شرعی قوانین کیسے پھوٹتے ہیں تو آپ دین میں شعور اور سمجھ رکھنے والے ایسے افراد میں سے ہوں گے، جن کے ساتھ اللہ نے بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔ ان چاروں اَخلاق کے مجموعے سے پیدا ہونے والی مرکب حالت اور کیفیت کو ”فطرتِ انسانی“ کہا جاتا ہے۔)

اِنسانیت کے چار بنیادی اَخلاق

انسان کو اس دنیا پر بستے کتنی ہی صدیاں ہوگئیں۔ اسے اِرتقا کی موجودہ منزل تک پہنچنے میں کیا کچھ مراحل طے کرنے پڑے۔ اس طویل مدت میں انسانوں نے کئی تمدُّن بنائے۔ بڑے بڑے فلسفوں کی بنیاد رکھی۔ بے شمار علوم وجود میں آئے۔ اَخلاق و عادات کے نِت نئے معیار بنے۔ انبیا علیہم السلام مبعوث ہوئے اور ان کی زبان سے خدا تعالیٰ کے پیغامات ان کے بندوں کو ملے۔ فلسفیوں اور حکیموں نے نئی نئی باتیں سوچیں۔ الغرض! اب تک اتنے تمدنی، اَخلاقی، فلسفی اور دینی نظریے معرضِ وجود میں آچکے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔

اَخلاقی نظریات میں وحدتِ فکر اور طبقاتی فکر کا موازنہ

ہر دور ایک نیا فکر لے کر آیا۔ ہر قوم نے یہ دعویٰ کیا کہ جو تمدن ان کا ہے، ویسا تمدن نہ کسی کا پہلے تھا اور نہ آئندہ کسی کا ہوگا۔ ”أَنَــا وَ لاَ غَیْــرِیُ“ (میرے سوا کوئی نہیں) کی صدائیں ہمیں ہر قوم کی تاریخ کے دورِ اقبال میں سننے میں آتی ہیں۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کہ ہر قوم کی انفرادیت اپنی جگہ مُسلَّم ہے اور ہر فکر نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے لیے نئی فضا بنائی، لیکن جس طرح انسان تمام وقتی، مکانی، عارضی اور ظاہری اختلافات کے باوجود اصل میں سب ایک ہیں۔ خواہ کوئی آج سے دس ہزار سال پہلے کا غیر متمدن انسان ہو یا اس زمانے میں وسطِ افریقا کے جنگلوں میں بسنے والا حبشی یا آج کا ترقی یافتہ یورپین۔ جس طرح ان سب میں انسانیت کا ایک جامع نقطہ

www.rahimia.org

مشترک ہے اور گو لاکھوں برس کے ارتقا نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، لیکن جہاں تک اصل انسانیت کا تعلق ہے، وہ اس میں اب بھی ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ بعینہٖ اس طرح ان گوناگوں اَخلاقی نظریوں، تمدنی اصولوں اور افکار و اَدیان میں بھی ایک گونہ (ایک حد تک) وحدت ہے۔ گو اِرتقا نے ان کو عجیب عجیب شکلیں دیں اور انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن اس کے باوجود ان تمام کے درمیان چند بنیادی باتیں ایسی ہیں جو سب میں مشترک نظر آئیں گی۔

ظاہر بینوں (دیکھنے والوں) پر ہمیشہ یہ حقیقت مخفی رہی اور وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح اپنی محدود دنیا اور اپنے طبقاتی فکر کو سب سے جدا اور الگ سمجھتے رہے۔ اور انھوں نے اپنے ذہن کو باقی ذہنِ انسانی سے الگ تھلگ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح پانی بہتے ہوئے دریا سے بے تعلق ہوجائے تو اس میں سڑانڈ (بدبو) پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح فکری اور ذہنی علاحدگی نے ایسی قوموں کے دماغوں کو مفلوج کردیا ہے۔

جس طرح کائنات کی کثرت انسانی ذہن کو پریشان کر دیتی ہے اور وہ کائنات میں اپنا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ اس کثرت میں وحدت کا پتہ لگائے، اسی طرح صاحبِ نظر حکیم مظاہرِ انسانی کی ان رنگارنگیوں میں، جنھیں ہم کلچر اور فکر کا نام دیتے ہیں، مشترک حقائق کی تلاش کرتا ہے، تاکہ وہ عالَم گیر انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت پاکر اپنے تمدن کی بنیاد ان اُصولوں پر رکھے جو ساری انسانیت پر جامع ہوں، تاکہ قوم کا فکر اصل سرچشمۂ حیات سے بے تعلق نہ ہو اور اس کا ذہن ساری انسانیت اور اس کی تمام فکری جدوجہد کی اچھی متاع کو اپنے اندر لے سکے۔

اسلام اور عالم گیر وحدتِ انسانیت

اسلام نے ابتدائی ایام میں تاریخِ انسانی کی یہ خدمت بڑی خوبی سے سرانجام دی تھی۔ قرآن (حکیم) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کس طرح مختلف قومیں اور تمدن آپس میں گتھم گتھا ہورہے تھے۔ ہر قوم اپنے آپ کو کافی بالذّات (اپنی

ذات کو کافی) اور **مستغنی عن الغیر** (دوسروں سے بے نیاز) سمجھتی تھی:

☆ عیسائی کہتے تھے کہ جو عیسائی نہیں وہ انسان ہی نہیں۔

☆ اسی طرح یہودیوں نے اپنے آپ کو سب سے جدا کرلیا تھا۔

☆ ایرانی اپنی جگہ مگن تھے۔

☆ ہندوستان والوں نے سمندر پار دیکھنا تک خلافِ مذہب بنا رکھا تھا۔

اس وقت دنیا کی یہ حالت تھی جیسے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی رُک گیا ہو اور ایک گڑھا دوسرے سے جُدا ہو اور سب الگ الگ سڑ رہے ہوں۔

عربوں کی نئی قوم ایک سیلاب کی طرح نازل ہوئی۔ انھوں نے (قرآنی علوم وفکر کی سچائی کا سیلاب لے کر) سب گڑھوں کو زیر کر کے ایک کر دیا۔ (جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم کی مثال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ... فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾ (41)

(اُس نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پھر اُس سے اپنی مقدار میں نالے بہنے لگے۔ پھر وہ سیلاب پھولا ہوا جھاگ اُوپر لایا۔ ... پھر جو جھاگ ہے، وہ یوں ہی جاتا رہتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ دے، وہ زمین میں پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔)

اس طرح ساری نوعِ انسانی الگ الگ گڑھوں کے بجائے ایک ذَخّار (پانی سے لبالب بھرا ہوا) سمندر بن گئی۔ سب قوموں کے ذہنی اور فکری دھارے اس میں گرنے لگے۔ اس طرح مجموعی طور پر انسانیت کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

ہر اچھائی قبول کرنے اور ہر بُرائی کو چھوڑنے کا اصول

عرب اَن پڑھ تھے۔ انھوں نے سب قوموں کے علوم کو سر آنکھوں پر لگایا۔ ان کا

کوئی بندھا ٹکا تمدن نہ تھا۔ انھوں نے سب تمدُّنوں کو کھنگالا اور (بہ قول عالمِ ربانی اور یمن کے بزرگ شاعر[42]):

خُذ مَا صَفَا وَ دَعِ الکَدَرُ
وَ کِلِ الاُمُوْرَ اِلٰـی الْقَدَر

(جو چیز صاف ستھری ہو، اُسے لے لو اور جو آمیزش والی ہو، اُسے چھوڑ دو۔ اور اپنے تمام امور کو تقدیر کے حوالے کر دو۔)

پر عمل کرتے ہوئے سب تمدنوں کے اچھے پہلو لیے۔ اس طرح انھوں نے عیسائیت، یہودیت، مجوسیت اور صابیت سب (ماننے والے انسانوں کو انسانیت کے حوالے سے) ایک آنکھ سے دیکھا اور سب کو برملا طور پر کہہ دیا کہ:

''انسان خواہ کوئی بھی ہو، جو انسانیت کے بنیادی اصولوں کو مان لے، وہ اچھا انسان ہے۔ نام، نسل، رنگ اور گروہوں کے امتیازات سب باطل ہیں۔''[43]

دوسرے معنوں میں عربوں نے انسانیت کو جو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی، اس کا شیرازہ پھر از سرِنو باندھ دیا اور الگ الگ اور باہم مخالف اور متخاصم (باہم جھگڑنے والی) قومیّتوں کو ایک صحیح بین الاقوامی نظام دیا۔ یہی اسلام کا عالَم گیر انقلاب تھا۔

قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد

مسلمانوں نے اسلام کے اس عالَم گیر انقلاب پر بعد میں ایک عالَم گیر تمدنِ انسانی کی بنیاد رکھی۔ اِدھر بغداد میں، اُدھر قرطبہ میں مشرق و مغرب کی تمام قوموں اور ان کے افکار و مذاہب کا اجتماع ہوا۔ ہر نسل کے لوگ آپس میں ملے۔ ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوئے۔ ایک زبان کے علوم دوسری زبان میں ترجمہ ہوئے۔ ہندوستان کی طب و حکمت، یونان کے فلسفے، اسکندریہ کے علوم، ایرانیوں کا ادب، یہودیوں اور عیسائیوں کی روایاتِ مذہبی اور عربوں کی زبان اور دین سے انسانی تمدن کی ایک نئی ہیئت (شکل)

کی ترکیب ہوئی۔ جو ماضی کے سارے علوم وفنون اور حکمت و فلسفے کا نچوڑ تھا اور حال واستقبال کے لیے مشعلِ راہ۔ یہ تھا اسلام کا تاریخی کارنامہ۔ انسانیت مسلمانوں کے اس احسان کو کبھی نہیں بھولے گی۔

اسلام کے اس تاریخی کارنامے کی روح دراصل اس کی عالَم گیریت اور جامعیت تھی۔ مسلمانوں نے سب مذہبوں اور تمدنوں کو اصلاً ایک سمجھا۔ اُن کی مذہبی کتاب نے ساری انسانیت کو مخاطب کیا۔ اُن کے مفکروں نے علم و فلسفے پر بحث کی تو سب قوموں کے ذہنی سرمائے کو چھان ڈالا۔ اُن کے مؤرخ تاریخ لکھنے لگے تو انھوں نے حضرت آدمؑ سے شروع کر کے ساری قوموں کی تاریخ کو ایک زنجیر کی کڑیاں بنا کر پیش کیا۔

ہر قوم جو اپنے زمانۂ تاریخ میں فکر و عمل کی دنیا میں بین الاقوامی قیادت کی مالک بنی، اس کا طُرّۂ امتیاز اس کی یہ عالَم گیریت اور جامعیت تھی۔ پھر جب اس قوم کے مٹنے کے دن آئے تو اس قوم کے افراد کی نظریں تنگ ہوگئیں۔ ان کے دماغ اَور بھی تنگ ہوگئے۔ انسانیت کا بین الاقوامی تصور تو الگ رہا، ان کے ذہنوں میں اپنی پوری قوم کی سمائی (گنجائش) تک مشکل ہوگئی۔ وہ انسانیت سے قومیت پر آگئے اور قوم سے ان کے فرقے بن گئے۔ آخر فرقوں میں بھی آپس میں دال بٹنے لگی اور ’’نفسی نفسی‘‘ (اپنی اپنی ذات) تک نوبت پہنچ گئی۔ پہلے یہودی اور عیسائی اس روگ (مرض) میں مبتلا ہوئے اور آج مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔

قومی ذہن کا انسانی تصور سے عاری ہونا، زوال کی طرف اس کا پہلا قدم ہوتا ہے۔ اسلام کے حق میں یہ دوام کا وعدہ محض اسی بنا پر تھا کہ وہ انسانیتِ عامہ کا تصور پیش کرتا ہے۔ فی الحقیقت مسلمان وہی ہے جس کے ذہن میں کُل انسانیت کی گنجائش ہے۔ ایک لحاظ سے اللہ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کا خاص کمال

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حکمت آفرین طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ اس دور میں

انھوں نے اسلام کی اس عالَم گیر روح کو بے نقاب کیا۔ اس سلسلے میں تمام مذاہب، ادیان اور نظام ہائے اَخلاق میں مشترک اُصول متعین فرمائے۔ اس طرح ازسرِنو انھوں نے مسلمانوں کے سامنے وہ تمام ذہنی وسعتیں کھول دیں، جو اسلام کے عہدِ اوّل میں دین کی روح سمجھی جاتی تھیں، لیکن بعد میں جب مردہ دلی اور ذہنی پس ماندگی کا دور دورہ ہوا تو مسلمان بھی گروہ بندی کا شکار ہو گئے اور وہ بین الاقوامی قیادت کے منصب سے محروم کر دیے گئے۔

شاہ صاحبؒ نے جس طرح ائمہ فقہ کے چار مذاہب میں مطابقت پیدا کی۔ پھر حدیث و فقہ میں غلط فہمی سے بعض لوگوں کو جو تضاد نظر آتا تھا، اس کو سلجھایا۔ اس کے بعد یہ بھی بتایا کہ حدیث اور قرآن میں کوئی تعارُض نہیں، بلکہ حدیث دراصل قرآن ہی سے مُستَنبط ہے۔ نیز شریعت و طریقت میں جو نزاع چلا آرہا تھا اور اہلِ شریعت، طریقت والوں سے بیزار تھے اور اہلِ طریقت، شریعت والوں پر خفا۔ شاہ صاحبؒ نے طریقت کے افکار کو شریعت پر منطبق کیا اور بتایا کہ علم و معرفت کی رقابت محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

اسلامی افکار و مذاہب کے مروّجہ دائرے سے شاہ صاحبؒ کی نظر اَور بلند ہوئی اور آپؒ کی بصیرت افروز نگاہ پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ حق شناس جہاں بھی ہوئے اور جس دور میں بھی ہوئے، ان سب نے اس حقیقت کو ایک ہی رنگ میں دیکھا ہے۔ بے شک انھوں نے جن الفاظ میں اس حقیقت کی تعبیر کی، وہ زمانہ، ماحول اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا تھی۔ کم نگاہوں نے اس تعبیر کو اصل سمجھ لیا اور لگے آپس میں لڑنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ یہی اصل ہے اختلافِ عقائد کی۔ لوگوں نے ”حَبلُ اللّٰہ“ (اللہ کی رسّی) کو چھوڑ دیا اور اپنے تعصّبات کو خدا سمجھ بیٹھے۔

خدا اور بندے کے تعلق کو ہی لے لیجیے! کسی نے بندے اور خدا کے تعلق کو بیٹے اور باپ سے تعبیر کیا اور کسی نے حُلول (سرایت کر جانے) سے۔ الغرض! ہر قوم نے اپنے

اپنے مزاج کے مطابق اس **ما فوق التّعبیر** (تعبیر سے بالاتر خدا اور بندے کے) تعلق کو عام فہم بنانے کی کوشش کی۔ مقصود سب کا ایک ہی تھا، لیکن تعبیریں جدا جدا ہو گئیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان تعبیروں کی وَجہ سے اصل حقیقت پر پردے پڑنے لگے۔ آخر کو قرآن آیا تو اس نے اسی (خدا اور بندے کے) تعلق کو اس طرح پیش کیا کہ پہلے توہُّمات اور گمراہیوں کا سدِ باب بھی ہو جائے اور ہر ملت اور گروہ' خالق اور مخلوق کے باہمی رشتے کو بہ آسانی سمجھ بھی لے۔ اس مسئلے میں قرآن کا اصل مقصد مذاہب کی تغلیط (غلط قرار دینا) نہ تھی، بلکہ دین کا ایک ایسا عالَم گیر تصور پیش کرنا تھا، جو سب کی سمجھ میں آجائے اور اس سے پہلے کی طرح غلط فہمیاں بھی پیدا نہ ہوں۔

قرآن حکیم تمام قوموں کو ایک نظریے پر جمع کرتا ہے

شاہ صاحبؒ کے اس فکر کی بدولت ہی ہم نے سمجھا کہ قرآن **جامِعُ الاُمم** (تمام قوموں کو جمع کرنے والا) ہے اور وہ صرف ایک گروہ یا قوم کی تاریخ کے بیان تک محدود نہیں۔ بے شک اس نے زیادہ تر بنی اسرائیل کے انبیاؑ کا ہی ذکر کیا، لیکن یہ مصلحت اور ضرورت کا تقاضا تھا۔ یقیناً فکر بھی انسانیت کی طرح غیر محدود ہوتا ہے، لیکن اسے دوسروں کو سنانے کے لیے خاص الفاظ اور حروف میں قید کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح مخاطبین کی رعایت سے اسے ایک خاص زمان اور مکان کے ساتھ مخصوص کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کے پیرایۂ بیان کی خصوصیت بھی اسی بنیاد پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جا بہ جا بین السطور (وہ مفہوم جو عبارت میں مخفی ہو) مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت بھی اسی بنیاد پر ہے۔ اگر آدمی قرآن کے مطالعے میں تدبر و تعمق (گہری نظر) سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ کُل نوع انسانی قرآن میں اپنا مافی الضّمیر اور مقصد پا سکتی ہے۔

انسانیت کے چار بنیادی اَخلاق کا تعارف اور اہمیت

ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہؒ حکیم و صدیق ہیں، جنھوں نے سارے ادیان، مذاہب اور شریعتوں کا اصلاً ایک ہونا ثابت کیا۔ اور پھر اِن بنیادی اصولوں کا تعین بھی کیا، جو ہر

دین کا مقصودِ حقیقی تھے اور ہر مذہب اور شریعت ان کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی رہی۔ (44)

شاہ صاحبؒ ''**ھمعات**'' میں لکھتے ہیں:

''اس فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیبِ نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے انبیاؑ کو انھی چار خصلتوں کے لیے بھیجا۔ تمام مللِ حقہ میں انھی چار خصلتوں کا اِرشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص ہے۔ ''بِــــرّ'' یعنی بھلائی انھی چار خصلتوں کا حاصل ہے۔ اور ''گناہ'' سے مراد وہ عقائد و اعمال اور اَخلاق ہیں جو انھی چار خصلتوں کی ضد ہیں۔...

1۔ پہلا خُلق ؛ طہارت

ان چار خصلتوں میں ایک ''طہارت'' ہے۔ اس کی حقیقت اور اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔...

یہ گمان نہ کرلینا کہ یہاں طہارت سے مراد محض وضو اور غسل ہے، بلکہ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی روح اور ان کا نور ہے۔...

جب آدمی نجاستوں سے آلودہ ہو اور میل کچیل اور بڑھے ہوئے بال اس کے بدن پر جمع ہوں، بول و براز اور رِیح نے اس کے معدے میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض، تنگی اور حُزن اپنے اندر پائے گا۔ جب وہ غسل کرے گا، زائد بالوں کو دُور کرے گا، صاف لباس زیبِ تن کرے گا اور خوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح، سرور اور اِنبساط کا احساس ہوگا۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ طہارت یہی وِجدانی کیفیت ہے، جو اُنس اور نور سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

2۔ دوسرا خُلق ؛ اِخبات

دوسری خصلت اِخبات (خدا تعالیٰ کے لیے خُضوع) یعنی نہایت درجے

کی عجز و نیاز مندی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویشوں سے فراغت کے بعد صفاتِ الٰہی، اس کے جلال اور اس کی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی حیرت اور دہشت' خشوع و خضوع یعنی نیازمندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آجاتا ہے اور اس عجز اور اُفتادگی کی حالت میں وہ کسی اَور قوت کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا پاتا ہے تو اس کی یہ بے دست و پائی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بلند تر کسی اور قوت کو مانے۔''(45)

ایک سائنس دان نے اسے ''مادے'' سے تعبیر کیا۔ فلسفی نے اسے ''عقلِ کُل'' مانا اور مذہبی اسے ''خدا'' کہتا ہے۔ بہرحال انسان کہیں نہ کہیں اس کائنات کے سامنے اپنے آپ کو ضرور مجبور پاتا ہے۔ یہی مجبوری اسے خضوع کی طرف لے جاتی ہے۔

3۔ تیسرا خُلق؛ سماحت

''تیسری خصلت ''سماحت'' (فیاضی) ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ''نفس' طلبِ لذت، حُبِّ انتقام، بخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔''

اس کے ذیل میں عفت، جدوجہد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ تمام آجاتے ہیں:

(۱) پیٹ اور شرم گاہ کی ہر خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام ''عفت'' ہے۔

(۲) آسائش اور ترکِ عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام ''جدوجہد'' ہے۔

(۳) مصیبت، پریشانی اور دباؤ کے موقع پر جزع فزع (رونے پیٹنے) سے رُکنا ''صبر'' ہے۔

(۴) کسی سے بدلہ اور انتقام کی خواہش کو دبانا ''عفو'' ہے۔

www.rahnuma.org

(۵) خواہشِ بخل کو چھوڑ دینے کا نام ''سخاوت'' ہے۔

(۶) حرص اور لالچ کو قبول نہ کرنا ''قناعت'' ہے۔

(۷) شریعت کی بنائی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرنا اور عدل قائم کرنا ''تقویٰ'' ہے۔

اس خصلت کی اصولی بات ایک اہم چیز ہے اور وہ یہ کہ رائے کلی اور مفادِ عامہ کو پست حیوانی خواہشات پر غالب ہونا چاہیے۔

4۔ چوتھا خُلق : عدالت

چوتھی خصلت ''عدالت'' ہے۔ یہ ایک ایسی خصلت ہے کہ جس کے ذریعے سے عدل و انصاف کا نظام قائم کیا جاتا ہے اور مفادِ عامہ کی سیاست بھی اسی خُلق کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روحِ رواں یہی خصلت ہے۔ ادب، کفایت، حریت، سیاستِ مدنیہ اور حُسنِ معاشرت وغیرہ سب ''عدالت'' کے خُلق کے شعبے ہیں:

(۱) اپنی حرکات وسکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع قطع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا ''ادب'' ہے۔

(۲) جمع اور خرچ، خرید وفروخت اور تمام معاشی معاملات میں عقل و تدبر سے کام لینا ''کفایت'' ہے۔

(۳) خاندانی امور کو بغیر کسی بیرونی دباؤ کے صحیح طریقے کے ساتھ سرانجام دینا ''حریت'' ہے۔

(۴) ملکوں اور قوموں کا نظام درست رکھنا اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا ''سیاستِ مدنیہ'' ہے۔

(۵) باہمی بھائی چارہ اختیار کرنا اور ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے اُلفت و بشاشت سے پیش آنا ''حُسنِ معاشرت'' ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام شعبے عدالت کے اس خُلق سے متعلق ہیں۔ اور وہ یہ کہ انسانی نفس کچھ اس طرح ہو کہ وہ اچھا نظام اختیار کرے اور اس خُلق کے سبب عدل و انصاف کی مندرجہ بالا صورتیں اس سے صادر ہوں۔'' (46)

یہی چار اَخلاق ہیں جن کی تکمیل سے انسانیت کو ترقی ملتی ہے اور ان کے چھوٹنے سے انسان قعرِ مذلت (ذلت کے گڑھے) میں گرتا ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی تمدن بنے اور جس قدر بھی فکری ادارے قائم ہوئے اور جو بھی شریعتیں معرضِ وجود میں آئیں، اگر ان کے پیشِ نظر انسانوں کو اُٹھانا اور ان کی حالت کو درست کرنا تھا تو انھوں نے انھیں چار اَخلاق کو سنوارنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اسلام، عیسایت اور یہودیت کا معاملہ تو بالکل ظاہر ہے، لیکن اگر چینی فلسفۂ اَخلاق، ہندوؤں کے مذہبی فکر، ایرانیوں کے نظامِ حیات، یونانیوں کی حکمت اور قدیم مصریوں کے مذہب کا بہ غور مطالعہ کریں تو آپ کو کسی نہ کسی صورت میں ان چار اَخلاق کی دُرستی اور ان کی ضدوں سے بچنے کی تاکید ملے گی۔

ایرانی حکیم بزرجمہر (بن البختکان) کے اقوال، افلاطون کا اپنی کتاب ''ریاست'' میں عدالت کو زندگی کی بنیاد ثابت کرنا، قدیم مصریوں کا مذہبی صحیفہ ''کتابُ الموتٰی'' کے ارشادات، ہندوؤں کے ویدوں اور گیتا کا پُرحکمت کلام اور چینیوں کے اَخلاقی فلسفے ''کنفوشس'' کی تعلیمات؛ ان سب کا حاصل کم و بیش یہی تھا کہ انسانیت کے ان چار بنیادی اَخلاق کو ترقی دی جائے۔ تمام رسول اسی لیے مبعوث ہوئے اور تمام حق شناس حکیم اور صدیق اپنی اپنی قوموں کو یہی پیغام سناتے رہے۔ (47)

لہٰذا اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو پھر مسلمانوں اور غیرمسلموں کے نظریۂ اَخلاق میں اصولی نزاع نہ رہے گا اور ہم میں فراخ دلی اور رواداری بھی پیدا ہوجائے گی۔ بے شک سماج کے چھوٹے طبقوں میں تو چپقلش موجود رہے گی، لیکن ایسے ہی جیسا کہ ایک ہی ملت کے مختلف فرقوں میں مخصوص رُجحانات اور استعدادوں کی بنا پر ذہنی اور مذہبی اختلافات ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اصحابِ عقل و رُشد کا تعلق ہے، ان کو آفتابِ نبوت سے پھوٹی

ہوئی شعاؤں اور حکیم کے دماغ سے نکلے ہوئے اَخلاقی نظام میں فرقِ مراتب تو ضرور نظر آئے گا، لیکن وہ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد نہ سمجھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صالح غیرمسلم اور صالح مسلمان ایک دوسرے کی خوبیوں کو بہ حیثیتِ انسان نظرِ انصاف سے جانچنے کے قابل ہوں گے۔

عصرِ حاضر میں دین کے صحیح تعارف کی ضرورت

ہمارے خیال میں یہ تصورکُل بنی نوعِ انسان کو موجودہ خلفشار سے نکال سکتا ہے۔ ہر قوم کے عقل مند طبقوں کا رُجحان اب اس طرف ہو رہا ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے اپنے فکری نظاموں کو عالَم گیر انسانیت کا ترجمان بنا کر پیش کریں، لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ دین جو صحیح معنوں میں ساری دنیا کا دین تھا اور وہ کتاب جو کُل نوع انسانی کی ہدایت کی علَم بردار تھی اور وہ ملت جس نے سب قوموں کو ایک بنایا اور جس کا تمدن ساری انسانیت کی ''باقیاتِ صالحات'' کا مرقع تھا۔ وہ دین، وہ کتاب، وہ ملت اوراس کا تمدن ایک فرقے کی جاگیر بن کر رہ گیا ہے۔

وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وسعت پذیر دور میں جس میں کہ کرۂ زمین کی سب دوریاں سُکڑ گئی ہیں، ملکوں، قوموں اور برِّاعظموں کی سرحدیں سمٹتی جا رہی ہیں، ریل، جہاز طیاروں اور ریڈیو نے سب انسانوں کو اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لیے ایک انسانی برادری میں بدل دیا ہے۔ اس زمانے میں ایسی تعلیم کو جو صحیح معنوں میں عالَم گیر اور انسانی تھی، ایک گروہ اور جماعت میں محدود کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ معلوم نہیں مسلمان اسلام کو کب سمجھیں گے؟ اور قرآن کے پیغام کو کب اپنائیں گے؟

☆

مقالہ 2

خدا پرستی۔ انسان دوستی

www.rahimia.org

خدا پرستی اور انسان دوستی

اللہ اور رسولؐ کی نظر میں

عن أبی هُريرة قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم:

”إنّ اللّٰہ عزّ و جلّ یقول، یوم القیامة:

یا ابنَ آدم! مرضتُ فلم تعُدنی،

قال: یا ربّ! کیف أدعوک؟ و أنت ربّ العالمین،

قال: أما علمتَ أنّ عبدی فُلاناً مرِضَ فلم تعُدہُ، أما علمت أنّک لو عُدتہُ لوجدتنی عندہ؟

یا ابن آدم! استطعمتُک فلم تُطعمنی،

قال: یا ربّ [و] کیف اُطعمک؟ و أنت ربّ العالمین،

قال: أما علمت أنّہُ استطعمک عبدی فلانا فلم تُطعمہُ؟ أما علمتَ أنّک لو أطعمتہُ لوجدتَ ذٰلک عندی؟

یا ابن آدم! استسقیتک فلم تسقنی،

قال: یا ربّ! کیف أسقیک؟ و أنت رب العالمین،

قال: استسقاک عبدی فلان فلم تسقہ، أما إنّک لو اسقیتہ وجدت ذٰلک عندی.“

(ترجمے کے لیے دیکھئے صفحہ 97-96)

خدا پرستی۔ انسان دوستی

میرے نزدیک ساری آسمانی کتابیں دراصل وحدتِ انسانیت کی ترجمان ہیں۔ حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے مفسر تھے، لیکن ہوا یہ کہ ان کے متبعین نے اپنی الگ الگ ٹولیاں بنالیں اور اپنی ٹولی کی بات کو وہ ساری انسانیت کا مدعا بنا بیٹھے۔ ہر قوم کا دعویٰ ہے کہ ہمارا نبی آخری ہے اور ہمارا دین سب سے سچا دین ہے۔ ہر قوم اس کے ثبوت میں دلیلیں دیتی ہے۔ بُرہان و منطق کے زور سے اپنی بات منوانے پر اصرار کرتی ہے۔ دوسروں کی کتابوں میں مین میخ (نقص) نکالتی ہے۔ اور ان کی کتابوں پر اعتراضات ہوں تو ان کی صفائی پیش کرتی ہے۔ کیا ایک حقیقت کا جویا (متلاشی) اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہوجاتا؟ آخر یہ کیسے پتہ چلے کہ اصل ہدایت کہاں ہے؟ اور حق کیا ہے؟

دینِ حق معلوم کرنے کا طریقہ

ان اُلجھنوں سے نکلنے کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ مذاہب اور آراء کے ان اختلافات کو ایک طرف رکھو اور عام انسانیت کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ پھر پتا لگاؤ کہ آخر مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضا کیا ہے؟ انسان کن باتوں سے قعرِ تنزل (پستی کے گڑھے) میں گرے؟ اور کون سے اُصول تھے، جن پر چل کر وہ بامِ رِفعت (بلندی) پر پہنچے؟ اس تلاش و جستجو کے بعد انسانوں کی اس طویل تاریخ میں جو اُصول سب قوموں کے درمیان مشترک نظر آئیں گے، وہ **"فطرت اللّٰہ"** ہے۔ اور یہی **"دینِ قیِّم"** ہے اور جو تعلیم مجموعی انسانیت کی اس فطرت کے مطابق ہوگی، وہی حق ہے۔

قرآن حکیم کل انسانیت کی کتاب

قرآن مجید کے برحق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے، جو سب انسانوں کے فطری رُجحانات کی آئینہ دار اور ساری نوعِ انسانی کے فائدے کے لیے ہے۔ لیکن اگر قرآن کو ایک فرقے یا گروہ کی کتاب بنادیا جائے تو پھر یہ ثابت کرنا کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور اس کی تعلیمات سب کے لیے ہیں اور ہر زمانے کے لیے ہیں، بڑا مشکل ہے۔ قرآن کی عالَم گیریت محض اس بنا پر ہے کہ وہ کُل انسانیت کی کتاب ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعے کی اہمیت

میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی ترقی کے لیے ہر دور میں اچھے لوگ آتے رہے۔ ان حق شناس بندوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے اپنے وقت میں تعلیماتِ الٰہی کی تبلیغ کی اور اس طرح انسانیت کا قافلہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا چلا گیا۔ عہدِ ماضی کے یہ روشن نقوش، انسانی تاریخ کے صفحات پر کم وبیش کچھ ردّ و بدل کے ساتھ ثبت ہیں۔

قرآن کے عالِم کو چاہیے کہ وہ انسانی تاریخ کے اس مطالعے سے معلوم کرے کہ انسانی ترقی کے عام اور غیر متبدل قوانین کون سے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن میں غور کرے۔ وہ دیکھے گا کہ قرآن ان ہی عالَم گیر اور ناقابلِ تغیر اصولِ حیات کو پیش کرتا ہے۔ یہ قرآن کا صحیح مفہوم ہے۔ یہی چیز ہے جو ازل سے ابد تک قائم رہے گی۔ اسی کے ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے۔

شریعتوں اور ملتوں کے اختلاف کا پسِ منظر

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، تمام انسانوں میں ایک وحدتِ فکری ہے اور ان میں یہی ایک نقطۂ اشتراک ہے، جس سے ادیان، اجناس اور اقوام کے اختلاف کم ہو سکتے ہیں۔ نیز قرآن اور دوسری الٰہی کتابیں اسی وحدتِ فکری کی ترجمان ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب نے اپنی ایک ملت (جماعتی تنظیم) بنائی اور اس ملت کو اپنے لیے شریعت، یعنی ''قانون'' بنانے کی ضرورت پڑی۔ ایک ملت نے ایک وضع اختیار کی اور دوسری ملت

نے دوسری وضع۔ ایک کی شریعت کچھ اَور تھی اور دوسری کی کچھ اَور۔ [48] اب اگر ہم ان تمام اَدیان کی وحدت مان بھی لیں تو شریعتوں کے اِن اختلافات کا کیا جواب ہے؟

بات یہ ہے کہ قانون نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک خاص قوم کے خاص حالات اور خاص زمانے کے تقاضوں کا۔ زمانہ بدلتا ہے، اس کے ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے ہیں اور حالات میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ (ارشادِ خداوندی ہے:)

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿٢٩﴾ [49] (ہر روز وہ ایک کام میں ہے)۔

یعنی ہر نیا زمانہ ''شانِ اللہ'' ہے۔ اللہ کے ''شؤون'' کی نہ کوئی حد ہے اور نہ حساب۔ نئے زمانے کو نہ ماننا اور اس کے تقاضوں کا انکار کرنا ''شؤون اللہ'' کا انکار ہے۔

قرآن حکیم کی حکمت ابدی ہے

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کی تعلیم کا صحیح تجزیہ کیا۔ حکمت جو دائمی، سرمدی اور عالَم گیر ہے، اس کو قانون سے نمایاں کر دکھایا۔ چوں کہ قانون کا قوم کے مزاج اور حالات سے متأثر ہونا ضروری ہوتا ہے، اس لیے قانون ابدی اور سرمدی نہیں ہوسکتا۔ ابدیت صرف حکمت کو ہے۔ قانون کی حیثیت ایک نمونے اور مثال کی ہوتی ہے۔ الغرض! قرآن نے جو حکمت پیش کی ہے، وہ ابدی ہے۔

اب اگر قرآن کو یوں سمجھا جائے تو آدمی ہر عامی و فاضل (عام و خاص) کو قرآن کا مفہوم ذہن نشین کراسکتا ہے۔ اپنے مذہب والے کو بھی سمجھا سکتا ہے اور غیر مذہب والے اور لا مذہب کو بھی قائل کرسکتا ہے۔ میرے خیال میں ہر وہ شخص جو سوچتا ہے اور سوچ سمجھ کر دنیا میں چلنے کا خیال رکھتا ہے، وہ کسی مذہب کا ہو، یا اس کا کوئی مذہب نہ ہو، وہ قرآن کے اس مفہوم کو ضرور مانے گا۔

مقصد یہ ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ لازماً زندگی کے مظاہر بدلتے جاتے ہیں، لیکن مظاہر کی تبدیلی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اب زندگی کی اصلیت میں بھی کوئی فرق آ گیا ہے۔

''حکمت'' اور ''قانون'' میں فرق

بے شک قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانے میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا، اب ضروری نہیں کہ وہ دوسرے زمانے میں پھر بعینہٖ اسی صورت میں ظاہر ہو۔

صحابہؓ کے زمانے میں تیر و کمان، تلوار اور ڈھال سے جہاد ہوتا تھا۔ مجاہدین اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہوکر جہاد کو نکلتے تھے۔ اب قرآنی تعلیم نے اگر کبھی اپنے پیروکاروں کو جہاد پر آمادہ کیا تو ضروری نہیں کہ پھر تلوار، ڈھال، اونٹ اور گھوڑوں کی نوبت آئے۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ کے دور میں مساوات اور انصاف کا اُصول ایک خاص نہج پر نافذ ہوا۔ اب زندگی بہت بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اس لیے مساوات اور انصاف کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوگا۔ یعنی مقاصد تو وہی رہیں گے، لیکن ان کی عملی شکل حالات و اسباب کی تبدیلی کی وَجہ سے پہلی سی نہ ہوگی۔ اصل مقصد کا تعلق ''حکمت'' سے ہے اور عملی شکل کا نام ''قانون'' ہے۔

قرآن حکیم کا اصل مقصد: انسانیتِ عامہ کا تزکیہ

مختصراً قرآن کا مقصودِ اصلی انسانیتِ عامہ کا تزکیہ اور اس کا ارتقا ہے۔ وہ تمام انسانیت کو اس بنیادی اُصول و مقصد کی طرف لوٹانے آیا تھا۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ سب انسان ایک ہیں۔ رنگ و نسل اور قوم کا فرق حقیقی نہیں۔ دھڑے بندیاں اور گروہ بنانے کی طبقہ وارانہ ذہنیت غلط ہے۔ قرآن نے زندگی کے یہی عالم گیر اور ناقابلِ تغیر اُصول پیش کیے ہیں۔ ان کو اگر غور سے سمجھ لیا جائے تو ذہن وحدتِ انسانیت کی صحیح روح کو پالیتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اپنے ابتدائی عہد میں قیصریت اور کسرویت کو — جو اس وقت **استحصال بالجبر** (Expliotation) کی بدترین مظہر تھیں — ختم کرنے کی دعوت دی۔ اس کی جگہ ایسا نظام قائم کیا، جس میں انسانی مساوات، ہر ایک سے انصاف اور اخوت' بنیادی اُصول تھے۔

قرآن کا نصب العین؛ ایمان باللہ

قرآن کی تمام تعلیمات کا دار و مدار ہمارے خیال میں انھی اعمالِ صالحہ پر ہے۔ چوں کہ جب تک اعلیٰ اور بلند نصب العین انسان کے سامنے متعین نہ ہو، اس سے اعمالِ صالحہ کا ظہور ممکن نہیں ہوتا، اس لیے قرآن نے باربار ''ایمان باللہ'' پر زور دیا ہے۔ یعنی ایمان باللہ نصب العین ہے اور مساوات، انصاف اور اخوت کے ذریعے انسانیتِ عامہ کی فلاح و بہبود اس نصب العین کو عمل میں لانے کا ذریعہ اور طریق ہے۔

خدا پرستی کی اہمیت

اگر نظرِ بصیرت سے دیکھا جائے تو ایمان باللہ کا عقیدہ انسانیت کے لیے ایک بلند اور اعلیٰ نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دنیا میں اس سے ارفع تصور ممکن نہیں۔ اللہ کے تصور میں وحدتِ انسانیت اور وحدتِ کائنات سب آجاتے ہیں اور ذہن کے سامنے لامحدود آفاق اور بے کنار وسعتیں واشگاف ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا صحیح تصور سب پنہائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ فکرِ انسانی کی کوئی بلندی اور وسعت نہیں جو اس تصور سے بلند تر اور وسیع تر سوچی جا سکے۔ ایمان باللہ کی سب سے اونچی منزل یہ ہے کہ آدمی یہ مانے کہ اس زمین اور آسمان میں اگر کوئی وجودِ حقیقی ہے تو اسی کا ہے۔ جو کچھ ہے، سب اسی کا فیضان ہے اور جو کچھ ہوتا ہے، اس کا اصلی سبب وہی ہے۔

انسان دوستی کی اہمیت

ایمان باللہ یا خدا پرستی کی ایک منزل انسان دوستی ہے۔ اگر آدمی یہ مانتا ہے کہ سارے انسان اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور اس کو خالق حقیقی سے محبت ہے تو لازمی ہے کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت ہو۔ اگر اسے مخلوق سے محبت نہیں تو یہ سمجھ لو کہ وہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا نہیں۔ خدا پرستی کی پہچان اس دنیا میں تو یہی ہے کہ خدا پرست انسان کو خدا کے سارے بندوں سے محبت ہو۔ وہ خدا کی خوشنودی، اس کی مخلوقات کی خدمت اور اس کی بہبودی میں ڈھونڈے۔

انسان دوستی؛ سیرتِ رسولؐ کی روشنی میں

انسان دوستی، خدا پرستی یا ایمان باللہ کا یہی جذبہ تھا، جس نے رسول اکرم ﷺ کو گھر کا آرام قربان کرکے مکے والوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے بے تاب کر دیا تھا۔ گو آپؐ کو ہر نعمت میسر اور ہر قسم کا اطمینان حاصل تھا، لیکن دوسروں کا دُکھ اور ان کی گمراہی تھی کہ آپؐ کو بے چین کیے دیتی تھی۔ چناں چہ وہ مکے میں اپنا پیغام سناتے پھرتے تھے۔ طائف والوں کو جا کر حق کی دعوت دیتے تھے۔ سختیاں ہوتیں تو صبر کرتے۔ جو سختیاں کرتے، ان کے لیے بد دعا نہیں، بلکہ دعا کرتے تھے۔

درحقیقت تورات، انجیل اور قرآن سب اسی انسان دوستی کے مسلک کے ترجمان ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیم اور عمل، خدا پرستی کی اسی مادی شکل یعنی انسان دوستی کا نمونہ تھا۔ بعد والوں نے ان کی انسان دوستی کو اپنے اپنے گروہوں کی دوستی تک محدود کرلیا۔ خدا پرستی — جس سے مقصود یہ تھا کہ انسان کے دل میں مجموعی انسانیت کے لیے وسعت پیدا ہو جائے — اتنی مسخ ہوئی کہ مدعی کے دل میں اپنی ذات کے سوا کسی اَور کی سمائی (گنجائش) مشکل ہوگئی۔

انسان دوستی؛ صوفیائے کرامؒ کی نظر میں

ہمارے صوفیائے کرامؒ نے تو خدا پرستی کی اس عملی شکل یعنی ''انسان دوستی'' کو اصل دین قرار دیا تھا۔ ان کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ اور جماعت سے محبت ہے اور وہ دوسروں کو — جو اُس کے ہم عقیدہ نہیں — نفرت سے دیکھتا ہے، وہ سچا موحِّد اور خدا پرست نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی تعلیمات میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ تمام انسانوں کو ''عَیَالُ اللّٰہِ'' (اللہ کا کنبہ) سمجھو!۔ (ارشادِ نبویؐ ہے:

''الخلق عیال اللّٰہ، فأحبّ الخلق إلٰی اللّٰہ من أحسن إلٰی عیالہٖ.'' (50)

(مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ وہ انسان

محبوب ہے، جو اُس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔)

ان کا خود اپنا عمل بھی اس کا شاہد تھا، لیکن اس سے یہ خیال نہ ہو کہ انھوں نے صواب و ناصواب (درست اور نادرست) اور ثواب و گناہ کی تمیز اٹھا دی تھی۔ بے شک وہ نیکوکار کو اچھا سمجھتے تھے، لیکن غلط کار کا انھیں اس نیکوکار سے زیادہ خیال رہتا تھا۔ جس طرح ماں اپنے نافرمان بچے کے لیے زیادہ کُڑھتی ہے اور اس کا اُسے دوسروں سے زیادہ خیال ہوتا ہے، اسی طرح غلط کار کو سیدھے راستے پر لگانے کے لیے یہ خدا پرست بزرگ بے قرار رہتے تھے۔

صوفیائے کرامؒ کی کتابوں اور ارشادات میں بار بار اسی انسان دوستی پر زور دیا گیا ہے۔ اور طرح طرح کی مثالوں سے یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُس وقت تک آدمی خدا پرست نہیں ہوسکتا، جب تک سارے انسانوں سے اسے محبت نہ ہو۔

انسان دوستی پر حضرت ابراہیمؑ کی ایک حکایت

شیخ سعدیؒ نے (اپنی کتاب) ''بوستان'' میں اس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک حکایت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب تک کوئی مہمان دستر خوان پر موجود نہ ہوتا، کھانا نہ کھاتے۔ ایک دفعہ کوئی مہمان نہ آیا۔ دو پہر کو آپؑ گھر سے نکل کر مہمان کا انتظار کر رہے تھے۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ لُو چل رہی تھی اور تپش کے مارے ہر ذی رُوح کا بُرا حال تھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ دُور سے ایک بوڑھا گرتا پڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کا جسم گرد و غبار سے اَٹا پڑا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑے شوق سے مہمان کا استقبال کیا اور خوشی خوشی اسے مکان کے اندر لے گئے۔ دستر خوان چُنا گیا اور آپؑ نے بسم اللہ کہہ کر لقمہ توڑا۔ مہمان نے اللہ کا نام لیے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

تعجب ہوا۔ پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں تو اللہ کو مانتا نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا اتنا سننا تھا کہ غصے سے بے تاب ہو گئے اور اسے اسی حال میں بغیر کھائے پیے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا کہ میں نے تو اپنے اِس بندے کو سو 100 سال تک کھانا پینا دیا، اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا، لیکن تم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ میرے بندے کو ایک وقت کا کھانا ہی کھلا سکتے۔'' (51)

انسان دوستی کی اہمیت پر حدیثِ نبویؐ

اسی مضمون کی رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے سے پوچھے گا کہ:

''اے آدم کے بیٹے! میں بیمار تھا۔ تُو نے میری عیادت نہیں کی۔''

وہ کہے گا:

''اے میرے ربّ! میں آپ کی عیادت کیسے کرتا؟ حال آں کہ آپ ربّ العالمین ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کہے گا:

''کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا۔ تُو نے اُس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تُو اُس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔''

اللہ تعالیٰ کہے گا:

''اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا۔ تُو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔''

وہ کہے گا:

''اے میرے ربّ! میں کیسے آپ کو کھانا کھلاتا؟ حال آں کہ آپ ربّ

www.fahmia.org

العالمین ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کہے گا:

''کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کے لیے کچھ مانگا تھا، لیکن تُو نے اُسے کھانا نہیں کھلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ تُو اُسے اگر کھانا کھلاتا تو مجھے وہاں پالیتا۔''

اللہ تعالیٰ کہے گا:

''اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی پینے کے لیے مانگا تھا۔ تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔''

بندہ کہے گا:

''اے میرے ربّ! کیسے میں آپ کو پانی پلاتا؟ حال آں کہ آپ ربّ العالمین ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کہے گا:

''میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا۔ تُو نے اُسے پانی نہیں پلایا۔ اگر تُو اُس کو پانی پلاتا تو مجھے وہاں پالیتا۔''(52)

ہر سوال کے جواب میں بندہ کہے گا کہ اے میرے ربّ! تجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت؟ تُو تو ان سب چیزوں سے بے نیاز ہے۔ اس وقت خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا ایک بندہ بھوکا تھا، تُو نے اسے کھانا نہ کھلایا۔ وہ پیاسا تھا، تُو نے اسے پانی نہ پلایا۔ وہ ننگا تھا، تُو نے اسے لباس نہ پہنایا۔

انسان دوستی اور نظریۂ جہاد کی حقیقت

کہنا یہ ہے کہ صحیح خدا پرستی آگے چل کر لازماً انسان دوستی کا موجب ہوتی ہے۔ قرآن مجید اسی خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ میں نے قرآن مجید سے یہی سیکھا ہے کہ سب انسانوں کو ایک سمجھو۔ جس بات کو تم جانتے ہو کہ اس میں سب کا بھلا ہے، وہ بات ہر ایک

سے کہو! سمجھاؤ۔ بار بار اس کے ذہن نشین کراؤ۔ اگر یہ بات اس کے دل میں راہ نہیں پیدا کرتی اور بیچ میں کچھ رکاوٹیں ہیں تو نرمی سے ان رکاوٹوں کو دُور کرو۔ اگر نرمی سے کام نہیں چلتا تو تم حکمت کے ساتھ طاقت استعمال کرو۔ یہ طاقت ان آدمیوں کے خلاف نہ ہوگی، جو بُرائی کے مرتکب ہیں، نہ اس کا محرک ان سے نفرت کا جذبہ ہوگا، بلکہ دراصل ان رُکاوٹوں کے خلاف ہوگی جو انسانوں کو انسانیت سے دُور رکھنے کا سبب ہیں۔ کلمۂ حق یہی ہے اور حق کے لیے جہاد کرنے کے یہی معنی ہیں۔ جہاد بے شک بدوں (بُرے لوگوں) کے خلاف ہوتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے مقصود بدی کا استیصال (خاتمہ) ہے اور بدی سے جنگ کرنا انسانوں کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

☆

مقالہ 3

وحدتِ انسانیت

www.rahimia.org

ارشادِ خداوندی

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۠ (53)

(اور ہم نے آدم کی تمام اولاد کو معزز اور مکرم بنایا ہے۔ اور انھیں زمین کی خشکی پر اور دریا میں سوار کیا۔ اور ہم نے انھیں صاف ستھری چیزوں سے رزق دیا۔ اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انھیں فضیلت عطا کی۔)

ارشادِ نبویؐ

”یا ایّھا النّاس! إنّ ربّکم واحد، و إنّ أباکم واحد، ألا! لا فضل لعربی علٰی عجمی، و لا عجمی علٰی عربی، و لا لأحمر علٰی أسود، و لا لأسود علٰی أحمر، إلّا بالتّقویٰ.“ (54)

(اے لوگو! تمھارا ربّ ایک ہے۔ تمھارا باپ ایک ہے۔ خبردار! کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ نہ کسی عجمی کو عربی پر فضیلت ہے۔ نہ کسی سُرخ کو کالے پر اور نہ کالے کو سرخ پر فضیلت ہے، سوائے تقویٰ کے۔)

www.rahimia.org

وحدتِ انسانیت

نظریۂ زندگی کی اہمیت

زندگی کا ماحصل (خلاصہ) یہ ہے کہ آدمی ایک عقیدہ (اور نظریۂ زندگی) رکھے اور اس کو عملی دنیا میں مادی شکل دینے کے لیے مسلسل جہاد (اور جدوجہد) کرتا رہے:

☆ انسان اپنے آپ سے جہاد کرے۔

☆ خاندان سے جہاد کرے۔

☆ اپنے سماج سے جہاد کرے۔

☆ رسم ورواج کے خلاف جہاد کرے۔

☆ قوم اُس کے عقیدے کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس سے جہاد کرے۔

☆ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ساری دنیا اس کے عقیدے کی رُو سے غلط کار ہے تو وہ اس کے خلاف بھی جہاد کرے۔

اگر عقیدہ محض عقیدہ رہتا ہے اور خارج (باہر سوسائٹی) میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو یوں سمجھنا چاہیے کہ عقیدہ ناپختہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عقیدہ رکھے بغیر جہاد کرتا ہے تو اس کا یہ جہاد بھی ناقص ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں نظریے اور جدوجہد کا باہمی تعلق

میں نے زندگی میں عقیدہ اور عقیدے کو عملی شکل دینے کے لیے جہاد کرنے کا یہ سبق قرآن مجید سے سیکھا۔ اس سبق کا عملی نمونہ مجھے رسولِ مقبول ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی

زندگیوں میں بہ درجۂ اتم نظر آیا۔

ولی اللٰہی رہنماؤں نے انسانیت کا نظریہ سکھایا

میں مسلمان ہوا تو شاہ اسماعیل شہیدؒ سے مجھے خاص طور پر موانست (اُنس و محبت) ہوگئی اور ان کی مجاہدانہ زندگی میرے لیے کشش کا باعث بنی۔ ان بزرگوں کے عمل نے میرے جذبۂ جہاد کو گرمایا۔ ان کی تعلیمات نے میرے عقیدے کو وسعت اور گہرائی بخشی۔ وہ جذبہ جو بچپن میں صرف پنجاب اور سکھوں تک محدود تھا، شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) اور ان کی جماعت کی برکت سے اتنا وسیع ہوا کہ وہ ساری دنیا پر محیط ہو گیا۔ ان مرشدوں ہی نے مجھے بتایا کہ قرآن صرف مسلمانوں کی کتاب نہیں، بلکہ کل انسانیت کا صحیفہ ہے۔ مجھے اس کا مطالعہ کرتے پچاس ساٹھ برس ہونے کو ہیں، لیکن مجھے ان بزرگوں کی بات پر کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اس کو سو فی صد درست پایا۔

قرآن مجید بہ حیثیت ترجمان فکرِ انسانیت

قرآن مجید کل انسانیت کی رہنمائی کے بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ یہ بنیادی فکر نہ کبھی بدلا ہے اور نہ آئندہ کبھی بدلے گا۔ سارے ادیان، مذاہب اور فلسفوں کا اصل الاصول (بنیادی اصول) یہی فکر ہے۔ اس بنیادی فکر کو ''فطرتُ اللّٰہ'' (اللہ کی مقرر کردہ فطرت) کہہ لیجیے۔ اسے ''دین'' کا نام دیجیے، یا اسے ضمیرِ انسانی سے تعبیر کیجیے۔ اسی ضمیرِ انسانی کی ترجمانی انبیاؑ، صلحا اور حکما کرتے آئے ہیں۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلی فکر میں باہر سے کدورتیں شامل ہوتی گئیں اور بار بار نئے ''نذیر'' (انسانی فطرت کے مخالف لوگوں کو ڈرانے والے) اور ''بشیر'' (دین کو ماننے والوں کے لیے خوش خبری دینے والے) کی ضرورت پڑی۔

قرآن مجید بھی اسی بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔ اور یہ بنیادی فکر عالَم گیر، ازلی، ابدی اور لازوال ہے۔ قرآن میں بے شک اس فکر کا جامہ عربی ہے اور ''اُمُّ الْقُرىٰ'' اور ''مَنْ حَوْلَهَا'' (مکہ مکرمہ اور اِردگرد کے علاقے) کو سمجھانے کے لیے (عربی) زبان اور پیرایۂ

بیان میں ماحول کے لوازم کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن ''مشاہدۂ حق'' کے بیان کے لیے ہمیشہ ''ساغر و مینا'' کی ضرورت پڑتی رہی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے اور ان کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ الفاظ و تراکیب کی سرحد سے بہت پَرے معانی کا مقصودِ اصلی کیا ہے۔

تمام آسمانی کتابیں؛ ضمیرِ انسانی کی ترجمان

قرآن مجید اسی ضمیرِ انسانی کا ترجمان ہے۔ گیتا نے بھی اپنے زمانے میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔ تورات اور انجیل بھی اسی ضمیرِ انسانی کے شارح رہے ہیں۔ دیگر حکما نے بھی کہیں کم، کہیں زیادہ اسی راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ تورات اور انجیل حق ہیں، لیکن (تحریف کر کے) جو غلط معانی ان کے الفاظ کو پہنائے گئے ہیں، وہ باطل ہیں۔ اسی طرح قرآن حق ہے، لیکن جس طرح مسلمان اس کو عام طور پر مانتے ہیں اور جو تفسیر وہ کرتے ہیں، وہ حق نہیں۔ اگر تورات اور انجیل کو غلط ماننے والے کافر قرار دیے جا سکتے ہیں، تو قرآن کو غلط مفہوم میں ماننے والے کیسے سچے مؤمن کہے جائیں گے۔

تعلیماتِ شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کے آئینے میں ہم نے قرآن کو اس کی اصلی شکل میں دیکھا اور ہمیں معلوم ہوا کہ خالص اور بے میل انسانیت ہی قرآن کا صحیح اور مکمل نصب العین ہے۔ جو تعلیم عام انسانیت کی ترقی کے لیے معاون ہے، وہ حق ہے۔ اور جو تعلیم انسانیت کے ارتقا میں حارج (رُکاوٹ) ہو، وہ حق نہیں ہوسکتی۔ ان معنوں میں قرآن مجید میرا عقیدہ بنا اور قرآن کو عملی شکل دینے کے لیے جدوجہد کرنا زندگی کا مقصد ٹھہرا۔ قرآن کے اصولوں پر اس دنیا میں خالص انسانیت کا قیام ہمارا عقیدہ ہے۔ ہمارے نزدیک خالص اور بے میل انسانیت ہی فطرت اللہ کی محافظ ہے۔ سچا دین اگر ہے تو یہی ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اصل نصب العین

اسلام کی تعلیمات کا لُبِّ لُباب (اصلی مغز اور خلاصہ) قرآن مجید کی آیت:

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ

كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (55)

(وہ ذات جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ غالب کرے وہ اس دین حق کو تمام ادیان پر، اگرچہ مشرکین اس کو بُرا ہی سمجھیں۔)

قرآن کا مقصودِ اصلی سب دینوں سے اعلیٰ دین یعنی سب فکروں سے بلند تر فکر یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ — جو زیادہ سے زیادہ جامع ہو — پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ہے۔ یہ دین دوسرے ادیان کو مٹانے نہیں آیا۔ یہ سب ادیان کی بنیادی صداقتوں کو تسلیم کرتا ہے اور سب قوموں کے وجود کو مانتا ہے، لیکن اس کا کہنا یہ ہے کہ تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک قوم ایک مذہب اختیار کرتی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا ہے، وہ اسے اپنے رنگ میں رنگتی جاتی ہے۔ اس طرح انسانی دین ''قومی دین'' بن جاتا ہے۔ اس قوم کا اصرار ہوتا ہے کہ اس کا دین ہی ساری انسانیت کا دین ہے اور صرف یہی قوم انسانیت کی حامل اور نمائندہ ہے۔

نظریۂ کفر؛ قرآن حکیم کی نظر میں

بے شک ابتدا میں ان کا یہ فکر' دینِ انسانی ہوتا ہے اور اس میں ہر رنگ اور نسل والے کو مقام مل جاتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ یہ قومی بن جاتا ہے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچتی کہ ہر فرد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں اور صرف میں ہی حق پر ہوں۔ باقی سب لوگ گمراہ اور کافر ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ دین جو ساری انسانیت کا شیرازہ بند بن کر آتا ہے، ایک وقت آتا ہے کہ وہ انتہائی انتشار اور نزاع کا باعث بن جاتا ہے۔ قرآن اسی کو ''کفر'' قرار دیتا ہے۔

قرآن نے یہ کیا کہ ان تمام قومی مذاہب کو جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سبب بن گئے تھے، مردود قرار دیا۔ اور یہ تلقین کی کہ خدا کا سچا مذہب وہ ہے، جو خدا سے زیادہ قریب ہو۔ اور خدا سے قربت کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرقوں اور قوموں سے بالا تر ہو کر ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

www.rahimia.org

قرآنی نظریۂ وحدتِ انسانیت کے عملی تقاضے

ہمارے نزدیک قرآن نے تمام اقوام، اَدیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو — جو کُل انسانیت پر منطبق ہوسکتے ہیں — یک جا کیا۔ اور ساری دنیا کو یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک بنیاد ہے جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہوسکتی ہے۔

اگر یہودیوں کی قوم میں انسانیت کا فقدان ہے تو وہ خواہ اپنے منہ سے

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ [56] (ہم خدا کے بیٹے اوراس کے محبوب) بنیں، گمراہ ہیں۔

اگر عیسائی اس سے خالی ہیں تو ان کا حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا ماننا، کسی کام نہ آئے گا۔

اگر ہندوؤں میں انسانیت کی کمی ہے تو ان کا ''پوتر'' (پاک) ہونا محض خام خیالی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں پر بھی اس حکم کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

قرآن ایک میزان ہے، جس میں سب تولے جاسکتے ہیں۔

بے روح رسومات و روایات کی حقیقت

میرے نزدیک اصل دین یہی ہے۔ باقی سب ''رُسوم'' اور روایتیں ہیں۔ قرآن کا مقصد' انسانیت کو ان ''رُسوم'' اور رِوایتوں کے بندھنوں سے آزاد کرانا ہے۔ بدقسمتی سے ہر قوم نے ان ''رُسوم'' کو اصل سمجھ لیا اور ان کے پیچھے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ قرآن کا سچا ماننے والا وہ ہے، جو اِن بے روح ''رُسوم'' کے خلاف جہاد کرے اور خلوصِ دل سے ''رُسوم شکن'' (رُسوم توڑنے والا) ہو۔ قرآن کا ماننے والا موحد ہوتا ہے اور اس کی عادت واقعی ترکِ رُسوم (بے روح رسومات کو چھوڑنا) ہے۔ جب (بے روح) ''رُسوم'' مذہب کا درجہ اختیار کرلیں اور مذہب کا یہ لباس 'مظہرِ وجود' (مذہب کے وجود کا اظہار کرنے) کے بجائے 'ننگِ وجود' (مذہب کے وجود کے لیے باعثِ شرم) ہوجائے تو اس وقت ان ''رُسوم'' کا مٹانا قرآن کے ماننے والے کا فرض ہوجاتا ہے۔

مَیں ان معنوں میں پکا موحد ہوں اور ترکِ ''رُسوم'' کا دل وجان سے حامی ہوں،

لیکن میں ترکِ رُسوم کا بھی ایک حد تک قائل ہوں۔

میرا کہنا یہ ہے کہ زندگی جب اس دنیا میں اسباب وحالات کا جامہ پہنتی ہے تو اسے ممکن اور موجود ہونے کے لیے لامحالہ رُسوم اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ ان رُسوم کے بغیر زندگی زمان و مکان کے اس دائرے میں وجود پذیر نہیں ہوسکتی، لیکن ہونا یہ چاہیے کہ ان رُسوم کو ''رُسوم'' ہی سمجھا جائے۔ لباس' لباس ہی رہے، اسے صاحبِ لباس نہ مان لیا جائے۔ لیکن جب لباس پر ہی زور دیا جائے اور رُسوم ہی اصل مذہب کا درجہ اختیار کرلیں اور اکثریت ''قبلہ'' کو ''قبلہ نما'' سمجھنے سے عاری ہو جائے تو پھر یہ رُسوم بت بن جاتی ہیں۔ جس طرح کبھی (مشرکینِ مکہ کے بُتوں) ''**لات**'' و ''**هُبــل**'' کو ریزہ ریزہ کردیا گیا تھا، اِنھیں (بے روح رسومات کو) بھی توڑ پھوڑ دینا پڑتا ہے۔ قرآن اسی توحید کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے خلاف تمام شعائر کو کفر سمجھتا ہے۔

یہ شعائرِ کفر ہمیشہ پتھر اور سونے چاندی کے بت نہیں ہوتے۔ ہماری رُسوم، ہمارے اَخلاقی معیار، ہمارے آداب و اَطوار اور ہمارے نام نہاد مذاہب بھی ایک وقت میں بت بن جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے کبھی پتھر کے بت غیراللہ بن گئے تھے، اسی طرح جب رُسوم کے یہ بت غیراللہ بن جائیں تو ان کے خلاف بھی قرآن جہاد کی تلقین کرتا ہے۔

اصل مذہب اور رسوم کا بنیادی فرق

اصل مذہب اور رسوم کے نازک فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ اقوام میں کسی تحریک کو محفوظ کرنے کا یہ اساس ہے کہ جو چیز متوسط طبقے میں آجائے، وہ چیز فنا نہیں ہوسکتی۔ ادنیٰ طبقہ اُس کی تقلید کرتا ہے اور اعلیٰ طبقہ جو کچھ کہتا ہے، اُس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے، جو متوسط طبقے میں ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''**حُـجَّةُ اللّٰهِ البالِغه**'' میں اسے ''رسوم'' سے تعبیر کیا ہے۔ ایک حقیقت اور حکمت کو جب تک رسم نہ بنایا جائے، وہ انسانیت کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔ امام ولی اللہ (دہلویؒ) تمام شرائعِ الٰہیہ کے اندر ''رسوم'' کو مرکز مانتے ہیں۔ [57] قرآن عظیم نے اس کو ''معروف'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

بے شک رسوم قابلِ احترام ہیں، لیکن اُس وقت تک جب تک وہ حقیقت و حکمت سے بہرہ ور رہتی ہیں۔ لیکن جب رسوم کھوکھلی ہوجائیں اور ان کے اندر صحیح روح باقی نہ رہے تو پھر ان کا وجود اور عدمِ وجود برابر ہوتا ہے۔ اُن کا بدلنا یا اُن کی تجدید لازمی ہوجاتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ رد و بدل اور تجدید کا یہ عمل اس لیے ضروری ہے کہ انسان ان رُسوم میں پڑ کر یہ بھول نہ جائے کہ سارے انسان ایک ہیں اور قوموں فرقوں اور طبقوں کی تقسیم حقیقی نہیں۔ در اصل سب کی اصل ایک ہے۔ ساری انسانیت ایک ہے۔ کل کائنات ایک ہے۔ اور یہ وجود ایک ہی ذات کا پَرتَو یا فیضان ہے۔ ہر ذرّہ اسی وجود کا ظہور ہے۔ اور ہر انسان میں اسی نور کی جلوہ گری ہے۔

افراد و اقوام کا تشخص اور وحدتِ انسانیت

قوموں کی زندگی میں ایک ایسا دَور آتا ہے جب **تعیُّنات (تشخُّصات)**، قوانین اور نام نہاد مذاہب پردے بن کر خدا اور بندے کے درمیان حائل ہوجاتے ہیں۔ اس وقت فطرتِ انسانی ان کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور نئے دور کا ظہور ہوتا ہے۔ جس میں ہر فرد کا رشتہ پھر نئے سِرے سے ''روحِ کُل'' سے جُڑ جاتا ہے۔ یہ عمل تاریخ میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ جس دن انسانیت اپنے اس تقاضائے زندگی سے محروم ہوگئی، وہ دن انسانیت کی موت کا دن ہوگا۔ یہ روح ہے قرآنی تعلیمات کی۔

وحدتِ کائنات کا تصور اور کثرتِ کائنات کا تجزیہ

میں انسانیت تو کیا، کُل کائنات کی وحدت کا قائل ہوں، لیکن جس طرح کائنات کی کثرت صاحبِ نظر کو پریشان نہیں کرتی اور وہ جانتا ہے کہ ان سب مختلف شکلوں میں ایک ہی جلوہ عکس ریز ہے، اسی طرح مجھے انسانوں کا قوموں، گروہوں اور افراد میں بٹا ہونا' وحدت انسانیت کے منافی نظر نہیں آتا۔

ہر فرد اپنی جگہ ایک مستقل اکائی ہے۔ جماعت بھی ایک مستقل اکائی ہے، جو افراد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ہر ایک قوم اپنی جگہ مستقل وجود رکھتی ہے۔ انسانیت سب قوموں کو

اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ فرد کا صالح ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ جماعت کا اچھا جزو ہو۔ اچھی جماعت وہ ہے جو قوم سے تضاد نہیں، بلکہ مطابقت رکھتی ہو۔ اچھی قوم اسے کہیں گے جو کُل انسانیت کے جزوِ صالح کا حکم رکھتی ہو۔ انفرادیت ان معنوں میں — کہ ہر فرد، ہر جماعت اور ہر قوم ایک دوسرے سے برسرِ نزاع ہو — غلط اور مردود ہے۔

حاصلِ مطلب یہ ہے کہ میں وحدتِ انسانیت کو مانتا ہوں اور قرآن مجید کو اسی وحدت کا شارح سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک قرآنی تعلیمات کا یہی مقصود ہے کہ اس وحدت کا قیام عمل میں آئے اور لوگ عقیدتاً، علماً اور عملاً (نظریۂ زندگی، علمی فکر اور عملی سیرت و کردار کے حوالے سے) موحد بن جائیں۔

☆

مقالہ 4

نظریۂ تمدّن

(قرآنی تعلیمات کی روشنی میں)

www.rahimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

”و الإنسان من بینها مدنی الطّبع، لا یتعیّش إلاّ بتعاون من بنی نوعہٖ. ... و من حقّہٖ: أن یلهم تدبیر المُدن مع تدبیر المنازل، و آداب المعاش .... و ذٰلک لأنّ خیالہٗ کان صنّاعاً همّاماً ففوّض لہٗ علوم تدبیر المنازل و تدبیر المُدن إلیٰ الرّسم، و تقلید المؤیّدین بنور الملکی فیما یوحٰی إلیهم، و إلیٰ تجربة و رصد تدبیر غیبی و رویة بالاستقراء و القیاس و البُرهان.“ (58)

(تمام مخلوقات میں انسان طبعی طور پر تمدن پسند ہے۔ وہ دیگر انسانوں کے تعاون کے بغیر زندگی بسر نہیں کرتا۔ ...اس لیے یہ ضروری تھا کہ اُسے معاشیات کے اصول، گھریلو زندگی کا نظم و نسق اور مملکت کا نظام قائم کرنے کی تدابیر الہام کی جائیں۔ ...اس کی وَجہ یہ ہے کہ انسان کا خیال بہت کاریگر اور بلند ارادوں اور عزائم پیدا کرتا ہے۔ اس لیے گھروں کا نظم و نسق قائم کرنے اور شہروں کا قومی نظام بنانے کی تدابیر سے متعلق علوم اُس کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ گرد و پیش کے ماحول اور رسومات سے، یا انبیا علیہم السلام کی تقلید سے سیکھتا ہے، یا اپنے غور و فکر، عقلی قیاس و بُرہان، غیبی کشف اور تجربات سے علوم سیکھ کر اپنا تمدن خود تشکیل دیتا ہے۔)

www.rahimia.org

نظریۂ تمدّن

تشکیلِ تمدن اور انسانی فطرت

ہمارے نزدیک تمدن انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس کی سوتیں (چشمے) خود انسان کے اندر سے پھوٹتی ہیں۔ تمدن کی تشکیل کے لیے انسان کسی ماہر کی مدد کا محتاج نہیں۔ ایک جزیرے میں اگر ایک مرد اور عورت اکیلے چھوڑ دیے جائیں تو وہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے خود تمدن کی عمارت کھڑی کر لیں گے۔

زوالِ تمدن کا حقیقی سبب

یہ تمدن اسی وقت تک اچھا رہتا ہے، جب تک یہ انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی ضروریات پوری کرتا ہے، لیکن جب کسی قوم میں انسانوں کا ایک مخصوص طبقہ تو تمدنی لحاظ سے بہت آگے بڑھ جائے اور دوسرے لوگ جو تعداد میں بہت زیادہ ہوں، بہت پیچھے رہ جائیں تو پھر اس تمدن کو گھن لگ جاتا ہے۔ قدرت یا زمانے کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اس تمدن کو جو فرسودہ ہوگیا ہے، برباد کر دیا جائے۔

قوم کے ایک محدود طبقے کی اس غیر فطری ترقی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لاکھوں اور کروڑوں انسان تو معمولی معاش کی ضروریات کو ترستے ہیں اور چند ایک کے پاس بہت دولت جمع ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں قوم کو روگ لگ جاتا ہے۔ افراد کی صلاحیتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ عیش پرستی عام طور پر پھیلنے لگتی ہے۔ عمومی مفاد کا کسی کو خیال نہیں رہتا۔ نفسی نفسی (اپنی اپنی ذات) کا معاملہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا

پیٹ بھرے۔ اپنی خواہشات کو پورا کرے۔ خواہ ہمسایہ فاقوں کے مارے مرتا جائے۔ جب کوئی قوم ادبار (زوال) کے اس نرغے میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر انقلاب کا آنا ایک حتمی امر ہوتا ہے۔

نئے تمدن کی تشکیل کا راستہ؛ تبدیلیٔ نظام

اگر قوم کے سارے طبقے اس روگ (عیب، نقص) کی وَجہ سے مفلوج نہ ہو گئے ہوں اور قوم کے جسمِ عمومی میں زندگی کا گرم خون موجود ہو تو زوال آمادہ طبقے کی جگہ لینے کے لیے قوم کا دوسرا طبقہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ پہلوں کو زبردستی یا صلح و صفائی سے بساطِ سیاست سے الگ کرتا ہے اور خود قوم کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ یہ طبقہ اپنا نیا تمدن بناتا ہے اور پہلا تمدن پھٹے ہوئے لباس کی طرح نا قابلِ استعمال قرار پاتا ہے۔

لیکن اگر زوال کے جراثیم قوم کے سارے جسم میں اپنا کام کر چکے ہوں اور کسی طبقے میں بھی اتنی جان نہ ہو کہ وہ قوم کی کشتی کا کھیون ہار (ملاّح) ہو سکے اور زمانے کے ریلے کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھے تو باہر سے کوئی دوسری قوم چڑھ آتی ہے۔ وہ بے جان تمدن کو — جو اپنی زندگی کے دن گزار چکا ہوتا ہے — ٹھکانے لگاتی ہے۔ حکمرانوں کو تہ تیغ کرتی ہے۔ ملک کے انتظام کے نقشے بدل ڈالتی ہے۔ اب نئے طبقے پیدا ہوتے ہیں اور فروغ پاتے ہیں۔ نیا تمدن بنتا ہے۔ اجتماع، معیشت اور سیاست کے نئے اُصول وضع ہوتے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ قوموں کے عروج وزوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ’’جب کسی قوم کے کمانے والے طبقوں کی کمائی پر نہ کمانے والے طبقے قبضہ کر لیں، یا ان کی کمائی کا بڑا حصہ خود ہتھیا لیں، تو یہ حالت‘ انقلاب کی پیش خیمہ ہوتی ہے۔‘‘ (59)

ایک گروہ تو انقلاب کا علم بردار بن کر آگے بڑھتا ہے۔ دوسرا گروہ جو تعداد میں بہت زیادہ ہوتا ہے، انقلاب کا ہمدرد بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان ہمدردوں کے

اَخلاق و اَطوار کا اثر انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے، لیکن اس کا تعلق صرف ظاہری شکل سے ہوتا ہے۔ اصل انقلاب کی روح کا ترجمان پہلا ہی طبقہ ہوتا ہے۔

تبدیلیٔ نظام کا طریقۂ کار اسوۂ حسنہ کی روشنی میں

رسولِ اکرم ﷺ کے صحابہؓ (سابقین اوّلین) اسلام کی انقلابی روح کے ترجمانِ حقیقی تھے۔ عربوں کی تقریباً ساری کی ساری آبادی اس تحریک کی ہمدرد بن کر شریک ہوئی اور انھوں نے اسلام کی ظاہری شکل وصورت کو اپنے رنگ میں رنگا بھی، لیکن جہاں تک تعلیماتِ اسلام کا جوہرِ اصلی ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ اور آپؐ کے قریب ترین صحابہؓ کا عمل ہے۔ کیوں کہ حقیقت میں عالم گیر انقلاب کی رُوحِ رواں یہی پاک ہستیاں تھیں۔

انقلاب کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ انقلابی جماعت کو پہلے اپنے فکر کی تہذیب اور اس کا استحکام کرنا پڑتا ہے، تاکہ انقلابی فکر اُن کے ذہن میں راسخ ہو جائے اور انقلابی عمل کے لیے ان کی تربیت بھی مکمل ہو۔ رسولِ اکرمؐ نے پورے تیرہ برس تک مکہ میں اس فکر کی تبلیغ کی۔ جو اس فکر کو دل و جان سے مان گئے تھے، ان کی جماعت بندی کی۔ پھر اس جماعت کی تنظیم و تربیت میں شب و روز منہمک رہے۔ آخر میں جب آپؐ نے دیکھا کہ مکہ کی فضا ناسازگار ہے اور یہاں اس نئی جماعت کو اپنی مستقل سیاسی تشکیل میں دقتیں ہیں تو آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ کو اپنا نیا انقلابی مرکز بنایا۔

قریش کی انقلابی جماعت رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے اثر سے خود اپنوں کو — جو ان کے بھائی بند اور سگے عزیز تھے، لیکن وہ نئے انقلاب کی راہ میں حائل تھے — ختم نہ کرتی تو اسلام کبھی یہ حیثیت اختیار نہ کرتا اور نہ یہ ساری دنیا کو اپنا پیغام سنا سکتا۔

ضرورت ہے کہ آج مسلمان اپنے پیغمبر علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی اہمیت کو سمجھیں اور اپنی قوم کے ان طبقوں کو جو جونک کی طرح قوم کے خون کو پی رہے ہیں، انھیں مردود قرار دیں۔ یہ لوگ خواہ ہمارے اپنے جگر کے ٹکڑے ہوں یا ہمارے بزرگ، ان کا وجود ساری قوم کے لیے وَبال بن رہا ہے۔ ہمارے یہ رجعت پسند طبقے جس کھوکھلے تمدن کو

www.rahimia.org

تھامے ہوئے ہیں، وہ انسانیت کے لیے ایک روگ ہے۔ ہماری قوم کے نوجوان انقلابی گروہ کا فرض ہے کہ وہ ان کے تسلُّط سے قوم کے عوام کو رہائی دلائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا، ہماری قوم کی زبوں حالی ختم نہیں ہونے کی۔

یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ فرض کیجیے! ایک گھر میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ، وہ گھر ضرور تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح جس تمدن میں کمانے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ، وہ تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کو بغیر کسی معقول عذر کے اپنی روزی خود کمانی چاہیے۔ دوسروں کی محنت پر جینا، جینا نہیں، بلکہ گُلچھرّے اڑانا ہے۔ یہ زوال کا راستہ ہے۔ اسی طرح اگر کمانے والے تو بڑی محنت سے کمائیں، لیکن ایک شخص یا چند ایک اشخاص جن کے ہاتھ میں انتظام ہو، وہ ان کمانے والوں کی کمائی کا بڑا حصہ اپنے انتظام کے عوض مار لیں تو ایسا تمدن بہت دنوں نہیں جی سکتا۔ انسانیت کو اس سے کبھی فلاح نہیں ملتی۔

انسانیت کی تباہی اور زبوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ فاقے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں محتاج رکھ کر ان کو معاشی اور اَخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے۔ معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ کی فکر میں انسانوں کو کسی اَور چیز کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں، وہ سب بہم نہیں پہنچتیں۔ اس طرح انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

تمدن کی تشکیل و تہذیب میں اَخلاق و فکر کا کردار

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی اسباب و حالات سے متأثر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ انسان کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے، لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رُخ کو بھی جو اَخلاقی اور فکری شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

اَخلاق اور فکر کے بغیر کوئی تمدن پائیدار نہیں ہوتا۔ چناں چہ سرمایہ داروں پر جہاں یہ

الزام ہے کہ انھوں نے انسانیت کے بہت بڑے حصے کو محتاج رکھ کر انھیں انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا۔ ان پر دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ اس بڑے حصے میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انسانی اَخلاق و فکر کو اپنی صلاحیتوں سے بڑی ترقی بخش سکتا تھا، لیکن سرمایہ داروں نے اسے روٹی کا محتاج کر کے اس سے محروم کر دیا۔ چناں چہ ان کی وَجہ سے انسانیت کی ترقی مجموعی طور پر رُک گئی۔

ذہین طبقے کا المیہ؛ تملُّق اور شرک

جب کسی وَجہ سے قوم کا ذہین طبقہ — جو اَخلاق اور اَفکار کا مالک ہوتا ہے — اپنے فرضِ منصبی سے غفلت برتتا ہے تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صَرف ہونے لگتی ہیں۔ ان کی ذلت کا پہلا قدم تملُّق ہے، یعنی حکمران طبقے کی خوشامد کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ (مال و دولت) وصول کرنے کی کوشش۔ یہی مرض ہے، جو آگے چل کر ان کو غیرُ اللّٰہ (اللہ کے سوا دوسری قوتوں) کی عبادت (اور غلامی) کا داعی بنا دیتا ہے۔ یہی جذبہ بت پرستی سکھاتا ہے۔ اس منزل میں انسانیت کے اعلیٰ خصائل سارے تباہ ہو جاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کے برباد کرنے کے لیے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس برباد شدہ انسانیت کے کھنڈرات پر صالح انسانوں کی آبادی بستی ہے۔

معاشرے پر نظامِ نبوت کے انقلابی اور دیرپا اثرات

اس زوال آمادہ اور فرسودہ تمدن کی تباہی کے لیے انسانوں کا ایک نیا گروہ اُٹھتا ہے۔ قدرتی اسباب اس کے مؤید (معاون) ہوتے ہیں۔ اس گروہ کی قیادت ایک شخص کو ملتی ہے، جو انقلاب کا امام ہوتا ہے۔ ان ائمۂ انقلاب کا ایک اُونچا درجہ ہے، جنھیں انبیا علیہم السلام کا نام دیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے لائے ہوئے نظام میں انسانی فطرت کی زیادہ رعایت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نظام دیر تک قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیا علیہم السلام کے جس قدر قصے ہیں، وہ اسی انقلاب کا نمونہ پیش

www.rahimia.org

کرتے ہیں، جو رسول اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ رسول اللہ ﷺ انسانیت کے اس عالم گیر انقلاب کے داعی تھے۔ آپؐ کے اصحابؓ خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کو ایک درجے تک عالم گیر بنا دیتے ہیں۔ یعنی اس انقلابی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری رجعت پسند حکومتیں جمع ہو کر بھی اس انقلابی حکومت کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں۔

قرآن کا پیغامِ انقلاب

قرآن کا یہ انقلاب ختم نہیں ہوا، بلکہ یہ ہمیشہ برسرِ پیکار رہے گا۔ کیوں کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا، جس میں رجعت پسندی کی طاقتیں بالکل معدوم ہو جائیں۔

شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کی رُو سے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کے ذریعے خدا کے دین کو باقی سب دینوں پر غالب کر دیا جائے۔ اور اسلام انسانوں کو ایک ایسا نظامِ حیات دے جو سب نظاموں سے بہتر اور اعلیٰ ہو۔ آپ ﷺ کی بعثت کا یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا کہ قیصر و کسریٰ کا نظام، جو ایک حد تک ساری دنیا پر حاوی تھا، پاش پاش ہو گیا۔ اور انسانیت کو قیصریت اور کسرویت دونوں سے نجات ملی۔'' (60)

قیصر و کسریٰ کے نظام کو تباہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس کی بِنا جمہور کی لوٹ کھسوٹ (EXPLOITATION) پر تھی۔ بادشاہ، اس کے امیروں اور مذہبی طبقوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ رعیت کی خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی دولت سے عیش کریں۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''(إعلم أنّ العجم و الرّوم ... تعمّقوا فی مرافق المعيشة، و تباهوا بها ... حتّٰى قيل إنّهم كانوا يعيِّرون من كان يلبس من صناديدهم منطقةً أو تاجاً، قيمتها دون مائة ألف درهم.)

عجم اور روم کے شہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری ایک لاکھ درہم (تقریباً تین سو چھ کلوگرام چاندی کی مالیت) سے کم قیمت کا تاج یا کمر باندھنے والا پٹکا پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا۔''(61)

لوٹ کھسوٹ کی اس گرم بازاری میں عوام کی حالت حیوانوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ اور پھر اوپر کے طبقوں کو جب بغیر مشقت کے ثروت (مال دولت کی فراوانی) ملے تو ان میں ہر قسم کے اَخلاقی عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی صحتیں ٹھیک رہتی ہیں اور نہ ذہنی قویٰ (صلاحیتیں)۔ چوں کہ ان کی زندگی کا مقصد محض رِندی و ہوسنا کی (شراب پینا اور جنسی خواہشات پورا کرنا) بن جاتا ہے، اس لیے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ شاہی دربار سازشوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ چناں چہ اس طرح عوام تو بھوک سے بے جان ہو گئے اور ''اَشراف'' (معزز کہلانے والے) کو ثروت نے بے کار کر دیا۔

''**کلیلہ و دمنہ**'' (مصنفہ ہندوستانی فلسفی بیدبا) کے مترجم ایرانی حکیم ''برزویہ'' نے اس وقت ایران کی جو حالت تھی، اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ جو چیز مفید ہے، وہ موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے، وہ مُضِر ہے۔ جو چیز اچھی ہے، وہ مرجھائی ہوئی ہے اور جو بُری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے۔ علم پستی کے درجے میں ہے اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافتِ نفسی پامال ہے۔ محبت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون توڑنا ہے۔ مظلوم اپنی ذلت پر قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشے میں یہ کہہ رہی ہے کہ: میں نے نیکی کو مقفل

www.rahimia.org

(تالے میں بند) اور بدی کو رہا کر دیا ہے۔'' (اصل عربی الفاظ کے لیے حاشیہ دیکھیں!) (62)

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ان کا یہ روگ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر یہ ہوا کہ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کی آتشِ غضب بھڑکی اور نبیٔ اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے، جن کی زبان سے قیصر و کسریٰ کی عادات کی مذمت فرمائی گئی۔ ان کے ذریعے دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ایک اور نظام نافذ ہوا، جو عدل و مساوات پر مبنی تھا۔ چناں چہ اُوپر کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے یا تو سرے سے ناپید ہوگئے، یا اُن کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا۔ قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک کے عوام کو سر اُٹھانے کا موقع ملا۔ اس واقعے پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مصر، شام، افریقا اور ایران میں وہاں کے عوام جماعتی زندگی میں پیش پیش نظر آنے لگے۔

قیصریت اور کسرویت کی عادات کی مذمت، اُن کے نظام کی تخریب اور ایک صالح اور مفید نظام کا نفاذ' قرآن کی تنزیل (نازل کرنے) کا مقصد تھا۔ جو گروہ اور قوم قیصریت کو اپنا شعار بنا لے، عوام کی لوٹ کھسوٹ پر ان کی گزران ہو اور دادِ عیش دینا ان کی زندگی کا مقصد ہو، قرآن اُن کے خلاف دعوتِ جہاد دیتا ہے۔ قرآن کا یہ پیغام کسی جماعت یا قوم کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن ہر ظلم کا انکار کرتا ہے اور ہر مظلوم کے دل میں یہ ولولہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ظلم کو مٹانے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور اس کے اصرار پر اس کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔

برعظیم پاک و ہند کے نظام کی شکست

الغرض! جو کچھ ایران اور روم پر گزری تھی، کم و بیش وہی اسلامی ہند کو پیش آیا۔ سلاطین ختم ہو گئے۔ اُمرا کا وجود نہ رہا۔ اہلِ صنعت اور جمہور بے سری (قیادت سے محروم) فوج کی طرح تتر بتر ہو گئے۔ شاہ صاحبؒ کا پیغام قوم نے نہ سنا اور جنھوں نے سنا بھی وہ عام زوال کی رَو (لہر) کو روک نہ سکے۔ شاہ صاحبؒ کی جماعت نے اس رَو کو تھامنے کی

بے شک کوشش کی، لیکن ایک عام طوفان کے مقابلے میں چند مخلص افرا کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ آخرکار ہندوستان کو نئے سیلاب نے زیرِ آب کرلیا۔

نیا دور ہمارے لیے بہت سی مصیبتیں لایا۔ ہم اس ملک کے مالک تھے۔ آج ہم دوسروں کے غلام ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں سیاسی اقتدار اور معاشی ثروت کی باگ ڈور تھی۔ اس سے ہم محروم ہوگئے۔ ہمارے اَشراف' علم و فضل کے محافظ تھے۔ علم و فضل اب دوسروں کے ہاں جا چکا ہے۔ ہم آسمان پر تھے، لیکن تقدیر نے آج ہمیں گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ ہمارے لیے یہ انقلاب کوئی معمولی انقلاب نہ تھا۔

برعظیم کے نظام کی شکست کا تجزیہ

ہم شکست کھا گئے اور ہمیں اس شکست کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیے، لیکن یہ شکست ہمارے تمدن اور نظام کی شکست ہے، ہمارے فکر کی شکست نہیں۔ اس فکر نے ایک زمانے میں وہ ڈھانچہ اختیار کیا، اب وہ ڈھانچہ ٹوٹ چکا ہے۔ جہاز ڈوبنے کے بعد محض اس خیال سے کہ کبھی یہ جہاز ہمارا تھا اور اس کے بل پر ہم سمندر کے سینے پر دوڑتے پھرتے تھے، جہاز کے تختوں سے چمٹے رہنا دانش مندوں کا طریقہ نہیں۔ جہاز ڈوب گیا۔ ہم نے بس بھر کوشش کی کہ وہ نہ ڈوبے۔

ہمارے ساتھیوں نے تو اس جہاز کو بچانے کے لیے اپنی جان تک دینے میں بھی دریغ نہ کیا۔ اور آخر وقت تک اس کی خاطر سمندر کی موجوں اور آندھیوں کے جھکڑوں سے لڑتے رہے، لیکن اب جب کہ یہ جہاز سمندر کے نیچے جا چکا ہے، اس کے تَر (تیر کر اوپر) آنے کی اُمیدِ موہوم تک باقی نہیں رہی۔ اس جہاز پر آنسو بہاتے رہنا' فہم و فراست کے دیوالیے پن کے مترادف ہے۔

اپنے فکر پر نیا تمدن اور نظام بنانے کی ضرورت

عقل اور ہمت تو یہ تقاضا کرتی ہے کہ جس طرح ہم نے پہلے جہاز بنایا تھا، اب ایک دوسرا جہاز بنا کر کھڑا کرلیں۔ لیکن جب بھی ہم نیا جہاز بنائیں گے تو ظاہر ہے اس کے

بنانے میں پچھلے جہاز کے فن، مہارت اور نمونے سے بڑی مدد لی جائے گی۔

القصہ! ہمارا تمدن، ہمارا نظامِ زندگی اور ہمارا قانون جو ہم نے ابھی اس سیلاب کی نذر کیا ہے، اب بجنسہٖ (ٹھیک اُسی شکل میں) دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔ ان کی حیثیت اب ایک تاریخی واقعے کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک عرصے تک ہماری قومی اور ملّی شخصیت نے اپنے وجود کو ان مظاہر میں جلوہ گر کیا تھا۔ یہ چیزیں ہمارے باطنی وجود کے لیے علامات سی بن گئی ہیں۔ اس لیے ان کا کُلّی انکار بھی کسی طرح ممکن نہیں۔ زندگی کا سلسلہ اَٹوٹ ہے۔ جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے، زندگی بھی ہمیشہ اپنا تسلسل قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ قوم زندگی کے جن مراحل کو طے کر چکی ہوتی ہے، نیا نظام — بشرطیکہ وہ صالح ہو — ان مراحل سے آگے کی طرف بلندی کی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن ان مراحل سے کلیتاً انکار نہیں کرتا، البتہ ان کے بُرے اجزا کو ضرور الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نئے تمدن کی بنیاد؛ ماضی کی وراثت اور نئے عناصر کا اِمتزاج

لہٰذا برصغیر کے مسلمانوں کو بھی اسی چیز کی ضرورت ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ ماضی کی وراثت کا جائزہ لیں۔ کھوٹے کھرے کو پرکھیں۔ کھوٹے کو قومی وجود سے نکال کر باہر کریں۔ جو کھرا ہے، اس کو سینے سے لگائیں۔ اِردگرد جو نئے عناصر وجود میں آ چکے ہیں، انھیں اپنائیں۔ اپنے قومی مزاج میں ان کو اس طرح سموئیں کہ وہ ان کے لیے موافق بن جائیں۔ اس طرح اپنے لیے نیا تمدن، نیا نظامِ حیات اور نیا قانون وضع کریں۔ بے شک اس تمدن، نظام اور قانون کی روح وہی ہوگی، جو قرآن اور اسلام کی روح ہے۔ ہاں! لباس کا فرق ضرور ہو گا، لیکن کیا قرآن اور اسلام کی روح اتنی ہی عام نہیں، جتنی کہ خود انسانیت ہے؟ اور کیا انسانیت کو ہر زمان و مکان میں ایک ہی لباس کا پابند بنانا ممکن ہے؟

☆

www.rahimia.org

مقالہ 5

غلبۂ دین کی عصری اہمیت

(مولانا سندھیؒ کا ایک معرکہ آرا خطاب)

www.rahimia.org

مولانا سندھیؒ کا ایک معرکہ آرا خطاب

(ہندوستان کی آزادی کی ''تحریکِ ریشمی رومال'' کے حوالے سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کے حکم پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ 1915ء میں ہندوستان سے کابل تشریف لے گئے۔ آپؒ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے انتھک جدوجہد اور کوشش کی۔ اس سلسلے میں آپؒ نے جو صعوبتیں برداشت کیں، ان میں سب سے اہم آپؒ کی چوبیس سالہ جلاوطنی ہے۔ اس دوران آپؒ کو ناگفتہ بہ حالات سے گزرنا پڑا۔ آپؒ نے جدو جہدِ آزادی کے لیے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا۔ چناں چہ آپؒ استنبول (ترکی)، سوئٹزرلینڈ ہوتے ہوئے آخر میں مکۃ المکرّمہ پہنچے۔ بارہ سال تک جوارِ حرم میں قیام فرمایا اور حرمِ پاک کی تجلیات وانوارات سے فیض یاب ہوئے۔

اس دوران آپؒ نے ہندوستان کی مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر وتشکیلِ نو کے لیے جو کچھ سوچا اور سمجھا تھا، اسے لے کر 7/ مارچ 1939ء کو ہندوستان تشریف لائے۔ خالق دینا ہال کراچی میں آپؒ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقع پر حضرت سندھیؒ نے اہلِ وطن کو دین کی تعلیمات کی اساس پر غوروفکر کی دعوت دیتے ہوئے یہ معرکہ آرا خطاب فرمایا۔)

غلبۂ دین کی عصری اہمیت

حضرات!

محض وطن اور خاندان کی محبت مجھے اس عمر میں ہندوستان کھینچ کر نہیں لائی۔ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زندگی کے معلوم نہیں کتنے دن اَور ہیں۔ مجھے اگر آرام اور سکون کی خواہش ہوتی تو عمر کے یہ آخری دن حرم پاک ہی میں اطمینان سے گزارتا اور اُس مقدس سرزمین میں سپردِ خاک ہونا پسند کرتا۔ میں اس بڑھاپے میں اور اس قدر ضعف اور کمزوری کے باوجود آپ لوگوں کے پاس اس لیے پہنچا ہوں کہ آپ سے کچھ کہنا ہے:

ہندوستان سے باہر جانے کا سبب

آپ کے بزرگوں نے مجھے باہر بھیجا تھا۔ باہر رہ کر جو کچھ بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرسکتا تھا، میں نے کی۔ اسی اثنا میں مَیں نے بہت کچھ دیکھا اور عجیب عجیب حالات سے مجھے گزرنا پڑا۔ میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں، اسے غور سے سنو!

چوبیس سالہ جلاوطنی کے مشاہدات

میں نے اپنی زندگی کے چوبیس برس (1915ء تا 1939ء) ہندوستان سے باہر گزارے ہیں۔ اس طویل مدت میں مَیں نے محض ملکوں کی سیاحت نہیں کی، اور چیزوں کو صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ بڑی بڑی مہموں میں خود شریک رہا ہوں۔ اس جدوجہد میں کبھی اپنے ارادوں میں کامیاب رہا، تو اکثر بڑی تلخ اور جاں گداز ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ مجھے سلاطینِ اسلام کے مشوروں میں شریک ہونے کا بھی

موقع ملا۔ میں ان سپہ سالاروں کا رفیق بھی رہا، جو بڑی بڑی سلطنتوں کے رُکن رکین تھے، جن کے ہاتھوں دنیا کے عظیم الشان معرکے سر ہوئے۔ بادشاہوں اور سپہ سالاروں کے علاوہ میں جس ملک میں گیا اور جہاں بھی رہا، میں نے وہاں کی ہر چیز آنکھیں کھول کر دیکھی۔

تاریخی مطالعے کی روشنی میں میرے اَفکار و تجربات

میں نے ان ملکوں کی پچھلی تاریخ کا مطالعہ بھی کیا اور وہاں کے رہنے والوں کے موجودہ حالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا یہ مطالعہ سرسری نہیں اور میری باتوں کو تم وقتی تأثرات اور عارضی ہیجانات کا نتیجہ نہ سمجھنا۔ میرے پیچھے تجربات اور مشاہدات کی ایک وسیع دنیا ہے اور میں نے اقوام کی تاریخ کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میرے حالات مجھ سے کُرید کُرید کر پوچھو اور میرے اخذ کردہ نتائج کو توجہ سے سنو اور ان پر غور کرو۔ میں کوئی بات تم سے چھپانا نہیں چاہتا۔ میرا علم، میرا مطالعہ، میرے تجربات اور میرے افکار وقفِ عام ہیں۔ (63)

تباہ ہوتی ہوئی سلطنتوں اور نظاموں کا مطالعہ

میری آنکھوں نے زندگی کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میرے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ بادشاہ، سپہ سالار اور اُمرا بری طرح قتل کیے گئے۔ وہ طبقے جو علم و حکمت اور عزت و دولت کے نشے میں ذہنی مسرتوں اور جسمانی آسودگیوں میں مست تھے، زمانے کی ایک ٹھوکر میں ذلت کے عمیق (گہرے) گڑھوں میں گرے ہوئے نظر آئے۔ نہ کوئی ان کے علم کا قدردان رہا اور نہ ان کی عزت کا پُرسانِ حال۔ میں نے پرانے تمدنوں کی بنیادوں کو اپنی نظروں سے کُھدتے دیکھا۔ وہ نظامِ فکر جن کو ان کے ماننے والے لازوال جانتے تھے اور ان میں ایک ذرا سی تبدیلی ان پر گراں گزرتی تھی، میں نے ان نظاموں کے محترم و مقتدر علم برداروں کو اپنے وطنوں سے دُور، محرومی و بے کسی میں در بہ در خاک چھانتے دیکھا ہے۔ میں نے انسانی نسلوں کو فنا ہوتے، بستیوں کو اُجڑتے، تمدنوں کو مٹتے اور مذہب اور اہلِ مذہب کو بڑی سفاکی سے کچلے جاتے دیکھا ہے۔

خدا جانتا ہے کہ وہ چیزیں جو مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز تھیں اور جن کے لیے میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا ہے، ان چیزوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہوا، اور ان دردناک مناظر سے میرے دل و دماغ پر کیا گزری۔ بہرحال خدا تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس قدر کرب اور اتنی اذیت جھیلنے کے بعد بھی میرے ہوش و حواس بجا رہے۔ میں زندگی کے ان انقلابات کو برابر دیکھا اور ان پر غور وخوض بھی کرتا رہا۔

دیارِ حرم میں حاضری؛ اپنے علوم وافکار پر غور وفکر

میری خوش قسمتی تھی کہ جلاوطنی کے آخری ایام میں توفیقِ الٰہی مجھے دیارِ حرم (مکۃ المکرّمہ) میں لے آئی۔ وہاں مَیں تقریباً ۱۲ سال (15/ اگست 1926ء تا 7/ مارچ 1939ء) تک رہا۔ اس طویل مدت میں مجھے اپنے تجربات، تأثرات اور جو کچھ اس وقت تک دیکھا، پڑھا اور سنا تھا، ان پر یکسوئی سے غور کرنے کا موقع ملا۔

آپ لوگ یقین کریں کہ جہاں تک میری عقل اور سمجھ کی پہنچ تھی، مَیں نے اپنے افکار کو اس طویل مدت میں خوب جانچا، پرکھا اور ان کے حسن و قبح میں تمیز کی۔ میں نے اپنے افکار کو، جتنی بھی تاریخ مَیں جانتا تھا، اس کسوٹی پر کسا۔ خود اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی صواب دید کی اور جو کچھ علمِ دین، حکمت اور تقویٰ مجھے میسر تھا اور اپنے مرشدوں اور استادوں کے فیض سے جو بھی بصیرت عطا ہوئی تھی، اپنے افکار کو ان کے رُو بہ رُو پیش کر کے اپنے نفس کا بھی محاسبہ کیا اور ان افکار کا بھی پورا پورا جائزہ لیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جنھیں ہندوستان کے مسلمانوں کے اہلِ علم کا ایک بہت بڑا طبقہ اپنا امام اور استاد مانتا ہے، ان جیسے عظیم المرتبت عالم، حکیم، محدث، مجتہد اور خدا شناس بزرگ کے علم وحکمت کے ترازو میں اپنے افکار کو تولا۔

حرمِ اقدس میں غور وفکر کے نتائج اور وطن واپسی کا سبب

چناں چہ حرمِ اقدس کی برکتوں اور رحمتوں سے بھری ہوئی سرزمین میں ایک طویل

عرصے تک غور و تأمّل کرنے کے بعد جب مجھے اس بات پر پورا اطمینان ہو گیا کہ:

(الف) جن افکار و خیالات اور طریقِ کار کی طرف میری جستجو نے میری رہنمائی کی ہے، اس سے نہ تو خدانخواستہ میرے اسلام کو گزند پہنچے گا۔

(ب) اور نہ میری قوم کو اس کی وَجہ سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے۔

بلکہ مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ اگر میرے وطن والے اُن ہی راہوں پر چلتے رہے، جن پر وہ اب تک چلتے رہے ہیں اور جس عالمِ بے خبری میں وہ اب تک پڑے ہوئے ہیں، اسی عالَم میں مست رہے تو:

(الف) نہ ان کا اسلام بچ سکے گا۔

(ب) اور نہ ان کی قومی حمیت اور ملّی حیثیت برقرار رہ سکے گی۔

جب مجھے اس حقیقت پر پورا یقین حاصل ہو گیا اور اس یقین نے کچھ کرنے اور فکر کو عمل میں لانے پر مجبور کر دیا تو میں نے وطن واپس آنے کا تہیہ کر لیا۔

میرے مشاہدات اور تجزیات کا خلاصہ

بے شک مجھے واپس وطن آنے کے لیے اپنے دشمنوں کی سامنے جھکنا پڑا، لیکن میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس اعترافِ شکست کے صدمے کو برداشت کیا۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ کرتا تو کبھی بھی آپ لوگوں سے آج یوں باتیں نہ کر سکتا تھا۔ جو کچھ میرے دل و دماغ میں تھا، اسے مَیں ایک سربستہ راز کی طرح اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔ آپ لوگوں کو ان حقائق سے آشنا نہ کر پاتا، جن تک خدا معلوم مَیں کیسی جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور جان کاہیوں کے بعد پہنچا تھا۔ جن میں میرے خیال میں آپ لوگوں کے لیے دنیا و آخرت دونوں کی فلاح تھی۔

1۔ سوویت انقلاب کی قوت، وسعت اور شدت کا مشاہدہ

میں ایک عالَم گیر انقلاب کے سیلاب کو اپنی آنکھوں سے اٹھتا دیکھ آیا ہوں۔ انقلاب کے اس سیلاب نے کئی ایک ملکوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جو (ممالک) اَب تک

بچے ہوئے تھے اور جو بچے ہوئے ہیں، وہ بھی اس سیلاب کی ریلے سے زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ یہ سیلاب موسمی جھکڑ نہیں کہ آیا اور نکل گیا۔ یہ عصرِ حاضر کے تاریخی تقاضوں کا قدرتی نتیجہ ہے۔ انقلاب کا یہ سیلاب پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ دیوارِ چین ہو یا سدِّ مآرب (یمن میں مآرب کی مضبوط دیوار)، یہ سیلاب سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔

2۔ مسلمان معاشروں کی بے خبری

دنیا ایک نئے طوفانِ نوح سے دوچار ہوا چاہتی ہے۔ بادل گھر چکے ہیں۔ گھٹائیں برسنے ہی کو ہیں۔ طوفان اٹھتے اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں نہ تو ان طوفانوں کی خبر ہے، اور نہ تم یہ جانتے ہو کہ اگر یہ طوفان بہہ نکلے تو تمھارا کیا حشر ہوگا۔

3۔ تمھارے علما اور اہلِ دانش کی کوتاہ نظری

تمھارے علما ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش (کے سیاسی اور معاشی ماحول) کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اگر کبھی دیکھتے ہیں تو بس کتابی نظر سے۔ وہ (عملی) زندگی سے کٹ چکے ہیں۔ اس لیے جن علوم (قدیم طرزِ فکر و استدلال اور منطق و فلسفہ وغیرہ) کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ان علوم میں اس بنا پر نہ تو خود میں کوئی زندگی کی رمق باقی ہے اور نہ وہ علوم (رسمی طور پر) پڑھانے اور پڑھنے والوں میں زندگی کی حرارت و تڑپ پیدا کر سکتے ہیں۔

4۔ طبقاتی مفادات کے حامل تمھارے سیاست دان

تمھارے سیاست دان بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں، لیکن ان کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ ''قوم'' اور ''وطن'' کا نام لیتے ہیں، ''مذہب'' اور ''کلچر'' پر زور دیتے ہیں، لیکن ان کے قوم، وطن، مذہب اور کلچر کا تصور یا تو سِرے سے موہوم ہے، یا ان کا اطلاق ایک خاص طبقے کے اغراض اور مصالح پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ زمانہ ان کے اشاروں پر سدا

حرکت کرتا رہے گا اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی طرف ہی تکتے رہیں گے۔

5۔ متوسط طبقے کی غفلت اور عوامی حالت

قوم کے متوسط طبقے ہیں کہ وہ روزمرہ کی مادی ضرورتوں اور رَسمی مذہب کے چند معمولات کے سوا، جن سے انھیں تھوڑا بہت اطمینان مل جاتا ہے، کسی اَور چیز سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ باقی رہے عوام، قوم کا غالب حصہ قوم کے جسم کے ہاتھ اور پاؤں، ان کو تم نے ''**عوام کالأنعام**'' (عوام جانورں کی طرح ہوتے ہیں) کہہ کر صدیوں سے چوپاؤں (جانوروں) کے درجے پر رکھ چھوڑا ہے۔

6۔ تمھارے اہلِ فکر و قلم کی محدود دنیا

تم نے اپنی ایک محدود دنیا بنا رکھی ہے۔ اس دنیا میں تم شاداں و فرحاں ہو اور کسی دوسرے طبقے، قوم اور فکر اور خیال کو خاطر میں نہیں لاتے۔ تمھیں ''ساون کے اندھے'' (ساون کے موسم میں اندھے ہونے والے) کی طرح خیر سے اپنے اہلِ قلم ''مجددین'' اور ''اصحابِ امر'' کے طفیل ہر طرف خزاں میں بھی ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ (مسلمانوں کی ترقی اور عروج کے موسمِ) بہار کا عہد کبھی کا گزر چکا۔ تم خوش اعتقادی میں اپنے ہاں اب تک ''بہار'' ہی کا عمل دخل دیکھ رہے ہو۔

دنیا میں آنے والے زلزلوں کو آنکھیں کھول کر سمجھو!

دنیا میں زلزلے آرہے ہیں، لیکن تم گھروں کے اندر آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو۔ زندگی کی قہرمانی (جابر) قوتیں اپنی پوری شدت میں انسانیت کے بطن سے کوہِ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں۔ ان کے ہاتھوں پُرانی دنیا پر جو کچھ بھی گزرے، کم ہے۔

جس آنے والے انقلاب کی میں تمھیں خبر دے رہا ہوں، مَیں یورپ کے ایک بڑے حصے میں اس انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھ آیا ہوں۔ اس انقلاب نے اس سرزمین کی جس طرح کایا پلٹ کی اور غالب گروہ نے جس سفا کی سے اپنے حکمرانوں کو تہہ تیغ

کیا، مَیں اس کے اسباب اور نتائج خوب سمجھ چکا ہوں، لیکن یہ انقلاب بس اسی ملک تک محدود نہیں رہے گا۔ یہ عالم گیر انقلاب ہے۔ یہ ساری انسانیت کو ایک نہ ایک دن اپنی لپیٹ میں لے کر رہے گا۔تم اس انقلاب کی قوت، وسعت، شدت اور سفا کی اپنی موجودہ زندگی میں محسوس تک نہیں کرسکتے۔ اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو۔ یقیناً یہ ایک ''حشر'' برپا کر کے رہے گا، تاکہ انسانیت کے لیے خدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے ''نشر'' کا سامان ہوسکے۔

عالم گیر انقلابات کے بنیادی اسباب

1۔ کماؤ طبقے کی پس ماندگی اور کھاؤ طبقے کی عیاشی

ہوا یہ کہ انسانیت کی بڑی تعداد کو اب تک ایک گروہ نے دبائے رکھا۔ یہ مختصر گروہ کُل قوت اور اقبال (عروج) کا مالک تھا۔ انسانیت کی یہ بڑی تعداد کسان اور مزدور کماتے اور اوپر کا یہ مختصر گروہ ان کی کمائی کو اپنا حق سمجھتا رہا۔ جو کماتے تھے، ان کو کھانے کو نہ ملتا تھا۔ جو اُن کی کمائی پر رہتے تھے، وہ کمانے کو ذلت کا نشان سمجھتے تھے۔نتیجہ یہ نکلا کہ 'کماؤ طبقے' پس ماندہ اور ذلیل ہوتے گئے اور 'کھاؤ طبقے' دولت اور اقتدار کے نشے میں انسانی اَخلاق سے گزر گئے۔ مجموعی طور پر ساری انسانیت کو گھن لگ گیا۔

2۔ علم، لٹریچر اور مذہب کے طبقاتی معیارات

غضب یہ ہوا کہ اس دور میں علم، لٹریچر اور مذہب کے جو معیار بنے، ان کے پیشِ نظر بھی بس اسی مختصر (حکمران طبقے اور) گروہ کی خوشنودی رہی۔ ان کے رویے سے اگر سکون و اطمینان ملتا تو زیادہ تر ان لوگوں کو۔ اور ذہن کوجلا ہوتی تو ان کی۔ تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلتیں تو صرف اُن کے گھروں یا محلوں تک، جو مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کسانوں اور مزدوروں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انھیں کسی بات کا بھی ہوش نہ رہتا۔ کبھی کبھار ان کے شعور کی آنکھیں کھل جاتیں تو انھیں سُلانے کے لیے خواب آور دواؤں کی کمی نہ تھی۔

3۔ مشین کی ایجاد اور مزدوروں کا اس پر قبضہ

زمانہ مدتوں اسی طرح چلتا گیا۔ محنت کش طبقے نسل در نسل اپنے بھائیوں کے ہاتھوں سے یہی دکھ اٹھاتے رہے۔ لیکن ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

آخر اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی اور اس سے اپنے بندوں کی یہ بُری حالت زیادہ دیر نہ دیکھی گئی۔ چناں چہ انسانی ذہن کو یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے۔ اس مشین سے صنعت و حرفت کا دور شروع ہوتا ہے۔ بے شک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سی مصیبتیں لایا۔ مشینوں کے چلانے والوں پر سال ہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے، لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ مزدور متحد اور منظّم ہو رہے ہیں۔ آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے۔

اس انقلاب میں پس ماندہ طبقوں کی للکار

یہ انقلاب جسے میں اپنی آنکھوں سے برسرِ کار دیکھ کر آیا ہوں، انسانیت کے ان پس ماندہ طبقوں کو للکار رہا ہے کہ:

- ☆ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق چھینو۔ جو ظلم پر جی رہے ہیں، انھیں نیست و نابود کر دو۔
- ☆ اس انقلاب کا نعرہ یہ ہے کہ: ”مزدورو! کسانو! محنت کشو! مستقبل تمھارا ہے۔“
- ☆ تم محنت کرتے ہو اور تمھاری محنت ہی کا نتیجہ ہیں، یہ سر بہ فلک عمارتیں، رزق کی یہ فراوانی، آرام و آرائش کے یہ ذرائع۔ دنیا کی یہ ساری ثروت اور دولت تمھاری ہے، جس سے تم اب تک محروم رکھے گئے ہو۔ دراصل یہ کُل متاع تمھاری ہے۔
- ☆ اٹھو! اپنے آپ کو منظّم کرو۔ آگے بڑھو اور جو تمھارا حق ہے، اس پر قبضہ کر لو۔ اس میں جو شخص آڑے آئے، اسے مٹا دو۔

☆ جو علم، کلچر، مذہب اور اخلاق تمھارا سَــــدِّ راہ (راستہ روکتا) ہو، اس کا انکار کر دو۔ وہ علم نا قابلِ اعتبار ہے۔ وہ کلچر بے کار اور فرسودہ ہے۔ وہ مذہب غلط ہے اور اَخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے۔

اس انقلاب کے فلسفے کا تجزیہ

اس انقلاب نے اپنا ایک فلسفہ بھی وضع کیا ہے۔ اس فلسفے سے محنت کشوں کو ایک ایسا حربہ ہاتھ آ گیا ہے، جس کا توڑ بڑے بڑوں سے بھی مشکل سے بَن آتا ہے۔ اس فلسفے کی نظری حیثیت جو کچھ بھی ہے، وہ ہے ہی، لیکن عملاً اس کا مقابلہ اس لیے بھی مشکل ہے کہ گو انقلاب کا یہ فلسفہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے، لیکن اس کا دعویٰ اور کوشش یہ ہے کہ ساری کی ساری خلقِ خدا بغیر کسی رنگ، نسل، ملک یا مذہب کی تمیز کے' آزادی، مساوات اور اقتصادی خوش حالی کی نعمتوں سے یکساں فیض یاب ہو۔

یہ فلسفہ مظلوموں کو انصاف کی اُمید دلاتا ہے۔ اس سے ذلیل اور پس ماندہ انسان عزت اور اقبال کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ کم ہمتوں میں جرأت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ آج اس زمانے میں ان مظلوموں، پس ماندوں اور کم ہمتوں ہی کی کثرت ہے۔ خدا کی بیش تر مخلوق دکھوں اور روگوں ہی میں گرفتار ہے۔

انقلاب کے لادینی فلسفے سے بچنے کا واحد راستہ

لہٰذا اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بے کس طبقوں کی خبر نہ لی، انھیں اسی حال میں رہنے دیا، جس میں کہ وہ صدیوں سے جان توڑ محنت کر رہے ہیں اور تمھارے اوپر کے طبقے حسبِ سابق جونک بن کر ان کا خون چوستے رہے، اور ان کو تم نے اب بھی اسی بھوک، جہالت، ذلت اور عفونت (گندگی) کی دلدلوں میں بہ دستور مرنے سڑنے دیا تو یاد رکھو! کہ انقلاب کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے، تمھارے ملک کے ان بدنصیب طبقوں کو دوسرے ملکوں کی طرح تمھارا جانی دشمن بنا دے گا۔ اگر تمھاری غفلت سے ان کی دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی تو اس کے شعلے تمھیں تو جلا کر خاک

سیاہ کریں گے ہی، لیکن اس کے ساتھ تمھارے علم، کلچر اور مذہب کی بھی خیر نہ ہوگی۔

انقلاب کے دینی فلسفے کی اہمیت

اس قسم کا انقلاب اور اس کے لادینی فلسفے کے ہول ناک نتائج سے بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کے کسی ایسے دینی فلسفے کو اختیار کرو، جس کے ذریعے تم خدا کو مانتے ہوئے خدا کی مظلوم مخلوق کو خوش حال بنا سکو۔ انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہہ سکتی۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اگر لادینی فلسفۂ انقلاب کے علَم بردار اپنے بلند بانگ دعوے کے ساتھ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو تم ساری انسانیت کو ایک خدا کی مخلوق ماننے والے اور اسے ہر ذی روح کا رازِق اور ربّ جاننے والے کوئی ایسا فکر کیوں پیش نہیں کرتے، جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو۔ ہر ظلم مٹ جائے۔ ہر حق دار کو اس کا حق ملے۔ ذلت و نکبت (بدحالی) کا خاتمہ ہو۔ کوئی بندہ اپنے ربّ کے دیے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جا سکے۔ جس طرح ایک خاندان کے سب افراد آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، اسی طرح مجموعی انسانیت، جس کی حیثیت فی الواقع ''عَیالُ اللّٰہ'' (اللہ کے کنبے) کی ہے، اللہ کی نعمتوں سے یکساں متمتع ہو۔

دینی انقلاب کا پیغام

چناں چہ مَیں انقلاب کے اس قسم کے دینی فلسفے کا پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ انقلاب کا میرا یہ پیغام تمھیں لادینی انقلاب کے مضرت رساں اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا۔ محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے۔ تم نے اگر محنت کشوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لادینی فلسفے کے ذریعے ہوگا۔

☆

مقالہ 6

جہاد اور انقلاب

www.rahimia.org

مولانا سندھیؒ کا جذبۂ جہاد و انقلاب

''مولانا (عبیداللہ سندھیؒ)' امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی رہنمائی میں کائنات کی ''روح الکل'' سے اتصال حاصل کر سکے۔ انھوں نے قرآن مجید میں اسی روح کو جلوہ افروز پایا۔ جہاد اور انقلاب اور عمل کا یہ کبھی نہ ختم ہونے والا ولولہ اُسی روح کی ایک جھلک کا اثر ہے۔ جس کے دل پر قرآن اس صورت میں نازل ہو، اُس کو قرار وسکون اسی میں ملتا ہے کہ وہ ہر لحہ جہاد کرتا رہے۔ کبھی خارج میں اور کبھی خود اپنے آپ سے، اُس کی نماز بھی ایک طرح جہاد ہوتی ہے۔

بہرحال مولاناؒ کی ذہنی اور عملی زندگی کا مرکزی نقطہ اِنقلاب ہے۔ اُسی کے گرد اُن کے افکار کی ساری کائنات گھومتی ہے۔ اُن کے نزدیک عقیدہ یا یقین بھی عمل کی ابتدائی منزل ہے۔ یقین اگر پختگی کی حد کو پہنچ چکا ہے تو وہ عملی دنیا میں متشکل ہو کر رہتا ہے۔ عمل کا نہ ہونا' یقین کے نقص کی دلیل ہے۔ زندگی کو عمل کی شکل میں دیکھنا مولاناؒ کی طبیعت کا فطری رُجحان ہے۔ قرآن مجید سے آپؒ کی غیر معمولی شیفتگی اور محبت کا سبب بھی یہی ہے کہ قرآن عمل پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ اسی بنا پر ایک حقیقت بین بزرگ نے مولانا سندھیؒ سے ملاقات کے بعد فرمایا تھا:

''اگر کسی کو ''انقلابِ مجسم'' دیکھنا ہو تو وہ مولوی صاحب کو دیکھے۔''(64)

جہاد اور انقلاب

عالم گیر اور ہمہ گیر ایجابی نظریۂ زندگی

ظلم اور استبداد کے خلاف نفرت کا جذبہ مجھ میں بچپن سے موجود تھا۔ میں مسلمان ہوا تو شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کی حکیمانہ تعلیمات نے میرے اس جذبے کو ایک ایجابی (مثبت) رنگ دیا اور اس میں وسعت و گہرائی پیدا کی۔ ان بزرگوں کے فیض سے ہی مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ:

(الف) قرآن کا مقصد عالَم گیر انقلاب برپا کرنا تھا۔

(ب) آج بھی قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا نصب العین عالَم گیر انقلاب کو بنائیں۔

میں اپنے ان عالی مرتبت مرشدوں کا بے حد احسان مند ہوں کہ انھوں نے میرے جذبۂ نفرت کو — جو ابتدا میں محض ایک ذاتی اور منفی حیثیت رکھتا تھا — ایک عالَم گیر اور ہمہ گیر ایجابی نظریۂ زندگی بنا دیا۔ چناں چہ قرآن کا یہی عالَم گیر اور ہمہ گیر نظریہ اب میرا نصب العین ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کرنا میرا مسلک ہے۔

(ایک دفعہ میرے استاذ حضرت شیخ الہندؒ (مولانا محمود حسن) نے جہاد کے فضائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان فرمائی۔ سنتے ہی میرے بدن میں ایک لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ مَیں نے نگاہ جو اُٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت (شیخ الہندؒ) کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔ آپؒ نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا لیا اور سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

ایک اَور مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ:

www.rahimia.org

''اگر ساری دنیا بھی تمھاری مخالف ہو جائے، لیکن تم اپنے ارادے میں ثابت قدم رہو تو تم ہی کامیاب ہوگے۔''

یہ اعتمادِ نفس ہے اور انقلاب کے لیے یہی اعتمادِ نفس پہلی شرط ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں سال ہا سال تک میری اس طرح تربیت ہوئی۔ میرے خیال میں انقلابی کو اپنے اوپر بڑا اعتماد ہوتا ہے۔

جذبۂ اِنقلاب کے انسانی زندگی پر اثرات

میرے نزدیک انقلاب کا جذبہ ہی فرد کی خودی کو بیدار کرتا ہے۔ جب انسان کی خودی بیدار ہو جائے تو وہ بلا خوف وخطر زندگی کی کشمکشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ فرسودہ اور بے کار دستوروں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اور زندگی کی نئی طرح (بنیاد) ڈالتا ہے۔ یعنی عمل کا مظهرِ أتمّ (پورا اظہار) ذوقِ انقلاب ہے۔ یہی ''ذوقِ انقلاب'' فکر اور عمل میں تعمیر وتخلیق کا باعث بنتا ہے۔ اسی ذوقِ انقلاب نے روسی اشتراکیوں میں اتنی ہمت اور جرأت پیدا کر دی تھی کہ انھوں نے زار (روسی حکمران) کی زبردست حکومت کے پرخچے اُڑا دیے۔ روس میں ایسا نظام قائم کیا، جس کی ساری دنیا مخالف تھی۔ لیکن انقلاب کا ولولہ رکھنے والوں نے کسی کی پرواہ نہ کی اور اپنے عزم و یقین پر برابر ثابت قدم رہے۔

(میرے نزدیک انقلاب ہی کائنات کا پیغام ہے۔ زندگی میں نمو، حرکت اور ارتقا اسی جذبۂ اِنقلاب کی رہینِ منت ہے۔ کائنات میں بھی پیہم کش مکش جاری ہے۔ ازل سے ابد تک ''چراغِ مصطفوی'' سے ''شرارِ بولہبی'' برابر دست و گریبان ہے۔ زندگی میں ہر ہر لمحہ انقلاب کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ فرد کا لحظہ بہ لحظہ خوب سے خوب تر کی تلاش کرنا اسی انقلاب کا فیضان ہے۔ جماعتیں ولولۂ اِنقلاب کھو بیٹھیں تو زندگی سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اگر ان میں کش مکشِ انقلاب رہے تو زندہ اور پائندہ رہتی ہیں۔

میں کسی ایسی زندگی کا تصور ہی نہیں کرسکتا، جس میں انقلاب کا جذبہ سرد پڑ گیا ہو۔ اگر کسی فرد، جماعت یا قوم کو یہ مرض لاحق ہو جائے تو میرے نزدیک اُن کو زندوں میں شمار

نہیں کرنا چاہیے۔ بے عزتی کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ آں حضرت ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ: ''جس قوم نے جہاد کو چھوڑ دیا، وہ ذلیل و برباد ہوگئی۔''[65] دوسرے لفظوں میں کسی قوم کو باعزت اور بااِقبال ہونا صرف اسی بنا پر ہوتا ہے کہ اس قوم میں جہاد کی روح سرگرمِ عمل ہے۔)

جہاد و انقلاب کے بارے میں منفی تأثر کی وضاحت

جہاد اور انقلاب کے ضمن میں یہاں ایک بات واضح ہو جانی چاہیے۔ جہاد کو عام طور پر تیغ آزمائی اور کشور کشائی (تلوار چلانا اور ملک فتح کرنا) ہی سمجھا جاتا ہے۔ انقلاب کے معنی ہم توڑنا پھوڑنا، قتل و غارت اور ''تخریب'' ہی کے لیتے ہیں، لیکن نہ جہاد صرف تیغ آزمائی ہے اور نہ انقلاب محض ''تخریب'' کا دوسرا نام ہے۔ قرآن و حدیث میں جہاد بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ **جہاد بالسَّیف** (تلوار سے جہاد) کا وجود ہی نہیں۔ جہاد تلوار سے بھی ہوتا ہے اور قلم سے بھی، زبان سے بھی، دل سے بھی اور اکثر تو خود اپنے نفس سے ہی جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح انقلاب محض تخریب نہیں۔ منفی خیالات پیش کرنا انقلابی کا کام نہیں ہوتا، بلکہ وہ فرسودہ نظامِ حیات کی جگہ ایک نیا، بہتر اور جان دار نظام پیش کرتا ہے۔

انقلاب کا اصل مفہوم اور نوعیت

ہم نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انقلاب ماضی کی ہر چیز کو مٹا دینے کا نام ہے۔ اس لیے انقلاب اچھا نہیں۔ اس سے تجدُّد اور اِرتقا بہتر ہے۔ یہ انقلاب کی اصلی حقیقت کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے۔ انقلاب اُصولاً صرف ان چیزوں کو مٹاتا ہے، جو مٹانے کے قابل ہوتی ہیں۔ وہ ماضی کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ انسانی تاریخ کے ان سارے ''باقیاتِ صالحات'' (باقی رہ جانے والے اچھے امور) کو برقرار رکھتا ہے، جن کا برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ نئے نظام کی تعمیر میں ان سے پورا کام لیتا ہے۔

زندگی کے دھارے کو اگر بہتا رہنے دیا جائے تو برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن

جب کسی وَجہ سے اس کا راستہ رُک جائے اور پانی چڑھتا چلا جائے تو پھر یک بارگی بند ٹوٹتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ سیلاب آ گیا۔ تجدُّد و اِرتقا کے ذریعے سے جو منزل برسوں میں طے ہوتی ہے، انقلاب لانے والے اپنے آپ کو دوسروں سے بہت پیچھے پا کر بہ یک خروش (بہ یک آواز ہو کر) ان تک پہنچنا چاہتے ہیں، یا ان سے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

مستقبل کے انقلابات کی نوعیت

بے شک اس دور کا سب سے بڑا انقلاب مادی اور صنعتی انقلاب ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انقلاب ہمیشہ مادی اور صنعتی ہو، بلکہ اب تو اس کا زیادہ امکان ہے کہ آئندہ انقلاب انسان کی نفسی اور ذہنی زندگی میں ہو۔ بعض محقق اہلِ قلم لکھتے ہیں:

''انسانیت کے ارتقا کی اگلی منزل طبعی (مادی) نہیں، بلکہ نفسی اور ذہنی ہوگی۔ پہلے پہلے انسان ارتقا کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے مقام پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے۔ جس طبعی ارتقا نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے، پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے، اور انسان مشین اور سٹیم کا خالق بنا، اسی طرح آج وہ مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے۔ اس کا یہ قدم مادی نہیں، بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا۔'' (66)

میری نظر میں یورپ کا یہ مادی انقلاب بھی آگے چل کر لامحالہ انسانوں کی نفسی اور ذہنی ترقی کا محرک ہوگا۔ یورپ کے وہ طبقے جو اب تک صرف مادے کو ہی مقصدِ حیات اور حاصلِ حیات سمجھتے ہیں، زندگی کو ماورائے مادہ بھی ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بے شک میں موجودہ مادی انقلاب کا دل و جان سے معترف ہوں۔

سائنسی ترقیات کے بارے میں متوازن تجزیہ

میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم یورپ کی دو سو سال کی جدوجہد اور سائنس نے دنیائے اسباب کی تسخیر میں جو معجزات دکھائے ہیں، ان کا انکار کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ترقی کی اس منزل سے بہت پیچھے چلے جائیں گے۔ ہمیں اس مقام پر آنے کے لیے صدیاں درکار ہوں گی۔

میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے، یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم زندگی کے اساس کی حیثیت دیں، لیکن یہ نہ سمجھیں کہ سائنس نے ساری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ بے شک سائنس نے مادی دنیا میں جو انکشافات کیے ہیں، وہ سب صحیح ہیں، لیکن زندگی صرف مادے تک ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ یہ مادہ کسی اَور وجود کا پَرتَو ہے۔ اس وجود کا مرکز ایک اَور ذات ہے، جو خود زندگی ہے۔ زندگی کا سہارا اور باعث بھی وہی ذات "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْم" (یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اشیا میں زندگی اور مرکبات کی ہیئت اور شکل وصورت کو قائم رکھنے والی ذات) ہے۔

اسلام کا جامع نظریہ

میں مادیّین (MATERIALISTS) کے تصورِ کائنات کو سِرے سے غلط نہیں مانتا، لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے۔ لیکن حقیقت کا ایک اَور پہلو بھی ہے، جو مادے سے ماورا اور بالا تر ہے۔ اس کو شرعی زبان میں "غیب" کہا گیا ہے۔ زندگی کا مادی تصورِ حیات اس لحاظ سے ناقص ہے کہ وہ زندگی کے صرف ایک پہلو کی رونمائی کرتا ہے، لیکن زندگی کا صحیح اور مکمل تصور یہ ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ [67] (اے ہمارے ربّ! دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی۔ اور بچا لے ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔)

یہی تصور ہے، جو زندگی کی ساری مادی اور ماورائے مادی کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے۔ چناں چہ میں برصغیر میں یورپ کی قسم کا مادی انقلاب چاہتا ہوں، لیکن اس سے میرا مقصود علم اور سائنس کی تمام برکات کو جس سے آج کل یورپ مستفید ہو رہا ہے، اپنے ملک میں رائج کرنا ہے۔

انسان کا روح الکل سے تعلق ضروری ہے

تاہم میری نظر صرف اس مادی انقلاب تک محدود نہیں۔ میرے پیشِ نظر تو ہر فردِ انسانی کا تعلق کائنات کی روحِ کُل (ذاتِ الٰہی) سے جوڑنا ہے۔ اسی کو میں اسلام سمجھتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک جب تک مادی دنیا پر انسان قابو نہ پا لے اور علم و سائنس کی برکتیں ہر شخص کے لیے عام نہ ہو جائیں، انسانیت بہ حیثیتِ مجموعی اسلام کے قریب نہیں آ سکتی۔

اسلام؛ مادی ترقی کا تتمہ اور تکملہ

اسلام کی حکومت' خدا کی حکومت ہے۔ حکومت کے معنی یہ کہ اس کی نعمتیں اس کے سارے بندوں کے لیے عام ہو جائیں۔ اسی بنا پر میں اپنے اسلام کو یورپ کی مادی ترقی کا مخالف نہیں، بلکہ اس کا تتمہ اور تکمیل کرنے والا جانتا ہوں۔ جب تک ہم یورپ کے مادی انقلاب کو اپنا نہ لیں گے، اسلام کا عالَم گیر انقلاب شرمندۂ معنی نہ ہو سکے گا۔

(صحیح مذہبیت انسان کو اپنی ذات کے ماورا کسی اَور اعلیٰ مقصد کے لیے ایثار کرنا سکھاتی ہے۔ خالص مذہبی آدمی وہ ہے، جو اپنے اعلیٰ تصور کی خاطر اپنی ذاتی خواہشات کو، خواہ وہ کسی قسم کی ہوں، دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اِسے اس راہ میں دوسروں کی مخالفت بھی مول لینی پڑے تو وہ بغیر کسی خوف و ہراس کے خوشی خوشی مخالفت کو قبول کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ مذہب انقلابی نہ ہو تو پھر اس کی اِفادیت محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ مذہب ناقص ہوتا ہے۔ کسی آدمی کے مذہبی ہونے کا پتہ اس کے خلوص اور ثابت قدمی سے چلتا ہے۔ مذہبیت کی اس کسوٹی کو غالب نے شاعرانہ رنگ میں یوں بیان کیا ہے ؏

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایمان ہے)

مقالہ 7

قرآن حکیم کا اعجاز

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اعجازِ قرآن)

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ کے نظریۂ اعجازِ قرآن کی اہمیت

''اس میں شک نہیں کہ قرآن عظیم کا معجزہ ہونا تو سب مسلمانوں کے لیے مُسلَّم ہے، لیکن ہر گروہ کا 'اعجازِ قرآن' کے متعلق اپنا اپنا نظریہ ہے۔

فلسفی مزاج علمائے اسلام نے بہت پہلے اس اعجازِ قرآن کو جو صرف عربی بلاغت سے وابستہ ہے، چنداں اہمیت نہیں دی۔ اس پر اُن کے مخالفین کی طرف سے بہت کچھ لے دے بھی ہوئی، لیکن اگر ان فلسفی مزاج لوگوں کے اقوال کی یہ توجیہ کی جائے کہ عجمی اقوام چوں کہ عربی بلاغت کے اعجاز کو کما حقہ (پوری طرح) سمجھنے سے قاصر تھیں، اس لیے ان کے لیے قرآن کے اعجاز کا معیار عربی بلاغت نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں تو سارا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

لہٰذا شاہ صاحبؒ نے قرآن کے اعجاز کو اس کے بتائے ہوئے نظامِ حیات میں متعین فرمایا۔ اس طرح قرآن کی عملی افادیت ہی ان کے نزدیک اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوئی۔ اب قرآن کے اس نظامِ حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج، مستفید ہوسکتا ہے اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس صورت میں معدودے (گنتی کے) چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔''

قرآن حکیم کا اعجاز

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اعجازِ قرآن)

قرآن عظیم کے سلسلے میں امام شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

''اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوارؒ کے درسِ قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپؒ قرآن کے معانی بڑے غور و تدبر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ آیات کی شانِ نزول کی وضاحت کرتے اور حل طلب اُمور کے لیے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اس کی وَجہ سے میرے سامنے فتح و کامیابی کا ایک میدان کھل گیا۔ والد بزرگوارؒ کا دستور یہ تھا کہ اپنے رفقا کے حلقے میں ہر روز تین رکوع سے کم مقدار میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کے معانی پر غور و خوض فرماتے۔'' (68)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات

خود شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حج سے (رجب ۱۱۴۵ھ/ جنوری 1733ء میں) واپس آکر پانچ سال کے بعد (رمضان ۱۱۵۱ھ/ دسمبر 1738ء میں) قرآن مجید کا (''فتح الرّحمٰن بترجمة القرآن'' کے نام سے) فارسی میں ترجمہ کیا۔

(حج سے واپس آنے کے بعد قرآن کے ترجمے سے پہلے ۱۱۴۷ھ/ 1734ء میں آپؒ نے اپنی شاہ کار کتاب ''حُجّةُ اللّٰہِ البالِغه'' تصنیف فرمائی، جس میں قرآنی علوم کے عمیق (گہرے) مطالعے سے اپنا فکر و فلسفہ جامع اور مکمل شکل میں مدوّن اور مرتب کیا۔)

شاہ صاحبؒ کا حکمتِ عملی کی اساس پر نظریۂ اعجازِ قرآن

اس کے بعد پہلی بار اس کی تعلیم شروع کی۔ شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ ان کے زمانے کی (دہلی کی) اعلیٰ سوسائٹی 'حکمتِ عملی' کو سمجھتی اور پہچانتی ہے۔ چناں چہ آپؒ نے اسی حکمتِ عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بنایا۔ اس عہد میں جو مروّجہ اور متداول (مشہور) حکمتِ عملی تھی، اسے قرآن کے عملی تصورات کے تابع کیا۔ اس طرح قرآن کی حکمتِ عملی کا اَساسی فکر مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا۔

اس نظریۂ اعجازِ قرآن کے دو اصول

شاہ صاحبؒ بارہ برس تک اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے اس بارہ برس کے مطالعے میں اپنے پروگرام کے دو اُصول متعین کیے:

(۱) قرآن عظیم کی حکمتِ عملی: یعنی انسانوں کی عملی زندگی کے متعلق قرآنی تصورات ہی حقیقت میں ایک معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اَساس علمی اصلاح کے لیے تجویز ہوئی۔

(۲) اقتصادی عدمِ توازن: معاشرت، اجتماع، حکومت اور ملت میں تمام اَخلاقی اور عملی خرابیوں کا باعث دراصل معاشی اور اقتصادی عدمِ توازن ہے۔

اعجازِ قرآن سے متعلق دیگر نظریات

اس میں شک نہیں کہ قرآن عظیم کا معجزہ ہونا تو سب مسلمانوں کے لیے مُسلَّم ہے، لیکن ہر گروہ کا 'اعجازِ قرآن' کے متعلق اپنا اپنا نظریہ ہے۔

فلسفی مزاج علمائے اسلام نے بہت پہلے اس اعجازِ قرآن کو جو صرف عربی بلاغت سے وابستہ ہے، چنداں اہمیت نہیں دی۔ اس پر اُن کے مخالفین کی طرف سے بہت کچھ لے دے بھی ہوئی، لیکن اگر ان فلسفی مزاج لوگوں کے اقوال کی یہ توجیہ کی جائے کہ عجمی اقوام چوں کہ عربی بلاغت کے اعجاز کو کماحقہ (پوری طرح) سمجھنے سے قاصر تھیں، اس لیے ان کے لیے قرآن کے اعجاز کا معیار عربی بلاغت نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں تو سارا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نظریۂ اعجازِ قرآن کی اہمیت

لہٰذا شاہ صاحبؒ نے قرآن کے اعجاز کو اس کے بتائے ہوئے نظامِ حیات میں متعین فرمایا۔ اس طرح قرآن کی عملی افادیت ہی ان کے نزدیک اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوئی۔ اب قرآن کے اس نظامِ حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج، مستفید ہوسکتا ہے اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس صورت میں معدودے (گنتی کے) چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

انسانی اَخلاق کے لیے متوازن اقتصادی نظام کی ضرورت

قرآن کی حکمتِ عملی کے علاوہ شاہ صاحبؒ کے انقلابی پروگرام کا دوسرا اصول؛ ''اقتصادیات میں توازن اور مساوات'' کی اہمیت واضح کرنا تھا۔

عام طور پر تصوف فلسفۂ اَخلاق سے شروع ہوتا ہے۔ گو حیوانی زندگی کے لیے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے، لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے، اس پر کسی نے توجہ نہ کی۔ اس کی وَجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہوگئی۔ ہمارے بڑے بڑے عقل مند اور زیادہ با اَخلاق صوفیا سب کے سب اجتماعی سیاست سے دُور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے۔ تصوف کی عام کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ ان کے مدوّن کرنے والوں نے انسانی اَخلاق اور اقتصادیات کے باہمی رشتے اور ان کے ایک دوسرے سے متأثر ہونے کی اہمیت کو نہ سمجھا۔

اس کے برعکس شاہ صاحبؒ نے زندگی کی اس حقیقت کو اس کی صحیح شکل میں پہچانا اور بار بار اپنی کتابوں میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔

چناں چہ ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

''اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمران جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے

کاری گر طبقات پر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے اجتماعی اَخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔

جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ قدرتِ الٰہیہ انقلاب کا سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اُتار دے۔ چناں چہ کسریٰ و قیصر کی حکومت نے بھی یہ وطیرہ (تعیّشات اور آرام و آسائش) اختیار کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس مرض کے اِزالے کے لیے اُمِیّین (عربوں) میں رسول ﷺ کو پیدا کیا گیا۔ فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اس اُصول پر لوازمِ نبوت سے شمار ہوتی ہے۔" (69)

شاہ صاحبؒ کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے۔ اور ہر انسانی جماعت کو ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے، جو اس کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں — جو اُن کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے — زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں۔ لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وَجہ سے حیوانی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اَخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔

جب انسان کے اَخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیبِ نفس کے ذریعے اس نے اپنے اَخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور پر موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لیے قبر و حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اَخلاق کی یہ تکمیل ہی اُسے جنت کا حق دار بنائے گی۔ اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے دیدار سے بہرہ ور ہو۔

www.rahimia.org

نظامِ نبوت اور انسانی زندگی کا باہمی تعلق

اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لیے ایک فطری چیز بن جاتی ہے۔ نیز جہاں نبوت نہ ہو، وہاں انبیا علیہم السلام کے پیروکار یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہی معنی ہیں۔

شاہ صاحبؒ بہ حیثیتِ مفکر و داعیٔ انقلاب

شاہ صاحبؒ کے مجوزہ انقلابی پروگرام کے یہ دو اُصول تھے:

(۱) قرآنی حکمتِ عملی (۲) اور اقتصادی توازن

مختصر الفاظ میں اُوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، ان دو اصولوں سے یہی مراد تھی۔

شاہ صاحبؒ اپنے اس لائحۂ عمل کو ایک مدلل شکل میں اپنی قوم کے اربابِ فکر کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے جس قدر علمِ حدیث کی ضرورت تھی، اس کی تحصیل دہلی میں ممکن نہ تھی۔ اس لیے آپؒ حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں دو سال کے عرصے میں آپؒ نے حدیث و فقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کرلیا۔ (اپنی کتاب ''فُیوض الحرمَین'' میں انھوں نے اُن تمام فلسفی، سیاسی، اجتماعی فوائد کا ذکر کیا ہے، جو انھیں حرمین شریفین کے روح پرور ماحول سے حاصل ہوئے)

شاہ صاحبؒ نے (جمعہ کی رات ۲۱/ ذوقعدہ ۱۱۴۴ھ/ 16/ مئی 1732ء) مکہ معظّمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا (شاہ صاحبؒ نے اس خواب کا تذکرہ اپنی کتاب ''فُیوض الحرمَین'' میں خود تحریر کیا ہے)۔ [70] اس کا حاصل (خلاصہ) ہم اپنی زبان میں تحریر کرتے ہیں:

1۔ انھیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعے موجودہ مفاسد کا تدارُک ہوگا۔ یعنی وہ ان خرابیوں کو دُور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دار حیثیت کے مالک ہوں گے۔

2۔ انھیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اس جگہ وہ نیا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ یعنی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی و اجتماعی تحریکات میں مستقل امام ہوں گے۔

3۔ انھیں سمجھایا گیا کہ ان کی اصلاحات نافذ کرنے کے لیے باہمی لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پیش آنے والا ہے۔

مختصراً اس سارے خواب کا حاصل یہ نکلا کہ شاہ صاحبؒ اسلامی ہندوستان میں ایک مکمل اجتماعی انقلاب کے شروع کرنے والے ہوں گے۔

اس عزم کے ساتھ شاہ صاحبؒ دہلی واپس آئے۔ سب سے پہلے آپؒ نے (''حُجّةُ اللّٰه البالِغه'' میں قرآنی حکمتِ عملی اور اقتصادی عدل و مساوات کے لیے ایک مکمل نظامِ فکر و عمل پیش کیا۔ پھر) قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ''فَتحُ الرَّحمٰن'' مکمل کیا۔ جس میں اجمالی طور پر اپنے پروگرام کو درج کر دیا۔ اور (۱۱۵۶ھ/ 1743ء میں) اس کی تدریس بھی شروع کر دی۔ شاہ صاحبؒ نے ''فَتحُ الرَّحمٰن'' کے حواشی میں وہ تمام چیزیں درج کر دی ہیں، جو اُن کی دعوتِ تجدید میں اَساس کا حکم رکھتی تھیں۔

سب سے پہلی بات جس کی طرف شاہ صاحبؒ نے توجہ دلائی کہ (خلافتِ باطنہ پر مبنی) اسلام کی حکومت مکہ میں ہی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ اپنی جگہ مستقل حکومت تھی۔ گو اس زمانے میں ابھی تشدد اور لڑائی کی اجازت نہیں ملی تھی۔

سورت الرعد کے آخری فائدے میں اس آیت

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِى الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ (71)

(کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے)

کی وضاحت فرماتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''یعنی روز بہ روز شوکتِ اسلام بہ زمینِ عرب منتشر مے شود۔ و دار الحرب ناقص مے گردد و از اطرافِ آں۔ عامۂ مفسرین آیت را مدنیہ دانند، و نزدیکِ مترجم لازم نیست کہ مدنی باشد۔ مراد از نقصانِ دار الحرب اسلامِ اسلم، و غفار، و جُہینہ، و مزینہ، و قبائل ایں است پیش از ہجرت۔'' (72)

(یعنی دن بہ دن اسلام کی شوکت عرب کی سرزمین پر پھیلتی جا رہی ہے۔ دارالحرب اور اُس کے اطراف کا دائرہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ عام مفسرین اس آیت کو مدنی آیت سمجھتے ہیں۔ مترجم کے نزدیک یہ لازمی نہیں ہے کہ یہ آیت

www.rahmia.org

مدنی ہو۔ (یہ آیت مکی ہے۔) دارالحرب کے علاقے کم ہونے سے مراد یہ ہے کہ قبیلہ بنواسلم، قبیلہ غفار، جُہینہ اور مزینہ وغیرہ قبائل ہیں، جو ہجرتِ مدینہ سے پہلے اسلام لے آئے تھے۔)

الغرض! شاہ صاحبؒ کے نزدیک مکہ میں اسلام کی حکومت بن چکی تھی، گو اصولاً یہ عدمِ تشدد پر عمل کرتی تھی۔

شاہ صاحبؒ نے اسی نظامِ مکی کی تقلید میں اپنی انقلابی تحریک کو چلایا۔ چناں چہ انھوں نے تصوف کے خاص طریقے کی بیعت کو اپنے سیاسی نظام کی اساس بنایا۔ دوسرے لفظوں میں طریقت کی بیعت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والے نے جماعت کا سیاسی نظام تسلیم کرلیا ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ ان کی سیاست میں تصوف کو اتنا بلند دینی درجہ دیا گیا۔

بات یہ ہے کہ جب تک حکومت کو چلانے کی استعداد پیدا نہ ہو، کوئی شخص لڑ کر نیا نظامِ حکومت قائم نہیں کرسکتا۔ بے شک وہ لڑائی کے ذریعے پچھلی حکومت کو تباہ تو کرسکتا ہے، لیکن جب تک تربیت یافتہ آدمی اسے میسر نہ آئیں، وہ نئی حکومت چلا نہیں سکتا۔ اس قسم کی تربیت اور استعداد صرف عدمِ تشدد کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ چناں چہ ہر نئی تحریک کو شروع میں اپنا پیغام دوسروں کو سنانے اور ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے عدمِ تشدد پر لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اسی اُصول پر اپنی جماعت تیار کرنا شروع کی۔ چناں چہ وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بعد ان کے جانشین شاہ عبدالعزیزؒ نے نظامِ حکومت چلانے کے لیے آدمی بھی تیار کردیے۔ بے شک اس زمانے میں ایسے باخبر لوگ موجود تھے، جنھیں اس انقلابی تحریک کا احساس ہوا۔ انھوں نے عوام میں شورش پھیلا کر مسجد فتح پوری سے نکلتے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر حملہ کرا دیا۔ (73)

امام ولی اللہؒ نے اپنے اس فکر کی اشاعت اور تعلیم کی غرض سے بیسیوں کتابیں لکھیں، جو کہ سب دہلی کی علمی زبان ''عربی'' اور عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان یعنی ''فارسی'' میں تھیں۔ ان کتابوں میں شاہ صاحبؒ نے اپنی دعوت کے اُصول اور مسائل ضبط کر دیے، لیکن اس معاملے میں اتنا التزام فرمایا کہ ان امور کو ایک جگہ قلم بند نہ کیا، بلکہ ان کو اپنی

تصانیف میں اِدھر اُدھر پھیلا کر بیان کر دیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نا اہل لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ بہ حیثیت بین الاقوامی مفکر و عظیم الشان حکیم

شاہ صاحبؒ کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ امام ولی اللہؒ کی حیثیت اُمتِ محمدیہؐ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے۔ اس طرزِ فکر کے اربابِ کمال، انبیا علیہم السلام کی طرح تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں۔ گو بہ ظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لیے ہوتی ہے۔

امام ولی اللہؒ کی کتابیں غور سے پڑھی جائیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان کی زبان اگرچہ دہلی کی زبان ہے، لیکن ان کے مخاطب دہلی کے اعلیٰ طبقے کے توسط سے ایک طرف یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کی عربی و عجمی قومیں ہیں تو دوسری طرف یونان، ایران اور ہند کی صابی (آرین) قومیں بھی مساوی درجے پر خطاب میں شریک ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا رُوئے سخن دراصل تمام انسانیت کی طرف تھا۔ چناں چہ اپنی کتاب ''اَلْبُدُوْرُ الْبَازِغَۃ'' میں ارتفاقات (اجتماعی اداروں) کے ذیل میں فرماتے ہیں:

> ''ہم نے یہاں ان اِرتفاقات (اجتماعی اداروں) کے احکام اور ان سے متعلقہ علوم کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے، لیکن اس معاملے میں دو باتیں ضرور پیشِ نظر رہنی چاہئیں:
>
> (ا) ایک تو یہ کہ ہم ارتفاقات کی وضاحت کے سلسلے میں عموماً ایک معین مثال کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس سے ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا، بلکہ یہ یا اس جیسی کوئی اَور، یا اس کے لگ بھگ کوئی دوسری صورت بھی ہوسکتی ہے۔
>
> ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ وہ عمومی قواعد جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ان پر اجتماعی ادارے پورے اُتریں۔ ظاہر ہے یہ ادارے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک سے نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ ہر قوم کی اپنی خاص عادتیں اور اپنے مخصوص علوم ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ یہ ادارے عمومی قواعد (بنیادی اصول) کے مطابق ہوں، خواہ ظاہری شکل وصورت میں یہ ایک

دوسرے سے جدا جدا ہی ہوں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انسان خود اپنی جبلت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے ارتفاق (اپنی جبلت کے مطابق سہولیات کے نظام) کی تشکیل کرے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔ دوسرے درجے میں تجربی علوم اور صحیح اَخلاق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔" (74)

اس سے زیادہ تفصیل "اَلْبُدُوْرُ الْبَازِغَۃ" میں تیسرے مقالے کے شروع میں ہے۔

چناں چہ ارشاد ہوتا ہے:

"تمھیں جاننا چاہیے کہ وہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظامِ تمدن کی عمارت کھڑی ہے اور کُل کے کُل اقترابات (خدا تک پہنچنے کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کیے گئے ہیں مثلاً احسان، عبادت اور بُرائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ، یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے قواعدِ کلیہ یعنی بنیادی اُصول تو ایک ہیں، لیکن ان کی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔

ان میں سے ہم مثال کے طور پر نکاح کو لیتے ہیں:

(۱) جس نے نکاح کے معاملے میں اعلان ڈھول بجانے اور غنا (گانا) پر اکتفا کیا (جیسا کہ ہندو تمدن میں ہے)، تو اس نے حق واجب ادا کر دیا۔

(۲) اسی طرح جس نے نکاح کے لیے گواہ اور ایجاب وقبول کو ضروری ٹھہرایا، اس نے بھی نکاح کا فرض پورا کر دیا۔ کیوں کہ نکاح کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ ایک عورت کا اس طرح تعین کر دیا جائے کہ اس میں ایک مرد کے سوا کوئی دوسرا دخیل نہ ہو سکے۔

اُوپر کی ہر دو صورتوں میں حاصلِ مراد یہی ہے۔ یہی حال تقرُّب إلٰی اللّٰہ (کی صورتوں) کا ہے:

(۱) کبھی تو اس منزل تک انسان یوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی خواص کا جامہ

(لباس) اُتار کر خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کر دے۔

(۲) تقرُّب إلیٰ اللّٰہ کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضا و جوارح کی صحیح تربیت کی جائے۔ اور انسانی خواص کے دائرے میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرُّب چاہا جائے۔

اسی پر ان تمام بڑے بڑے مسائل کو قیاس کرلو، جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلے میں ہم نے بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی شکلیں اور صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

اس سے پہلے ملتِ حنفی کے نقطۂ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں پیش کر آئے ہیں۔ تم کہیں ان کی وجہ سے غلطی میں نہ پڑ جانا۔ ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا۔ اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا کوئی اَور مقصد نہ تھا۔ پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت صرف ارتفاقات اور اقترابات کی ان بیان کردہ شکلوں تک محدود ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اس معاملے میں اصل حقیقت کا تعلق ہے، کوئی ملت یا مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کا اعتراف نہ کرے۔ ہاں! یہ اَور بات ہے کہ وہ اس کے احکام کو بجا نہ لائے۔ جھگڑا اصل حقیقت کے معاملے میں نہیں ہوتا۔ نزاع اور اختلافات اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے پر پیدا ہوتے ہیں۔" (75)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ امام ولی اللہؒ کی تصانیف میں جس قدر قواعدِ کلیہ مذکور ہیں، وہ دراصل اُن کے فلسفے کے بنیادی اُصول ہیں اور انسانیتِ عامہ کو اسی کی دعوت دی گئی ہے۔ اس ضمن میں جس قدر مسائل بیان کیے گئے ہیں، وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں۔ ان عمومی قواعد کو ان مخصوص مثالوں میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیے۔

انسانیت کی اس اساسِ فکر پر جس کی دعوت شاہ صاحبؒ دیتے ہیں، دین دار اقوام کے عقل مند افراد ایک بین الاقوامی نقطۂ وحدت پر جمع ہو سکتے ہیں۔ قرآن عظیم کے خصوصی قانون نے اسی بین الاقوامی سپرٹ (جذبے) کو صحیح اُصول پر محفوظ کر دیا ہے۔

مقالہ 8

قرآنِ حکیم کی انقلابی تاثیر

(قرآنی تعلیمات کی تاثیر کا ولی اللّٰہی نظریہ)

www.rahimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

''ہم میں سے نیک بخت ترین انسان وہ ہے، جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرے۔ ہم میں سے بد بخت ترین انسان وہ ہے کہ جو ان کی اتباع کے راستے سے روگردانی کرے۔...

امّــا بعــد! ہر زمانے اور ہر ایک علاقے میں مسلمانوں کی خیر خواہی اور بھلائی کا کام ایک نیا رنگ لیے ہوتا ہے۔ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اسی لیے علمائے دین اور اہل یقین کے بڑے بڑے لوگ تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ، سلوک، وغیرہ میں مختلف نوعیت کی تصانیف لکھتے رہے ہیں، اور کئی طرح کی تالیفات مرتب کرتے رہے ہیں۔...

آج ہم جس زمانے میں ہیں اور جس ملک (برصغیر ہندوستان) میں ہم رہتے ہیں، مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن حکیم کا ترجمہ سلیس فارسی زبان میں روز مرہ محاورے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے، جس کی عبارت ہر قسم کے تصنّع اور بناوٹ اور علمی نمود و نمائش سے پاک ہو۔ اس میں قصص و واقعات اور غیر ضروری توجیہات وتشریحات بیان نہ کی جائیں۔ تاکہ عوام وخواص یکساں طور پر اس کو سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے ایک ہی نہج پر اس کا شعور و اِدراک حاصل کریں۔ اس لیے اس فقیر کے دل میں اس اہم ترین کام کو سرانجام دینے کا داعیہ (اللہ کی جانب سے) پیدا کیا گیا اور ہر حالت میں یہ کام کرنے کی بات اس کے دل و دماغ میں بیٹھ گئی۔''(76)

قرآنِ حکیم کی انقلابی تاثیر

(قرآنی تعلیمات کی تاثیر کا ولی اللّٰہی نظریہ)

ہمارے اہلِ علم، حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کی تصانیف اگر غور سے پڑھیں تو ان پر (قرآنی تعلیمات کی تاثیر سے متعلق) شاہ صاحبؒ کے مخصوص نظریات واضح ہو جائیں گے۔ شاہ صاحبؒ کے وہ افکار جو پہلی ہی نظر میں ان کی تصانیف میں سے آشکار ہو جاتے ہیں، ہم ان میں سے نمونے کے طور پر پانچ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

[1] قرآن بہ حیثیتِ داعیٔ انقلاب

قرآن عظیم ایک انقلاب آفرین نظام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انقلاب آفریں نظام بین الاقوامی ہے اور ساری انسانیت پر محیط ہے۔ رہتی دنیا تک جب بھی مسلمانوں کی کوئی جماعت اس پر عمل کرے گی تو اس سے وہی نتائج پیدا ہوں گے، جو تاریخ اسلام کے دورِ اوّل میں دنیا نے دیکھے۔ یہ قرآن کی تاثیر ہے۔ محض کسی آدمی یا زمانے کی تخصیص صحیح نہیں ہے۔

مسیحی دنیا قرآن کی اس تاثیر کو عام نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے برابر کوشاں رہتی ہے۔ مشہور عیسائی مؤرخ اور مصنف ''جُرجی زیدان'' (1861ء - 1914ء) نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ:

> ''حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا نظام محض بخت و اتفاق کا نتیجہ تھا۔''(77)

یعنی اس کے بہ قول عہدِ گزشتہ میں اسلام کے عظیم الشان انقلاب کا باعث قرآن کی تعلیمات نہ تھیں، بلکہ اتفاق سے چند افراد ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے ایک بار ایسا کر دکھایا، لیکن یہ کہ ہمیشہ یوں ہو، غلط ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کے دُور رَس اِنقلابی اثرات کو زائل کرنے کے لیے اَور بھی حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔

زمانۂ حال میں مروّجہ مجالس ہائے سیرت کا نظام اسی قسم کا ایک خواب آور نشہ ہے، جو مسلم عوام کو پلایا جا رہا ہے۔ تحریک چلانے والے یہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، مگر جن لوگوں نے ان کو یہ لقمہ دیا ہے، ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دماغوں میں یہ خیال جمالیں کہ اسلام کی تمام اثر آفرینی قرآن کے بجائے صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شخصیت میں مضمر ہے۔ اگر آئندہ بھی کوئی ایسی شخصیت بروئے کار آ گئی تو ممکن ہے یہ اثر دوبارہ پیدا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انتظارِ مہدی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔

[2] خیر القرون کی اجتماعی تحریک بہ طورِ تفسیرِ قرآن

قرآن کی تعلیمات کے اثر سے مسلمانوں میں جو اجتماعی تحریک عالَم وجود میں آئی، وہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے شروع ہو کر حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت تک مُنزَّہ (پاک صاف) اور اپنی اصلی حالت میں جاری رہی۔ قرآن حکیم کی عملی تفسیر کے طور پر اس اِجتماعی تحریک کو جاننا ضروری ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظّمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ اسی شہر میں اسلام کی اجتماعی تحریک نے ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کی۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور (۳۵ھ/ 656ء) میں مدینہ ہی اسلام کی تحریک کا مرکز اور مصدر بنا رہا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور حضرت علیؓ نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو اپنا سیاسی مرکز بنایا، ان کے بعد اُمویوں نے دمشق میں اپنا دارُالخلافت منتقل کرلیا تو پھر بھی اسلام کی دینی اور فکری

مرکزیت مدینہ ہی میں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کے اثر و تاثیر سے جو نظامِ اجتماعی معرضِ وجود میں آیا، اس کے اساس و مبادی اور تعلیمات' اہلِ مدینہ کے ہاں محفوظ رہیں۔ بعد میں ان کو امام مالکؒ (711ء-795ء) نے اپنی کتاب ''مؤطا'' میں مدون کر دیا۔

[3] غلبۂ دین کا نظریہ

قرآن حکیم نے اس آیت:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٩﴾ (78)

(اللہ وہ ذات ہے، جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین اسے ناپسند کریں۔)

میں تمام ادیان پر جس غلبے کا دعویٰ کیا ہے، وہ خلافتِ راشدہ کے اس دورِ اوّل میں پورا ہو چکا ہے۔ یہ خیال کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، صحیح نہیں۔ اس کے لیے کسی نبی یا ولی کا انتظار غلط ہے۔ (چناں چہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے غلبۂ دین سے متعلق عام مفسرین کے بارے میں لکھا ہے:

''عامۂ مفسرین در تفسیر ایں آیہ فرو مانند، قال الضّحّاک: و ذٰلک عند نزول عیسٰی علیه السّلام.'' و قال الحسن بن الفضل: ''لیظهر علی الدّین کلّهٖ بالحُجج الواضحة.'' (79)

(عام مفسرین اس آیت کی تفسیر میں عاجز ہو گئے ہیں۔ ضحاک کہتے ہیں کہ: ''یہ غلبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے زمانے میں ہوگا۔'' حسن بن فضل کہتے ہیں: ''غلبۂ دین واضح دلائل کی صورت میں ہوگا۔'')

اس کے بعد شاہ صاحبؒ تفصیلی دلائل دے کر اس آیت کا اصلی مطلب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''توجیہ صحیح دریں آیت آں است کہ ہر ظہوریکہ دینِ حق را حاصل شد، ہمہ

در کلمہ **لیظھرهٗ علی الدّین کلہ** مندرج است، و اعظمِ انواع آں کہ برہم زدنِ دولتِ کسریٰ و قیصر است بالا ولیٰ داخل در اوست۔ و حامل لوائے ایں مرتبہ خلفا بودند رضی اللہ عنہم۔ مساعیٔ ایں بزرگواراں مقتضائے ارسالِ آں حضرت ﷺ بود۔'' (80)

(اس آیت کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ دینِ حق کا ہر طرح کا حاصل کیا ہوا غلبہ، ''**لیظھرهٗ علی الدّین کلّہ**'' میں شامل ہے۔ اس غلبے کی تمام اقسام میں اعلیٰ درجے کی قسم قیصر اور کسریٰ کی حکومتوں کا درہم برہم ہونا ہے۔ یہ بہ درجۂ اولیٰ غلبۂ دین میں داخل ہے۔ اس مرتبے کے علم بردار خلفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ ان بزرگوں کی کوششیں آں حضرت ﷺ کی رسالت کے تقاضوں میں شامل ہیں۔)

[4] انسانیت کے بنیادی چار اَخلاق

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ انسانیت کی دنیا اور آخرت کی فلاح کا سارا دارومدار اِن چار بنیادی اَخلاق کو قرار دیتے ہیں:

(۱) طہارت (پاکیزگی)

(۲) اِخبات (اعلیٰ و برتر ذاتِ خداوندی کے حضور میں خشوع و خضوع)

(۳) سماحت (ضبطِ نفس)

(۴) عدالت

ان چار اَخلاق میں مرکزی حیثیت عدالت کو حاصل ہے۔ کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف قائم نہیں ہوسکتا، جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے **اِحترازِ کُلّی** (مکمل طور پر پرہیز) نہ برتا جائے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں کسریٰ و قیصر نے متمدن دنیا کے اکثر حصے کو اقتصادی پریشانی میں مبتلا کر کے اَخلاق سے محروم کر دیا تھا۔ اس لیے قرآن عظیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ کسریٰ و قیصر

کا زور توڑ کر ایسا نظام نافذ کر دیا جائے، جس سے اقوامِ عالم کو اس مصیبت سے نجات حاصل ہو۔

[5] عربِ اوّل کی سیرت بہ طورِ معیارِ عمل

قرآنِ عظیم کی اس انقلابی دعوت کو زندہ کرنے کا ارادہ جب کسی مسلم سوسائٹی میں پیدا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرفائے قریش کے وہ خاندان جو مہاجرینِ اوّلین ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں، وہ ان کی ذہنیت، ان کی معاشی حالت اور ان کی معاشرتی سیرت کو اپنا امام بنائیں۔

مسلمانوں میں اس انقلابی رُوح کو پیدا کرنے کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ عربی زبان اور عربِ اُول کی سیرت کو ایک معیار قرار دیتے ہیں، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر سُفہائے عرب (عربوں کے بے وقوف) جاہلیتِ عرب کو زندہ کر رہے ہوں، تو اس صورت میں بھی ان کی تقلید کی جائے۔

(چناں چہ شاہ صاحبؒ نے اپنے احباب اور اولاد کو یہ وصیت کی ہے:

> ''بہ قدرِ اِمکان عادات و رسومِ عربِ اُول کہ منشائے آں حضرت ﷺ از دست نہ دہیم، و رسومِ عجم و عاداتِ ہنود (کہ چوں شوہر زنے بہ میرد نہ گزارند کہ آں زن شوہر دیگر کند) را درمیانِ خود نہ گزاریم۔''(81)
>
> (ہر ممکن حد تک پہلے عربوں کی رسومات اور عادات کو ہاتھ سے مت جانے دو کہ وہ آں حضرت ﷺ کی منشائے مبارک ہے۔ عجمیوں کی رسومات اور ہندوؤں کی عادات (جیسا کہ کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو اُس عورت کو ستی کر دیتے ہیں) کو اپنے درمیان پیدا نہ ہونے دیں۔)

امام ولی اللہؒ کے اس چوتھے اُصول کو کہ:

> ''کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احترازِ کُلّی نہ برتا

جائے۔ [82]

ہم اس وقت تک نہیں مکمل طور پر سمجھ سکے، جب تک ہم نے یورپ میں جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کر لیا۔ جن رُفقا نے ہمیں اس مطالعے میں مدد دی، وہ عموماً کارل مارکس کے متبع تھے۔ اس کے احترام میں ہمارے یہ رفقا اس قدر مبالغہ کرتے کہ ہمیں سخت تکلیف ہوتی۔ اس احترام اور فضیلت کا دارومدار کارل مارکس کے اِقتصادی نظام کو بتاتے تھے۔

ہم حیران رہ گئے جب اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصے ہم نے امام ولی اللہ (دہلویؒ) کی تصانیف میں، جو کارل مارکس سے بہت پہلے گزرے ہیں، نہایت بسط سے مدوّن پائے۔ امام ولی اللہؒ 1763ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس 1818ء میں پیدا ہوا۔

☆

مقالہ 9

قرآنی حکمتِ عملی

www.rahimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

''وحکمتِ عملی کہ صلاحِ ایں دورہ درآں است بہ وسعتِ تمام افادہ نمودند و توفیقِ تشییدِ آں بہ کتاب وسنت وآثارِ صحابہؓ دادند۔ و برتمیز آں چہ علمِ دین است منقول از حضرت پیغمبر ﷺ، وآں چہ مدخول است، وآں چہ سنت است، و آں چہ ہرفرقہ بدعت کردہ است افادہ ساختند۔''(83)

(حکمتِ عملی جس پر اس عہد میں خیر و برکت کا انحصار ہے، کارسازِ قدرت نے مجھے اس کا وافر حصہ عطا فرمایا اور اس امر کی توفیق دی کہ میں کتاب وسنت اور صحابہؓ کے آثار کی روشنی میں حکمتِ عملی کے اُصول وضوابط مدون کردوں۔ اور اس بارے میں امتیاز پیدا کروں کہ حضورؐ سے منقول شدہ علم کیا ہے اور بعد میں داخل کیا ہوا علم کون سا ہے۔ پھر ان میں سنت کون سا ہے اور ہر فرقے نے اس میں نئی بدعت کیا پیدا کی ہے۔)

قرآنی حکمتِ عملی

شاہ ولی اللہؒ کے والدِ محترم شاہ عبدالرحیم صاحب دہلویؒ کا یہ رُجحانِ فکر کہ وہ حکمتِ عملی سکھانے پر خاص زور دیتے تھے، غیر معمولی طور پر قابلِ احترام ہے۔ (انھوں نے اپنے صاحبزادے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اس حکمتِ عملی سکھانے میں خصوصی توجہ برتی۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کا ذکر ''انفاس العارفین'' اور (اپنی خود نوشت حالاتِ زندگی) ''جزوِ لطیف'' میں خاص طور پر کیا ہے۔)

ارسطو کی حکمتِ نظری اور متکلمین پر اس کے اثرات

اس وقت حالت یہ تھی کہ عام متکلمین نے (یونانی فلسفی) ارسطو کی نظری حکمت کو اپنا مطمح نظر (مقصود) بنالیا تھا اور ان کا سارا زور قیاس آرائیوں اور استدلالی بحثوں پر صَرف ہوتا تھا۔ وہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے بے خبر تھے اور حکمتِ عملی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 'علمِ کلام' میں دلچسپی لینے والے فقہا و متکلمین قومی (اجتماعی) زندگی کی ضروریات میں تدبر اور تفکر (غور و خوض) سے محروم ہو گئے۔

شاہ عبدالرحیم دہلویؒ اور حکمتِ عملی و عقلِ معاشی

شاہ ولی اللہؒ اپنے والد بزرگوار کے مذکورہ بالا رُجحانِ فکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرتِ ایشاں بہ اَخلاقِ سلیمہ مرضیہ؛ از شجاعت، و فراست، و کفایت، و غیرت بوجہِ اتم متصف بودند۔ و عقلِ معاش مثلِ عقلِ معاد کامل و وافر داشتند۔''(84)

(حضرت (والدِ ماجد) شجاعت، فراست، کفایت، غیرت وغیرہ پسندیدہ

اَخلاقِ سلیمہ میں درجۂ کمال پر تھے۔ نیز دینی اور اُخروی علوم میں فہمِ کامل رکھنے کے ساتھ آپؒ ''عقلِ معاش'' سے بھی — جس کے ذریعے انسان زندگی کی معاشی اور اجتماعی ضرورتوں کو سمجھتا ہے — پورے طور پر بہرہ ور تھے۔)

آپؒ اپنی مجلس میں اکثر حکمتِ عملی اور کاروبارِ زندگی کے معاملات کے آداب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایں فقیر را در مجلسِ صحبت حکمتِ عملی و آدابِ معاملہ بسیارے آموختند۔''(85)

(اس فقیر نے اپنے والدِ گرامی کی مجلسِ صحبت سے حکمتِ عملی اور معاملات سے متعلق بہت سے آداب سیکھے ہیں۔)

شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے حکمتِ عملی پر مبنی چند اقوال

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''انفاس العارفین'' میں اپنے والدِ گرامی شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے حالات لکھتے ہوئے حکمتِ عملی سے متعلق ان کے چند اقوال نقل کیے ہیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''حکمتِ عملی سے متعلق والدِ گرامیؒ کے چند اقوال جو میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

1۔ جمہور انسانوں کے لیے کام کرنا

تمھارے ہر کام کا مقصد جمہور انسانوں کے درمیان پیار و محبت، ایک دوسرے سے موافقت اور اجتماعی مصلحت ہونا چاہیے۔

2۔ عقل مندوں کا طریقۂ زندگی

اہلِ عقل اور اربابِ حکمت کے نزدیک انسان کو ضروریاتِ زندگی کے استعمال میں صرف لذت اندوزی مقصود نہ ہو، بلکہ زندگی کی سب نعمتیں:

(الف) کسی ضرورت کو پورا کرنے،

(ب) کسی مرتبے اور فضیلت کو حاصل کرنے

(ج) اور کسی سنت کو ادا کرنے کے ارادے سے حاصل کرنی چاہئیں۔

3۔ عام مجلس میں گفتگو میں احتیاط کرنا

عام مجلس میں جمہور عوام کے خلاف (براہِ راست) کوئی بات زبان پر نہیں لانی چاہیے، اگر چہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اُس کو ناپسند کریں اور مجلس بدمزہ ہو جائے۔

4۔ کسی پوری قوم کی بُرائی نہ کرنا

عام مجلس میں کسی قوم کا نام لے کر اُس کی بُرائی مت کرو۔ یہ نہ کہو کہ پُورب (مشرق) والے ایسے ہیں اور پنجابی ایسے ہیں۔ افغان ایسے ہیں اور مغل ایسے۔ ہوسکتا ہے کہ اس مجلس میں اُس قوم کا کوئی مردِ میدان بیٹھا ہو، یا اس علاقے کا کوئی باحمیت آدمی ہو۔ وہ اُسے بُرا سمجھے اور اہلِ مجلس کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے۔

5۔ اولوالعزم لوگوں کا طریقہ اختیار کرنا

آدمی کو اپنی بول چال، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے میں اولوالعزم اور طاقت ور لوگوں کی سی طرز و عادت کو اختیار کرنا چاہیے، اگر چہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔" (86)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حکمتِ عملی

یہ تھی فکری بنیاد جو شاہ ولی اللہؒ کو اپنے والدِ گرامی شاہ عبدالرحیم دہلویؒ سے اس ضمن میں ورثے میں ملی۔ آپؒ نے اس پر ایک عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ چناں چہ شاہ ولی اللہؒ اپنے حالات میں انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"وحکمتِ عملی کہ صلاحِ ایں دورہ در آں است بہ وسعتِ تمام افادہ نمودند و توفیقِ تشییدِ آں بہ کتاب وسنت و آثارِ صحابہؓ دادند۔ و بر تمیز آں چہ علمِ دین است منقول از حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، و آں چہ مدخول است، و آں چہ سنت است، و آں چہ ہر فرقہ بدعت کردہ است افادہ ساختند۔" (87)

(حکمتِ عملی جس پر اس عہد میں خیر و برکت کا انحصار ہے، کارسازِ قدرت نے مجھے اس کا وافر حصہ عطا فرمایا اور اس امر کی توفیق دی کہ میں کتاب وسنت اور صحابہؓ کے آثار کی روشنی میں حکمتِ عملی کے اُصول وضوابط مدون کر دوں۔ اور اس بارے میں امتیاز پیدا کروں کہ حضورؐ سے منقول شدہ علم کیا ہے اور بعد میں داخل کیا ہوا علم کون سا ہے۔ پھر ان میں سنت کون سا ہے اور ہر فرقے نے اس میں نئی بدعت کیا پیدا کی ہے۔)

شاہ ولی اللہؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس میں ایک امتیازی وصف یہ بھی نظر آتا ہے کہ جہاں وہ رفاہِ عام کے اداروں یعنی ''ارتفاقات'' کا ذکر کرتے ہیں، وہاں حکمتِ عملی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تمام احادیث کو انھی ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ پھر خاص خاص موقعوں پر حدیث کے ذیل میں حکمتِ عملی کا کوئی نہ کوئی نکتہ ذکر کرتے جاتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی جملہ تصانیف میں آپ دیکھیں گے کہ سب سے پہلے وہ عبادات کے چار ابتدائی ارکان (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ حکمتِ عملی کے اصولوں پر اپنے موضوع اور مطالب کو مختلف ابواب پر ترتیب دیتے ہیں۔

(مثلاً نماز کی جماعت اور اذان وغیرہ سے متعلق احادیث کو سیاسی حکمتِ عملی کے تناظر میں سمجھاتے ہوئے شاہ صاحبؒ ''حُجّة اللّٰه البالغه'' میں لکھتے ہیں کہ:

''نیکی کے کاموں میں نماز ایک عظیم ترین عبادت ہے۔ اس لیے نبی اکرمؐ نے اُسے جماعت کے ساتھ ادا کرنے پر اُبھارا۔ اس سے نماز کی ادائیگی میں سہولت ملتی ہے۔ اسی طرح نماز کے لیے اذان دینے کا حکم دیا گیا، تاکہ ایک وقت اور ایک جگہ میں مسلمانوں کی اجتماعیت قائم ہو سکے۔ نیز (احادیث میں) مسجدیں بنانے، اُن کی صفائی ستھرائی اور خوشبو لگانے پر اُبھارا گیا۔'' [88]

نماز سے متعلق ان احادیث کا مطلب سمجھانے کے لیے شاہ صاحبؒ نے سیاسی

حکمتِ عملی کی ایک مثال دیتے ہوئے تحریر فرمایا:

"و نظیرۂ من سیاسۃ المدینۃ أنّھم لمّا رأوا فی الرّمی منفعۃً عظیمۃً اُمروا بالإکثار من اصطناع القسیّ و النّبل و التّجارۃ فیھا." (89)

(اس کی نظیر ملکی سیاست میں یہ ہے کہ جب حکمران تیراندازی سیکھنے میں ملک اور قوم کا عظیم فائدہ دیکھتے ہیں تو لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ تیر کمان بڑی کثرت سے تیار کریں اور اُس کی خرید و فروخت بڑھائیں۔)

اسی طرح شاہ صاحبؒ فتنے کے زمانے میں ایک شرعی حکم کو حکمتِ عملی کے اصول پر سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"و لمّا کان القتال فی الفتنۃ إثماً، وجب أن یُّنھیٰ عن بیع السّلاح فی وقت الفتنۃ. و نظیر ھٰذا الباب من سیاسۃ المدینۃ: ... لمّا اطّلعوا علیٰ خیانۃ قوم اشترطوا علیھم أن لاَّ یرکبوا الخیل، و لا یحملوا السّلاح." (90)

(فتنے کے زمانے میں قتل و غارت گری کا ہونا ایک جرم اور "اِثم" قرار پایا تو شرعی طور پر فتنے کے زمانے میں ہتھیاروں کی خرید و فروخت کو مکروہ قرار دیا گیا اور اُس سے روک دیا گیا۔

اس کی مثال ملکی سیاست کے حوالے سے یہ ہے کہ جب حکمرانوں کو کسی قوم سے ملک کے خلاف بغاوت اور خیانت کا پتہ چلتا ہے تو اُن پر گھوڑے کی سواری اور ہتھیار اٹھا کر چلنے پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔)

شاہ صاحبؒ کے نظریۂ حُسن و قُبح (برّ و اِثم) کی اہمیت

ہمارے نزدیک دین اور دنیا دونوں کو اس نظر سے دیکھنے اور زندگی میں حکمتِ عملی کی غیر معمولی اہمیت کے احساس ہی کا نتیجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ حُسن و قُبح یعنی "بِرّ" (نیکی) اور

''اِثـــم'' (گناہ) کی حقیقت کو لفظی گورکھ دھندوں سے الگ کر کے ہر طالبِ حق کے لیے صاف اور واضح طور پر پیش کر سکے۔ حسن و قُبح (اچھائی، بُرائی) کے معاملے میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''کسی چیز کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نوعی خواص (حقیقی خوبیاں) اس میں بہ درجۂ کمال پائے جاتے ہوں۔ مثلاً ایک گدھے کو ہم اچھا کہیں گے تو مطلب یہ ہے کہ بہ حیثیت ایک گدھا ہونے کے جو لوازم ضروری ہیں، وہ اس میں پورے موجود ہوں۔ یہ نہیں کہ وہ مثلاً ایک انسان سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اگر ہم ایک پودے کو یا ایک انسانی جماعت کو اچھا کہیں گے تو اس کے نوعی خواص کے اعتبار سے اس کو جانچیں گے اور اس کی حیثیت کا تعین کریں گے۔ چناں چہ ایک انسان کو اچھا کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں انسانیت کے نوعی خواص ایک حدِ کمال تک پائے جاتے ہیں۔ اب جوں جوں کسی شخص میں یہ اَوصاف کم درجے کے ہوں گے، اسی حساب سے اس کی اچھائی میں نقص پیدا ہوتا چلا جائے گا۔'' (91)

لیکن یہ سوال کہ آخر انسانیت کے اوصاف کیا ہیں؟

اس کا جواب ایک ماہرِ حکمت کے نزدیک یہ ہوگا کہ تمام قوموں اور نسلوں کا جائزہ لو اور ان میں جو اچھے اوصاف مشترک پائے جاتے ہیں، ان پر انسانیت کا مصداق ہوگا۔

یہ ہے وہ معیار، جس پر آپ ہر انسان اور ہر گروہِ انسانی کو پَرکھ سکتے ہیں۔ چناں چہ اچھائی اور برائی یا حسن و قبح کو اس طرح متعین کرنے میں خیال سے زیادہ عمل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ حکمتِ عملی کو اساسی فکر ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔

''حُـجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کو پڑھ کر دیکھیے تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کسی عمل کی، کسی خُلق کی اور کسی عقیدے کی خوبی اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ وہ عام افراد میں یعنی مشرق و مغرب اور عجم و عرب میں پایا جاتا ہے۔

www.rahimia.org

(جیسا کہ ارتفاقات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

"و كذٰلك الارتفاقات الّتی أجمع عليها طوائف النّاس من عربهم و عجمهم، و أقاصيهم و أدانيهم، فإنّها كالأمر الطّبيعی."(92)

(اسی طرح ارتفاقات پر تمام عرب وعجم، دور اور نزدیک کی تمام جماعتوں کا اِجماع اور اتفاق ہے، گویا کہ یہ انسانیت کا طبعی تقاضا ہیں۔)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا یہ فکر، معدنِ حکمت (دانائی کے سرچشمے) کا ایک نفیس جوہر ہے، جس سے عام مصنّفین کی کتابیں خالی نظر آئیں گی۔ دوسرے علما کی کتابیں پڑھ کر انسان حسن و قبح کے معاملے میں کسی واضح حقیقت کا تعین نہیں کر پاتا۔ ہاں! اس سلسلے میں وہ خیالی فلسفہ گھڑنے میں ضرور کمال حاصل کر لیتا ہے۔

الغرض! شاہ صاحبؒ کے اس اجتماعی فکر کے طفیل طالبِ علم حسن و قبح کے بارے میں خیالی فلسفہ طرازیوں کی دلدلوں سے بڑی آسانی سے نکل سکتا ہے۔ اور وہ ان قیاس آرائیوں کے بجائے عملی زندگی میں "حُسن" (البِرّ) کی تخلیق اور "قُبح" (الإثم) کے مٹانے میں سرگرمِ عمل ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔

چناں چہ سب سے پہلے وہ اپنے گھر کا نظام ٹھیک طور پر چلائے گا۔ پھر گھر سے محلے اور محلے سے شہر اور شہر سے اپنے ملک کے نظم و نسق میں مصروف ہو سکے گا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اسی اجتماعی فکر کے ذریعے ایک عالم یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کے پیشِ نظر ایک فرد کو "بِــرّ" یعنی نیکی کا حکم دینے اور "إثــم" یعنی بدی سے روکنے، یا دوسرے لفظوں میں "حُسن" کی ترغیب اور "قبح" سے بچنے کی تعلیم سے دراصل مقصد یہ تھا کہ قرآن کے عالم گیر انقلاب کے نظریے پر درجِ ذیل امور کو پیشِ نظر رکھے:

(۱) ذاتی انقلاب: یہ فرد سب سے پہلے اپنی زندگی کو سنوارے۔ اس میں ذاتی انقلاب کے نظریے کا حسن پیدا کرے۔

(۲) جماعت کی تیاری کرتے ہوئے اپنے گھر کو ٹھیک کرے۔ گھر سے محلے کی اصلاح

کی طرف متوجہ ہو۔

(۳) قومی انقلاب کے نظریے پر محلے سے شہر اور شہر سے اپنے ملک کے بارے میں حسن پیدا کرنے کے لیے کام کرے۔

(۴) بین الاقوامی انقلاب: اور اپنے ملک سے تمام انسانیت اور کل دنیا کی اصلاح اور بہتری کا عزم کرے۔

شاہ صاحبؒ کا یہ اُصولِ اجتماعی پیشِ نظر رہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام دراصل ایک عالم گیر انقلاب کی دعوت ہے۔ قرآن عظیم اسی دعوت کا ترجمان ہے۔ قرآن اِن معنوں میں اپنی تشریح آپ ہے۔ وہ اس لحاظ سے کسی تکمیل اور تشریح کا محتاج نہیں۔

شاہ صاحبؒ کی حکمت و فلسفے کا یہ سب سے اعلیٰ فکر ہے۔ اس کی مدد سے ہر شخص قرآن کے مقصودِ اصلی کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ الغرض! شاہ صاحبؒ نے اپنے اس اجتماعی فکر کے ذریعے سے قرآن کو مسلمانوں کے ذہنوں کے قریب کر دیا ہے۔

☆

www.rahimia.org

مقالہ 10

تصوف؛ تہذیبِ نفوسِ انسانی کا طریقۂ کار

www.rahimia.org

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے فرمایا:

''پھر میں سید العارفین (حضرت) الحافظ محمد صدیق قدس سرہٗ (بھرچونڈی شریف والے) کی خدمت میں پہنچا۔ انھوں نے مجھے کلمۂ توحید (لاالٰــــہ إلاّ اللّٰہ) کی تلقین کی۔...میں اپنے شیخ کی صحبت میں دو ماہ کے قریب رہا۔ میں ان کے ساتھ نماز با جماعت پڑھتا۔ ان کے حلقۂ ذکر میں شریک ہوتا۔ ان کے ارشاداتِ عالیہ کو پوری توجہ سے سنتا تھا، جو وہ مختلف مجلسوں میں بیان فرماتے تھے۔ شیخ رحمہ اللہ میرے ساتھ ایک والد کی طرح پوری شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے اور میری طرف متوجہ رہتے تھے۔

میں ان کی گفتگو کی چاشنی اور ان کی صحبت کی لذت کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آپؒ کی صحبت کا اثر تب مجھ پر پوری طرح ظاہر ہوا، جب میں اُن سے جدا ہوا۔ گویا میں کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں کہ ایک پُر لطف اور باوقار ہیبت کا حامل نور مجھ سے گم ہوگیا ہے۔ خاص طور پر مجھے اس کیفیت اور معرفت کا پورا یقین اُس وقت کامل طور پر حاصل ہوا، جب میں اپنے دوسرے شیخ، شیخ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صحبت سے مشرف ہوا۔ بے شک میں نے ان کی صحبت میں ویسا ہی اثر اور نور محسوس کیا جیسا کہ سید العارفین کی صحبت سے حاصل ہوا تھا۔

بزرگوں کے اس صالح اجتماع میں رہنے کی برکت سے اسلامی معاشرت میری طبیعت کی گہرائیوں میں پوری طرح رَچ بس گئی اور میں اپنے آپ کو اسی اجتماعِ صالح پر مبنی خاندان کے ارکان میں سے ایک رکن سمجھنے لگا۔''(93)

تصوف؛ تہذیبِ نفوسِ انسانی کا طریقۂ کار

انسانیت کا سب سے اعلیٰ اور جامع فکر اسلام ہے۔ اسلام کے مطالعے سے مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ جہاد یا انقلاب افضل ترین عمل ہے، لیکن جس چیز نے اس نصب العین اور مسلک کو میری زندگی میں ایک زندہ فعال اور مؤثر حقیقت بنایا، اور ساری زندگی کو اسی رنگ میں رنگ دیا، وہ میری طبیعت کا رُجحانِ تصوف ہے۔ تصوف کا یہ ذوق فطری ہوتا ہے۔ اس میں کسی مذہب یا ملت کی قید نہیں ہوتی۔ چناں چہ ہر قوم، ہر مذہب اور ہر زمانے میں صوفی ہوتے چلے آئے ہیں۔

بے شک میرا بھی تصوف کا یہ ذوق قدرت کا عطیہ تھا، لیکن اسلام قبول کرنے کی وَجہ سے میرے اس ذوق کو نشو ونما اور تکمیل کے لیے بہترین مواقع نصیب ہوئے۔ مجھے خدا رسیدہ مرشدوں اور صاحبِ کمال عارفوں کی صحبت میں رہنے کی توفیق ہوئی۔ اسلامی تصوف کی روایات میں تصوف کا جو اصل مدعا ہے، اُسے مَیں نے منتہائے کمال پر جلوہ گر پایا۔ جس طرح اسلام سب دینوں کا خلاصہ ہے اور قرآن تمام الہامی کتابوں کا ماحاصل ہے، اسی طرح اسلامی تصوف میرے نزدیک تمام قوموں اور ملتوں کے متصوفانہ کمالات کا منتخب مجموعہ ہے۔

جذبۂ تصوف کی حقیقت

تصوف کا رُجحان انسانی ذہن کا ایک خاص جوہر ہے۔ بعض طبیعتوں کو قدرت کی طرف سے اس جوہر کا وافر حصہ ملتا ہے اور بعض کو کم۔ پھر بعض کو اس مَلکہ (خاص صلاحیت

اور خُلق) کی نشوونما کے لیے سازگار ماحول نصیب ہو جاتا ہے۔ بعض اس سے محروم رہتے ہیں۔ بہرحال یہ جذبہ کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں ہونا ضروری ہے، لیکن آخر یہ جذبۂ تصوف ہے کیا؟ اور انسانی زندگی میں کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ انسان محض گوشت پوست کا نام نہیں۔ اس گوشت پوست کے اندر ایک چیز ہے، جو بولتی ہے، سوچتی ہے اور جوارح (اعضا) سے کام لیتی ہے۔ یہ انسان کا ''مَیں'' یا ''اَنا'' ہے۔ اسے نفس کہہ لیجیے یا رُوح کا نام دیجیے۔ اس ''اَنا'' یا ''مَیں'' کا کام کیا ہے؟ یہ سوچتا ہے، یہ کچھ کہتا ہے اور پھر اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ تصوف انسان کے اس ''مَیں'' میں ایک ہیجان پیدا کرتا ہے۔ اسے ایک ولولہ دیتا ہے۔ اس میں حرکت پیدا کرتا ہے کہ وہ سوچے، کچھ چاہے اور اس کے لیے مصروفِ عمل ہو۔ یہ ایک برقی رَو ہے، جو انسان کے اندر دوڑ جاتی ہے۔ دھرم اور شریعت، پوجا پاٹ اور نماز، روزے کا نام تصوف نہیں۔ جذبۂ تصوف ان کاموں کو خلوص سے، عقیدت سے اور دل و جان سے کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تصوف زندگی میں کوئی خاص راہِ عمل متعین نہیں کرتا، بلکہ راہِ عمل پر ہمت اور استقامت سے چلانے والا جذبہ ہے۔

جذبۂ تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات

یوں تو انسان سب ایک ہیں۔ سب میں قدرت نے کم و بیش ایک سے خصائص ودیعت (عطا) کیے ہیں۔ اختلاف ہوتا ہے صرف اِن خصاص سے کام لینے یا نہ لینے سے۔ تصوف ان انسانی خصائص کو اُبھارنے، سنوارنے اور ان سے مفید کام لینے کا ذمہ لیتا ہے۔ اس لحاظ سے تصوف کا قیام سب کے لیے ہے۔ کسی شریعت میں اس کی تخصیص نہیں۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ شریعت کی ضرورت نہیں۔ تصوف تو شریعت کے اعمال کی روح کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے:

1۔ ایمان اور عقیدے کی پختگی

وہ ایمان پر زور دیتا ہے اور اعمالِ نیک کی ضرورت بتاتا ہے۔ صوفی شریعت کے

بتائے ہوئے رستوں پر چلتا ہے، لیکن اپنی دُھن سے، اپنے جذبہ و اُمنگ سے۔ اس دُھن اور جذبہ و اُمنگ کو پیدا کرنا تصوف کا کام ہے۔

2۔ اَنا اور خودی کی بیداری

تصوف انسانی اَنا (خودی) کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب انسان میں یہ باطنی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ''اَنا'' کسی اور وجودِ برتر کا پَرتَو ہے۔ یا یہ انسانی ''اَنا'' کسی بڑے ''اَنا'' کا فیضان ہے۔

اس خیال کی مزید وضاحت یوں سمجھئے کہ ایسی انانیت کو بیدار کرنا انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ جب اس زندگی میں کسی فرد کی انانیت بیدار ہو جائے تو موت کے بعد جب بدن اور اس انانیت میں جدائی ہو جاتی ہے تو یہ اَنانیت دوسری دُنیا میں بلاخوف و خطر ترقی کی راہیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اسے ہم فوز و فلاح اور جنت کہتے ہیں۔ جس کی انانیت خوابیدہ رہی اور ظلم و ستم کی وَجہ سے اس نے اپنی انانیت کو ڈھانپے رکھا تو اس زندگی کے بعد جہنم کا عذاب اِن پردوں کو جلا کر پھر اس کی انانیت کو مُجلّٰی (روشن) اور بیدار کر دے گا۔ جس دن اس شخص کی انانیت بیدار ہو جائے گی، وہ جہنم سے نکل جائے گا۔ فرد کے اندر اس انانیت کا بیدار نہ ہونا، ہمارے نزدیک کفر ہے۔ ہم دین کو اسی بنا پر انسانیت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پر چلنے سے ہر فردِ انسان کی انانیت بیدار ہوتی ہے۔

3۔ اخلاص و استقامت اور للّٰہیت

حقیقت میں تصوف دلوں کو دین کی رُوح سے آشنا کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو 'اِحسان' سے تعبیر فرمایا ہے۔ (چناں چہ ارشادِ نبویؐ ہے:

''الإحسان أن تعبد اللّٰہ کأنّک تراہ، فإن لم تکن تراہ فإنّہٗ یراک.'' (94)

(احسان یہ ہے کہ تُو اللہ کی عبادت ایسے کر گویا کہ تُو (تیری روح) اُسے

دیکھ رہی ہے۔ اگر تُو اُسے دیکھ نہیں رہا تو یہ خیال کر کہ بے شک وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔)

اِحسان کی یہ کیفیت کتابوں سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ یہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی توجہ سے حاصل ہوتی ہے۔

4۔ جرأت اور ہمت کی بالیدگی

ہماری ایک تو خوش بختی یہ تھی کہ خدا نے ہمیں اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ دوسرا کرم اس نے یہ کیا کہ مرشد اور اُستاد ایسے عطا فرمائے، جن کے فیضِ صحبت سے ہم اپنی دِلی مراد کو پہنچ گئے۔ الغرض! ہمارے دل میں اسلام تصوف کے ذریعے رچا۔ ان بزرگوں اور مرشدوں کے فیضِ صحبت سے ہمیں ایسی طمانیت نصیب ہوئی کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ہمارا دل کبھی ہراساں نہیں ہوتا۔ یہ طمانیت، یہ شر کے مقابلے میں خیر کے غالب آنے کا عقیدہ، یہ یقین کہ ان جھنجھٹوں، پریشانیوں، دُشواریوں اور ناکامیوں کی حیثیت عارضی ہے، یہ مایوسی اور یاس کو دل میں راہ نہ دینا اور یہ اپنے مقصد اور نصب العین پر اتنا مستحکم ایمان، یہ اسی صحبت کے فیوض و برکات ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اس مادی زندگی کے ماورا بھی کچھ ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے، وہ سب اُسی کا پَرتَو ہے، اور یہ کہ ہم ایک بہت بڑے وجود کا ایک حصہ ہیں۔ یہ وجودٔ لا اِنتہا سہی، اس کی وسعت نہ پیدا کنار (جس کا کوئی کنارہ نہیں) سہی، گو ہم اس کے مقابلے میں بے حد حقیر اور ہیچ ہیں، لیکن اس بڑے وجود کو ہمارا خیال ہے۔ اس کی کارسازی برابر ہم پر نگاہ رکھتی ہے۔

ہماری زندگی ایک بے معنی کھیل نہیں۔ ہم ایک مقصد لے کر دنیا میں آئے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو ہم جدوجہد کرتے ہیں، وہ ہمیں بعد میں ایک اَور اعلیٰ اور برتر زندگی کا حق دار بنا دیتی ہے۔ یعنی زندگی کی ان تمام قدروں پر ایمان، جسے ہم آسان لفظوں میں خدا کا حکم کہہ دیتے ہیں، یہی ایمان و عقیدہ ہے جو ہماری زندگی میں سب سے

بڑا محرک رہا ہے۔ اس ایمان و عقیدے میں اس قدر پختگی اور استقامت کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، لیکن اس میں تزلزُل نہ آئے۔ یہ سب تصوف کی دَین (عطا) ہے۔ علم کے ذریعے تو انسان دلیل اور منطق کے زور سے اپنے مقصد پر ایمان لاتا ہے، لیکن صاحبِ تصوف اپنے مقصد کو آنکھوں کے سامنے موجود پاتا ہے۔

حکمتِ عملی کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت

الغرض! ایک صوفیٔ باصفا (صاف دل کا مالک) کی طرح ہماری تمام سیاسی، اجتماعی اور ذہنی سرگرمیوں کا مقصد صرف اپنے ربّ کی رضا جوئی ہے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں یا جو کچھ کرتے ہیں، اس سے ہمارا مقصد صرف اُسی ذاتِ اقدس کی خوشنودی ہے۔ ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ جو پروگرام ہم اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس میں قوم کی فلاح ہے۔ زندگی کی جو نئی قدریں ہم قوم کو دیتے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ بدلے ہوئے زمانے میں قوم کو انھی کی ضرورت ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ زمانے کا تقاضا خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے۔ زندگی کے اسباب و حالات جس نظام کے متقاضی ہوتے ہیں، خدائی مصلحت اس نظام کو دُنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔ یہی اس کی مرضی ہوتی ہے، لیکن خدا کی یہ مرضی اس کے بندوں کے ذریعے ہی دنیا میں عملی جامہ پہنتی ہے۔ اللہ کا ہاتھ بندوں کے ہاتھ کے اندر کام کرتا ہے۔ اس لیے بسا اوقات سیاسی کام بھی الٰہی کام ہوتے ہیں اور سیاست عبادت بن جاتی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کے اثرات

ہم وطن سے نکلے اور افغانستان پہنچے۔ وہاں ہمیں نئے نئے حالات سے سابقہ پڑا۔ روس گئے تو بالکل اَور دُنیا نظر آئی۔ جن مزعومات میں ہماری ساری زندگی گزری تھی، روس میں اُن کو ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور مٹتے دیکھا۔ نئے اصولوں پر زیادہ جان دار نظام بننے کا مشاہدہ کیا۔ پھر ترکی میں بھی کم و بیش یہی کچھ ہمارے سامنے ہوا۔ اس تمام زمانے میں ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے مذہب کے اساسی عقیدے پر شک و شبہ نہیں ہوا۔ ہمارا

دینی فکر رُوسی انقلابیوں کے لادینی فکر سے بلند تر رہا۔ ان کی تمام تر مادیت کو ہمارے الٰہی فکر نے اپنے اندر ہضم کرلیا۔ یہ سب شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کا فیض تھا کہ انقلاب کے ان طوفانوں کے مقابلے میں ہم محض تصوف کی برکت سے اِسلام پر ثابت قدم رہے۔

شاہ صاحبؒ کے تصوف میں باطنی شعور کو سنوارنے اور اُبھارنے کا ایک ایسا نظام ملتا ہے جو خالص اِسلامی ہے اور انسانیتِ عامہ سے بھی ہم آہنگ ہے۔ نیز شاہ صاحبؒ کا یہ تصوف موجود لادینی فکر کا صحیح مصلح (درست طور پر اصلاح کرنے والا) ہے۔ مسلمان اس کی وَجہ سے ''یورپین ازم'' (یورپ کی ترقیات اختیار کرنے) کے بعد بھی اپنے مذہب سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔

تصوف پر رجعت پسندی اور جمود کے الزام کی حقیقت

یہ ہے تصوف! تصوف کا لفظ سن کر عام طور پر قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا خیال آتا ہے۔ تصوف کو عموماً عمل اور اِقدام (آگے بڑھنے) کی ضد سمجھا جاتا ہے، لیکن تصوف ''نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنون'' (انتہائی غور و فکر اور بھرپور لگن) کا مجموعہ ہے۔ اور ہمارے عمل کے سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں۔ اس تصوف ہی نے ہمیں ہر خطرے اور ہر مصیبت میں خدا کے دامن سے وابستہ رکھا اور اسی کا احسان ہے کہ ہمارا خدا پر عقیدہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اس میں ساری قومیں سما گئیں۔ سارے ادیان آ گئے۔ کُل کی کُل انسانیت اس کے اندر جذب ہوگئی۔ ساری کائنات کا اُس نے احاطہ کرلیا۔ یہ عقیدہ ان تمام قیود و حدود سے پھر بھی بلند و برتر رہا۔

تصوف نے ایک طرف ہمارے ذہن و فکر میں اس قدر وسعت و ہمہ گیری پیدا کی اور دوسری طرف ہمیں اتنا یقین اور استقامت بخشی کہ ہم اس باطنی شعور کو خارج میں لانے کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے۔ ناسازگار حالات اور مادی مشکلات کی کبھی پرواہ نہ کی۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا عہدِ اِقبال تھا اور ان کے قُویٰ (اندرونی نظام) میں جان تھی تو ان کا تصوف کا جذبہ تمام تر عمل پر مرکوز رہا۔ بعد میں جب قوم کے قویٰ مضمحل

(کمزور) ہو گئے تو جمہور کا تصوف محض اندھا دھند عقیدت بن کر رہ گیا۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ تصوف نہ تھا تو مسلمان برسرِ عروج تھے، تصوف کا دور دورہ ہوا تو ان کا زوال شروع ہو گیا، تصوف کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اربابِ تصوف کی بے عملی کا باعث تصوف نہ تھا، بلکہ اُس زمانے کے حالات نے اُن میں جمود اور بے عملی پیدا کر دی تھی۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ تصوف

جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس تصوف کے ارتقا کی آخری کڑی ہیں۔ انھوں نے اس تصوف کی جو تعبیر کی ہے، وہ صحیح معنوں میں ہماری ذہنی زندگی کی اساس (بنیاد) بن سکتی ہے۔

صوفیا عام طور پر مسئلۂ اَخلاق سے تصوف کی بحث شروع کرتے ہیں۔ انسانی بدن میں (۱) دماغ، (۲) قلب اور (۳) جگر تین اعضا ہیں، جنھیں علمائے طب ''اعضائے رئیسہ'' کہتے ہیں۔ اربابِ تصوف ان اعضا کی ظاہری قوتوں کے علاوہ ان کی باطنی قوتیں بھی مانتے ہیں۔ ان باطنی قوتوں کا نام ان کے ہاں ''لطیفۂ عقل''، ''لطیفۂ قلب'' اور ''لطیفۂ نفس'' ہے۔ ان کے نزدیک ان قوتوں کی ترتیب و تحلیل سے انسان کے اندر مختلف ''حالات'' اور ''مقامات'' پیدا ہوتے ہیں۔ چناں چہ صوفی اہلِ قلم اپنی کتابوں میں بیشتر ان مسائل پر بڑی بسط (تفصیل) سے بحث کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ ''لطیفۂ عقل''، ''لطیفۂ قلب'' اور ''لطیفۂ نفس'' سے پہلے انسانی بدن میں ایک اَور لطیفہ بھی تجویز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اس کا نام ''لطیفۂ جوارح'' ہے۔ چناں چہ ''الطاف القدس'' میں اس ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اسلام جن احکام کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور عرفِ عام میں ہم اسے ''شریعت'' کہتے ہیں، ''لطیفۂ جوارح'' کا تعلق اسلام کے اس حصے سے ہے۔ ''لطیفۂ جوارح'' کو یوں سمجھئے کہ جب قلب، عقل اور نفس کی تمام تر قوتیں جوارح

(جسمانی اعضا) کی حرکت و عمل کا مدار بن جاتی ہیں اور جوارح کے اعمال ان کی وجہ سے تکمیل پاتے ہیں، یعنی دوسرے لفظوں میں قلب، عقل اور نفس کے تمام کے تمام محرکات اور مؤثرات جوارح کے عمل میں فنا ہو جاتے ہیں تو اس 'ملکۂ فعلیّت' (کام کرنے کی داخلی صلاحیت) کا نام ''لطیفۂ جوارح'' ہے۔

اس لطیفہ کی وضاحت کے لیے مجھے ایک اونٹ کی مثال دکھائی گئی۔ یہ اونٹ موت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس میں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی رہ گئی ہے۔ اس کے تینوں کے تینوں ظاہری لطائف (نفس، قلب اور عقل) کمزور ہو چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اونٹوں کی قطار میں چلا جا رہا ہے۔ اس اونٹ میں چلنے کے سوا اَور کوئی قوت نہیں رہی۔ چناں چہ وہ قطار میں برابر قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی روح نکل جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ اُسی دم وہ چلتے چلتے گر پڑتا ہے۔ یہ اونٹ جس وقت مرتا ہے، عین اُسی وقت وہ چلنے سے رُک جاتا ہے۔ اُس کی موت اور اس کے چلنے سے رُکنا دونوں فعل ایک وقت میں ہوتے ہیں۔ اس مثال سے مجھ پر واضح کیا گیا کہ اس اونٹ کا یہ ''لطیفۂ جوارح'' فنا پذیر ہے۔ شریعت کے اعمال (ادا کرنے) کا اسی لطیفہ (جسمانی اعضا کے 'ملکۂ فعلیت') سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔''[95]

عام صوفیا کے نقطۂ نظر کا نقص

عام صوفیا نے بدنِ انسانی میں ظاہری اور باطنی قوتوں کو الگ الگ مانا تو انھیں اسلام کی تعلیم کے بھی دو حصے کرنے پڑے۔ ان کے نزدیک ''شریعت'' کا ایک خاص نصابِ عمل ہے۔ ''تصوف و طریقت'' اس کے علاوہ اَور ماورا چیز ہے۔ پھر اس کے ساتھ انھیں اس سلسلے میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ تصوف اور طریقت کا مسلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج نہ تھا۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں اتنا نور اور برکت تھی کہ اس زمانے میں باطنی تزکیے کے لیے تصوف کی

ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

ہمیں عام صوفیا کے اس فکر میں ایک بہت بڑا نقص نظر آتا ہے۔ اگر ہم اُن کے اس بیان کو صحیح مان لیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلام کی شریعت اور اس کی فقہ علاحدہ چیز ہے۔ تصوف اس سے الگ اور جدا ہے۔ شریعت پر عمل کرلیا تو اسلام مکمل ہوگیا۔ اب جس کا جی چاہے، تصوف حاصل کرے اور جس کی مرضی نہ ہو، وہ اس سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کے لیے صرف شریعت کافی ہے۔ جہاں تک تصوف کا تعلق ہے، وہ ایک غیرضروری چیز ہے۔

اب ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے، لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں اور یہ ہمارا اپنا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کا یقین صوفیائے کرام کی صحبت ہی میں مکمل ہوتا ہے۔ نیز اس ضمن میں یہ بات بھی واضح ہے کہ دینِ اسلام کی سب سے اہم اساس اللہ پر ایمان لانا ہے۔ پھر اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں ہوسکتا کہ قرآن عظیم کے نزدیک اگر اللہ کے ایمان کے ساتھ ساتھ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہ ہو تو یہ ایمان باللہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ یہ جاننے کے بعد ہماری طبیعت میں بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ ہم اس ضِغطے (کش مکش) میں پڑ گئے کہ تصوف اور صوفیا کے ذریعے تو **إیمان بالیوم الآخر** (آخرت کے دن پر ایمان) پر یقین پیدا ہوتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اُسے تعلیمِ اسلام میں غیرضروری چیز سمجھا جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نظریۂ تصوف کی جامعیت

ہم نے جب شاہ صاحبؒ کی حکمت کا مطالعہ کیا تو پھر کہیں جا کر اطمینان ہوا۔ ہم انسانی زندگی کو ایک مسلسل وحدت ماننے لگے۔ ہمارے لیے اس دنیا کی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی دو جدا جدا چیزیں نہ رہیں، بلکہ ہم نے یہ جانا کہ یہ ایک ہی راہ کی مختلف منزلیں ہیں۔ عام اربابِ تصوف بالعموم اعضائے رئیسہ کی صرف ظاہری اور باطنی قوتوں کو مانتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ ان کے علاوہ ''لطیفۂ جوارح'' کے بھی قائل ہیں۔ ''لطیفۂ جوارح''

کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں دماغ، قلب اور جگر جو تین اعضا ہیں، ان کے دو رُخ ہیں۔ ان کا ایک رُخ تو ''لطیفۂ جوارح'' کی طرف ہوتا ہے۔ ''لطیفۂ جوارح'' کی اصلاح اور تکمیل ''شریعت'' کا مقصود ہے۔ اعضائے رئیسہ کی ان قوتوں کا دوسرا رُخ اپنے باطن کی طرف ہوتا ہے، جو ان کا اصلی منبع (سرچشمہ) ہے۔ انسان کے ان لطائف کی تکمیل تصوف، طریقت اور فلسفہ کرتا ہے۔

اب بات یہ ہے کہ تمام انسان ایک سے تو ہوتے نہیں۔ سب ایک ہی جبلت (طبیعت) لے کر تو نہیں آتے۔ ایک شخص ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی میں چیزوں کو سمجھ جاتا ہے، لیکن دوسرے کو کافی زمانہ گزرنے کے بعد ان چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ چناں چہ ہوسکتا ہے کہ ایک انسان بدن ہی کو اپنی انانیت کا مصداق سمجھے۔ اس کا ذہن اعضائے رئیسہ کی ظاہری قوتوں کے بعد صرف لطیفۂ جوارح کو آخری چیز قرار دے۔ عامۃ الناس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ لیکن دوسرا انسان جو ذکی (اور ذہین) ہے، وہ لامحالہ جوارح کے افعال کو عقل، اَخلاق اور طبیعت کا تقاضا جان لے گا۔ وہ انسانیت کا مرکز اور منبع بدن نہیں، بلکہ بدن سے ماوراء عقل، قلب اور نفس کے لطائف کو سمجھے گا۔

شریعت وطریقت میں وحدت

انسان کے مختلف قویٰ کو اگر اس طرح ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھ لی جائیں اور دماغ، دل اور جگر کے ظاہری اعمال سے شروع کر کے ہم ''لطیفۂ جوارح'' پر پہنچیں، پھر اس سے عقل، قلب اور نفس کی باطنی قوتوں پر آئیں، اور یہ سب کے سب انسانی قویٰ کے مختلف درجے مان لیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح یہ قویٰ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متصل اور وابستہ ہیں۔ اس طرح شریعت، جو جوارح (ظاہری جسم کے اعمال) کی اصلاح اور تکمیل کرتی ہے اور طریقت جس کا کام اعلیٰ لطائف کا تزکیہ اور ترقی ہے، دونوں کی دونوں الگ الگ چیزیں نہیں رہ جائیں گی، بلکہ یہ ایک چیز کے دو رنگ یا ایک درخت کے دو ثمر ہوں گے؛ ایک پہلے درجے پر اور ددوسرا دوسرے درجے

پر۔ چناں چہ جب انسانی قویٰ میں وحدت ہے اور شریعت و طریقت میں اتحاد ہے تو ظاہر ہے اس طرح تمام زندگی میں بھی ایک وحدت قائم ہو جائے گی۔

بے شک زندگی کی اس وحدت میں مختلف مدارج ہوں گے۔ جس طرح کہ ایک انسان کے قویٰ کے مختلف مدارج ہوتے ہیں، لیکن مدارج میں یہ اختلاف اس بنا پر نہیں ہوگا کہ یہ چیزیں الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں، بلکہ یہ اختلاف نتیجہ ہوگا ارتقا کی مختلف منزلوں کا۔

الغرض! شاہ صاحبؒ کے اس فکر سے ایک طرف تو عام زندگی میں وحدت، پھر تمام انسانیت میں وحدت، اس کے بعد ایک انسان کے قویٰ میں وحدت اور اسی سے شریعت اور طریقت کی وحدت واضح ہو جاتی ہے۔ اور دوسری طرف ان سب چیزوں میں بہ ظاہر جو اختلاف نظر آتا ہے، وہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نظریۂ تصوف پر اُن کی کتابیں

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''**الطاف القدس**'' میں ان مسائل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ چناں چہ اس کتاب کے:

☆ پہلے باب میں ''لطیفۂ جوارح'' کا ذکر ہے۔

☆ دوسرے باب میں جوارح سے اوپر جو تین لطائف ہیں، ان پر بحث کی گئی ہے۔

☆ تیسرے باب میں عقل اور قلب کے پہلے ''بطن'' پر بحث ہے۔

☆ چوتھے میں عقل اور قلب کے ''بطنُ البطن'' سے بحث ہے۔

اس طرح انسان کے یہ قویٰ جب آخری درجے پر پہنچتے ہیں تو اس کا اُس ''تجلی'' سے ربط پیدا ہو جاتا ہے، جو کائنات کی مرکزی قوت کے آئینے میں ظاہر ہوئی۔ یہ مباحث اس قابل ہیں کہ انھیں بڑے غور سے پڑھا جائے۔ اس وقت ہمیں یہاں اس پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ''**الطاف القدس**'' میں لطائف پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں ادراکِ انسانی اور اس کے مدارج کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

www.rahimia.org

"**سطعات**" میں شاہ صاحبؒ نے تجلیٔ الٰہی کے مسئلے کی تشریح کی ہے۔

اگر تصوفِ اسلام کی تاریخ اور اس تاریخ کا فلسفہ پڑھنا ہو تو شاہ صاحبؒ کی کتاب "**ھمعات**" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

"**انتباہ فی سلاسل أولیاء اللّٰہ**" میں آپؒ نے صوفیا کے مختلف طریقوں کی تفصیل لکھی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے والد ماجدؒ سے طریقت کی جس طرح تحصیل کی، اُس کا بیان آپؒ کی کتاب "**القول الجمیل فی بیان سواء السّبیل**" میں ہے۔

"**أنفاس العارفین**" میں آپؒ نے اپنے والد اور چچا کے سوانح حیات جن کو شاہ صاحبؒ کے فلسفے اور تصوف کی روح کہنا چاہیے، لکھے ہیں۔ "**أنفاس العارفین**" کے ساتھ ساتھ اگر شیخ عبدالحق دہلویؒ کی "**أخبار الأخیار**" اور مولانا (عبدالرحمٰن) جامیؒ کی "**نفحات الأنس**" کا مطالعہ کرلیا جائے تو تصوفِ اسلام کی پوری تاریخ سامنے آجائے گی۔

تصوف کے منکرین متجدّدین

ہندوستان کے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں اپنی اپنی قوموں میں تجدید و اصلاح کرنے کا فکر رکھنے والے پچھلی صدی میں جو علما ہوئے ہیں، ان میں سے جن تک شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علومِ قرآن و حدیث و فقہ کی تحقیقات پہنچیں، وہ سب ان کی قدر کرتے رہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے شاہ صاحبؒ کے تصوف کو ماننا گراں گزرتا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس تصوف کو ماننے سے ہم ایرانیت اور ہندیت کی طرف جارہے ہیں۔

دورانِ قیامِ حجاز میں ہمیں اس خیال کے لوگوں سے کافی واسطہ پڑا۔ شروع شروع میں بے شک یہ لوگ شاہ صاحبؒ کے تصوف کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے، لیکن جب ہم نے انھیں بتایا کہ آریائی ذہنیت رکھنے والی قوموں کو سامی نبوت کی حقیقت سمجھانے سے کتنے بلند اور اعلیٰ مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں۔ اس طرح انسانیت بہ حیثیتِ مجموعی کس قدر

ترقی کر سکتی ہے۔ نیز ہم نے انھیں بتایا کہ آریائی ذہن کو سامی نبوت سے ہم آہنگ کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے، جو شاہ صاحبؒ نے اپنے تصوف کے ذریعے پیش کیا ہے۔ تو ہماری ان باتوں سے وہ متأثر ہوئے اور شاہ صاحبؒ کے دوسرے علوم کی طرح علمِ تصوف کی بھی قدر کرنے لگے۔ لیکن یہ کہ شاہ صاحبؒ کے تصوف کو پڑھنے اور اس کا احاطہ کرنے کے لیے وہ اپنا وقت صرف کریں، ہم نے اتنی وسعتِ قلب —— افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے —— ان میں نہیں دیکھی۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں بیرونِ ہند کے ان علما کی کتابوں اور اُن کے افکار کا گزشتہ سالوں میں بڑا پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ یہ علما جیسا کہ ابھی ابھی لکھ آئے ہیں، سامی قوموں کی برتری اور آریائی اقوام کی فروتری کو اصل اساس مانتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کو ہمارے تصوف سے اتفاق نہ تھا۔ انھیں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تصوف سے بھی ایرانیت اور ہندیت کی بُو آتی ہے۔ جب ان علما کی کتابوں اور ان کے افکار کا ہندوستان کے مسلمانوں میں پروپیگنڈا ہوا تو فطری بات تھی کہ اس میں تصوف کو قطعی طور پر نظر انداز کیا جاتا۔ نہ صرف نظر انداز کیا جاتا، بلکہ اس کو خلافِ اسلام ثابت کرنے کی کوششیں ہوتیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہندوستانی اہلِ علم اس پروپیگنڈے کا شکار ہوئے۔ وہ تصوف کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ حالت یہ ہوئی کہ ہمارے علما خود اپنے ائمہ کی تعلیمات سے بے تعلق ہو گئے اور ان سے کماحقہ استفادہ نہ کر سکے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک تصوف کی اہمیت

خود امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک اس تصوف کی کتنی اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ آپ شاہ صاحبؒ کی اس عبارت سے کر لیجیے:

”لیس منّا من لم یتدبّر کتاب اللّٰہ، و لم یتفهّم حدیث نبیّهٖ ﷺ، لیس منّا من ترک ملازمة العلماء، أعني: الصّوفیة الّذین لهم حظّ من الکتاب و السّنّة، أو الرّاسخین فی العلم الّذین لهم

حظّ من الصّوفية، أو المحدّثين الّذين لهم حظّ من الفقه، أو الفقهاء الّذين لهم حظّ من الحديث.

و أمّا الجُهّال من الصّوفية و المجاهدون للتّصوّف فأولآئک قُطّاع الطّريق و لُصوص الدّين. فإيّاک و إيّاهم. جعلنا اللّٰه سبحانهٗ ممّن يطيعهٗ، و يتّبع رضوانهٗ، و لا يشرک بهٖ شيئاً، فإنّما نحن بهٖ و لهٗ. و السّلام.“ (96)

(وہ لوگ ہمارے گروہ میں سے نہیں، جس نے کتاب اللہ پر غور نہ کیا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں فہم و بصیرت حاصل نہ کی ہو۔ وہ ہم میں سے نہیں، جس نے ہمارے ایسے علما کی صحبت ترک کردی ہو جو صوفیا ہیں اور انھیں کتاب وسنت میں درک (رسائی) ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں، جو ایسے اصحابِ علم سے کنارہ کش ہوگیا ہو جو تصوف میں بہرہ رکھتے ہوں۔ اور ایسے محدثین کی صحبت میں نہ بیٹھے، جو محدثین کے ساتھ ساتھ فقہا بھی ہوں۔ وہ ہم میں سے نہیں، جس نے ایسے فقہا کی صحبت ترک کردی ہو، جو علمِ حدیث بھی جانتے ہیں۔ باقی رہے جاہل فقہا اور جاہل علما، جو تصوف کا انکار کرتے ہیں، تو یہ دونوں کے دونوں چور اور رہزن ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں شامل کرے، جو اس کی اطاعت کرتے ہیں، اس کی رضا مندی چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی اَور کو شریک نہیں بناتے۔ بے شک ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ والسلام۔“

☆

مقالہ 11

ارتفاقات

(ارتفاقِ اوّل و دوم)

www.rahimia.org

ارتفاقِ اوّل اور ارتفاقِ دوم

''ارتفاقِ اوّل'' انسانی ترقی کی پہلی منزل ہے۔ جب نوعِ انسانی ابھی اتنی پھلی پھولی نہ تھی، لوگ جنگلوں یا چھوٹے چھوٹے دیہاتوں (گوٹھوں) میں رہتے تھے۔ اپنی جماعت میں سے کسی بڑے کے ماتحت رہا کرتے تھے۔ انسانی معاشرے کا یہ دورِ اوّلین تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نوعِ انسانی جو پہلے اقلیت میں تھی، اکثریت میں تبدیل ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس کے افراد کا شمار ہزاروں میں ہونے لگا۔ زندگی میں ایک تنوع (رنگا رنگی) پیدا ہوا اور باہمی معاملات میں اضافہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کشادہ، وسیع اور بارونق شہروں میں بدل گئے اور ایک اچھا خاصا تمدنی نظام وجود میں آ گیا۔ اب اس نظام کے تحت انھوں نے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ یہ اگلے درجے کی شہری زندگی' دراصل ''ارتفاقِ ثانی'' کا دوسرا نام ہے۔''

www.rahnuma.org

ارتفاقات

(ارتفاقِ اوّل و دوم)

اپنی دُنیوی زندگی میں انسان بہت سی مشکلات اور بہت سی تکالیف سے دوچار ہوتا ہے۔ عقل مندوں نے ان مشکلات اور تکالیف میں سے بعضوں کے لیے حل تلاش کر لیے ہیں اور بقیہ کی تلاش کے لیے کوشاں ہیں۔

ارتفاق کا مفہوم اور اس کی حقیقت

جن طریقوں سے معاشی اور اقتصادی پریشانیوں پر بہ آسانی قابو پایا جاسکتا ہے، انھیں اصطلاح میں ''ارتفاقات'' یا ''مرافق'' کہتے ہیں۔ لفظ ''ارتفاق'' کا مادہ ''رِفق'' ہے۔ اس کا مطلب ''نرمی'' یا ''نرمی سے کام لینا'' ہے۔ اس کو یوں سمجھ لیجیے کہ کائنات میں وہ تمام اشیا جو انسان کے لیے مفید ہیں، وہ خود بہ خود اس کے تصرف (استعمال) میں نہیں آئیں، بلکہ یہ مثلِ خام مال کے ہیں، جسے حسبِ ضرورت استعمال کے لیے ڈھالا اور تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اشیا انسان کو اپنی سہولت اور فائدے کے مطابق تیار کرنی پڑتی ہیں۔ ایسی سہولت اور فائدے کو ''ارتفاق'' کہا جاتا ہے۔ چناں چہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصطلاح کے مطابق ''ارتفاق'' کی تعریف یہ ہے:

''تحصيل الأشياء الطّبيعية بأدنٰى عناية، و أقلّ قوّة، و بعد صَرف اقصر مُدّة، باستعمال الآلات، يُسمّيه الإمام ولى اللّٰه (الدّهلویؒ) بِ''الارتفاق''. (97)

(آلات کے استعمال سے تھوڑی توجہ، معمولی قوت اور تھوڑی مدت میں (اپنی ضرورت کی) مادی اشیا اور اجناس کو حاصل کرنا۔ شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) نے اسے ''ارتفاق'' کا نام دیا ہے۔)

اپنی ضروریات کے لیے آلات کا استعمال انسان کی بنیادی خصوصیت ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے انسان اور حیوان کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے انسان کی جامع تعریف یہ کی ہے:

''و ما یحسّ و یتحرّک بالإرادة حیوان، و ما یتفکّر و یصنع بالآلات إنساناً أرضیاً.'' (98)

(جو اپنے ارادے سے حرکت کرے اور محسوس کرے، وہ حیوان ہے۔ جو غور و فکر کرے اور آلات کا استعمال کرے، وہ زمین پر بسنے والا انسان ہے۔)

زمین پر بسنے والے انسان کے لیے آلات کے استعمال سے اپنے لیے ارتفاقات پیدا کرنا اُس کی بنیادی فطرت اور اس کی حقیقت و مفہوم میں داخل ہے۔

ارتفاقات کی چار منزلیں

انسانی ارتفاق (تہذیب و تمدن) کی چار منزلیں ہیں:

1۔ ارتفاقِ اوّل
(انسان کی ابتدائی زندگی کے تہذیبی اُمور)

2۔ ارتفاقِ دوم
(انسان کی جماعتی زندگی کے شہری اُمور)

3۔ ارتفاقِ سوم
(انسان کی قومی زندگی کے ملکی امور)

4۔ ارتفاقِ چہارم
(انسان کی بین الاقوامی زندگی کے عالمی امور)

www.rahimia.org

ارتفاقِ اوّل

مفہوم اور حقیقت

اس میں نوعِ انسانی کے تمام افراد کو چند بنیادی اشیا کی یکساں ضرورت پڑتی ہے، مثلاً کھانا، کپڑا اور مکان۔ ان بنیادی ضروریات کی تکمیل انسان کی طبعی ضرورت میں داخل ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا تھا کہ اِن چیزوں کا علم اسے طبعی طور پر ہو۔ اسی لیے وہ کاشت کا کوئی نہ کوئی طریقہ تلاش کرتا ہے۔ پانی کے انتظام کے لیے مختلف طریقے نکالتا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے بھی کچا پکا کھانا تیار کرلیتا ہے۔ آگے چل کر وہ حیوانات کو اپنا تابع بناتا ہے اور ان کی اُون اور چمڑے سے اپنے لیے لباس بناتا ہے۔ درندوں سے اپنی حفاظت کے لیے گھر بناتا ہے۔ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل اور اپنی نسل کو قائم رکھنے کے لیے ایک عورت سے نکاح کرکے اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اس بات کا خواہاں رہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس (عورت کے) معاملے میں مداخلت نہ کرے۔

حضرت آدمؑ پر ارتفاقِ اوّل کا الہام

ارتفاقِ اوّل کی مثال ہمیں حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ ابتداءً انسان کو اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا طبعی طور پر اِلہام ہوا کہ اگر یہ چیزیں ظہور میں نہ آتیں تو اس کی زندگی میں رُکاوٹ پیدا ہو جاتی۔ قلب تکلیف میں مبتلا ہوتا۔ جس کے بعد رواں دواں زندگی ختم ہو جاتی۔

انسان کا الہام اسے بالکل اسی طرح ہوتا ہے، جس طرح شہد کی مکھیوں کو اپنی ضروریات کی بابت ہوا کرتا ہے کہ وہ کن پھولوں کا رس چوس کر کس طرح اِس سے شہد بنائیں۔ کس طرح اپنا چھتہ تیار کریں۔ آپس میں کس طرح مل کر رہیں اور اپنی ملکہ کی کس

طرح اطاعت کریں۔ مختصر یہ کہ ہر نوعِ حیوانی کے لیے ایک جداگانہ طریقۂ زندگی ہے، جو ان کے حالات کے مطابق اِن کے قلوب میں ڈال دیا جاتا ہے۔

انسان کی تین بنیادی خصوصیات

انسان کی بنیادی ضروریات میں تمام حیوانات بھی اس کے شریک ہیں، لیکن اپنی خصوصیت کے تقاضے کے مطابق انسان کو تین چیزیں مزید عنایت کی گئی ہیں، جن کا وہ بلاشرکتِ غیرے مالک ہے۔

1۔ ''الرّأی الکُلّی''، یعنی رفاہِ عام کا تخیل

انسان کی ضرورت محض ذاتی بنیادی ضروریات تک ہی محدود نہیں، بلکہ وہ ان کے ماسوا اَور اشیا کی ضرورت بھی اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ صرف طبعی ضرورت (بھوک، پیاس اور جنسی شہوت وغیرہ) ہی اس کو کسی عمل کے لیے آمادہ نہیں کرتیں، بلکہ اس میں عقلی ضروریات بھی موجود ہیں جو اسے ایسے نفع کے حاصل کرنے اور ایسے نقصان سے بچنے کے لیے تیار کرتی ہیں جن کا تقاضا صرف عقل انسانی کرتی ہے نہ کہ حیوانی طبیعت۔

وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو نہ صرف اس کی ذات کے لیے مفید ہوں، بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی یکساں سود مند ہوں۔ اکثر اوقات اس کا یہ خیال اسے کسی شہر میں ایک بہتر تمدنی نظام کے قیام کے لیے اُکساتا ہے تو کبھی خود اپنے اَخلاق کی تکمیل اور اپنے نفس کی اصلاح کے لیے دُوررَس فوائد کا خیال رکھتے ہوئے اکثر اوقات وہ قریبی نقصان کو برداشت کر لیتا ہے۔ کبھی مستقبل کے نقصانات سے بچنے کے لیے اپنے قریبی فوائد کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت اور اس کا رُعب قائم رہے۔

2۔ ''الظّرافۃ''، یعنی شوقِ حسن و جمال

فطرتِ انسانی' حیوان کی طرح صرف اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے پر ہی قانع نہیں رہتی، بلکہ وہ تو ہمیشہ ''خوب سے خوب تر'' کی تلاش میں رہتی ہے۔ انسان ہر چیز میں

لطافت، تازگی، حسن اور خوبی کا متلاشی رہتا ہے، جس سے اپنی جمالیاتی حس کو حتیٰ الامکان مطمئن کرسکے۔ مثال کے طور پر حیوانی حاجت محض وہ غذا ہے، جس سے بھوک رفع کی جائے اور زندگی کی حرارت باقی رہے۔ لیکن انسان اس میں بھی لذت اور لطافت کا طلب گار رہتا ہے اور اپنے اِسی اطمینان کے لیے طرح طرح کے کھانے تیار کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اچھے سے اچھا خوش نما لباس زیبِ تن کرے۔ بہترین گھر میں سکونت اختیار کرے اور ایک نہایت حسین بیوی اس کی شریکِ حیات ہو۔

3۔ ''الإیجاد و التّقلید''یعنی ایجادات کرنا اور اُن کی تقلید کرنا

جس طرح انسانی ضرورت کی نوعیت حیوانی ضروریات کی نوعیت سے مختلف ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کو ہونے والے الہام کی کیفیت بھی حیوانی الہام کی کیفیت سے مختلف ہے۔ پھر حیوانات کے برعکس انسانوں کے اوپر ان کی تمام ضروریات کے متعلق ہونے والا الہام بھی ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا، بلکہ ضروریات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ الہام کے وقت اور اس کی قسم میں بھی اِختلاف ہوتا ہے۔ انسان ان الہامات سے اپنے فوائد اور دیگر مفید طریقوں میں مدد لیتا ہے۔

الف: ایجادات کا الہام

بسا اوقات بہت سی حاجتوں کا کچھ لوگوں کو خیال ہی نہیں آتا۔ آتا بھی ہے تو انھیں پورا کرنے کا کوئی بہتر طریقہ سمجھ نہیں آتا۔ ایسے موقع پر دوسرے لوگ ان کی مدد کرتے ہیں۔ انھیں الہام ہوتا ہے اور وہ اپنے ذہن سے (ایجاد کرکے) کوئی کارآمد طریقہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس طریقے سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس منزل پر دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ لوگ اتفاقِ رائے سے اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا سربراہ چن لیں اور اس کے معتقد ہوجائیں، تاکہ وہ ان کے ابتدائی تمدن کو بہتر بناسکے اور مشکل کے وقت ان کے دُشمن کے خلاف مددگار ثابت ہوسکے۔

ب: ایجادات کی تقلید

اپنے پیش رَو کی تلاش اور اس کی پیروی میں اپنی زندگی بسر کرنا انسانوں میں ایک بالکل فطری چیز ہے۔ معاشرے کی نشو ونما میں تقلید خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

اگر تقلید کا جذبہ فطرتِ انسانی میں داخل نہ ہوتا تو معاشرے کی تکمیل کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا۔ انسان بہ اعتبارِ فہم و دانش (سمجھ بوجھ) ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ چناں چہ وہ تقلید کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اسی وَجہ سے حسن و لطافت کی جستجو، مفید تدابیر کی ایجاد، اُصول وقواعد کی پیروی، نیز غور وفکر کے لیے بہ اعتبارِ فرصت' انسان ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ یہ کام صرف چند لوگوں کے ذمے ہوتا ہے، جو صاحبِ فہم وفراست (عقل مند) ہوں اور پھر دوسرے ان کی پیروی کریں۔

ارتفاقِ اوّل کا تعارف

ارتفاقِ اوّل کو جماعتی زندگی اور انسانی معاشرے کا سنگِ بنیاد کہا جا تا ہے۔ کیوں کہ اس درجے کے جماعتی کاموں سے انسانوں کا چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی آزاد اور بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی انسانی جماعت' خواہ وہ صحرا میں خیمہ زن ہو یا پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر رہتی ہو، اس درجۂ اوّل کے اجتماعی اداروں سے کسی حال میں بھی خالی نظر نہیں آئے گی۔

ارتفاقِ اوّل اور قیادت کی ضرورت

ارتفاقِ اوّل میں یہ بھی ضروری ہے کہ سادہ لوح لوگوں کے اس مجمع میں بعض عقل مند اور دانا لوگ بھی پائے جاتے ہوں، جو اِن کے تمدنی نظام کی ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔ نیز ان میں چند ایسے بھی ہوں جو صلح صفائی، اَمن و آشتی کی زندگی کے متلاشی ہوں۔ ساتھ ہی بلند اَخلاق، سخی، عادل، باہمت اور بہادر بھی ہوں۔

اللہ ربّ العزت کی یہ مرضی تھی کہ قرآن کریم تمام اقوامِ عالم کے لیے سر چشمۂ ہدایت ثابت ہو اور ان کے دین و دنیا کی کامیابی کا باعث بنے۔ اسے یہ علم تھا کہ تمام

درجہ ہائے ارتفاق میں درجۂ اوّل کا ارتفاق ہی دراصل ایسا ہے کہ خطۂ ارض پر بسنے والی تمام قومیں اسے بغیر کسی عذر کے قبول کر سکیں گی۔ چناں چہ ان کے لیے اس ارتفاق کی بقا لازمی ہے۔

ذرا سی لفظی تبدیلی سے مقصود کا اظہار یوں بھی ہو سکتا ہے کہ یہی ارتفاق ایسا ہے کہ جس کی پابندی کرنا انسانوں کی تمام اقوام اور ملتوں کے لیے لازمی ہے۔ اس کو چھوڑ کر اجتماعی زندگی کے خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا نہ صرف دُشوار ہے، بلکہ ناممکن بھی۔

ارتفاقِ اوّل کے بنیادی امور

حیوانات کی زندگی اور انسان کی بنیادی زندگی میں حیوانی حوالے سے اصولاً کوئی فرق نہیں۔ یعنی کھانے پینے، گرمی سردی سے بچنے اور نسل بڑھانے کے جذبے میں انسان اور حیوان دونوں ایک سطح پر ہیں۔ لیکن انسان کو قدرت نے جو جوہرِ عقل عطا کیا ہے، وہ ان حیوانی ضرورتوں یعنی بہیمی ارتفاقات کو ایک مخصوص رنگ اور شکل دے دیتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حُجّة اللّٰه البالغه'' اور ''البُدور البازغه'' میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

1۔ غذائی اجناس کی دریافت اور کاشت کاری

جب انسان عقلِ خداداد کی مدد سے حیوانات سے اوپر اٹھا تو اُس نے سب سے پہلے اپنی کھانے پینے کی ضرورتیں حاصل کر کے ان میں قدرے اصلاح کی کوشش کی۔ چناں چہ اُس نے غذائی اناج (Food-grains) تلاش کیے اور تجربوں سے معلوم کر لیا کہ فلاں قسم کے اَناج اس کی طبیعت کے موافق ہیں۔ پھر اُس نے ان اناجوں کو کثرت سے حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچیں۔ اس معاملے میں اس کی عقل نے اُس کی رہنمائی کی اور کارخانۂ قدرت میں جس طرح پودے اُگ کر اپنی نسل بڑھاتے ہیں، اسی طرح انسان نے کاشت کا طریقہ مکمل کیا۔ اُس نے خدا جانے کتنی صدیوں کے تجربوں کے بعد اناج بونے، اُس کی آب یاری کرنے، فصل کاٹنے اور اناج کو بھوسے سے الگ کر کے محفوظ

کرنے کے طریقے حاصل کیے۔

2۔ کھانے پینے کے طریقے

اس کے ساتھ ہی اُس نے ان اناجوں کو کھانے اور جزوِ بدن بنانے کے ایسے طریقے ایجاد کیے، جو حیوانوں کے طریقوں سے بہتر تھے۔ حیوان صرف کچی جنسوں پر گزارہ کرتا ہے، یا دوسرے حیوانات کا کچا گوشت کھاتا ہے، لیکن انسان کی قوتِ اختراع نے اسے سالن کی طرف رہنمائی کی اور اُس نے دودھ، دہی، چربی اور دیگر غذاؤں کو اچھی سے اچھی شکل میں استعمال کرنے کے طریقے معلوم کیے۔ ایسے ہی اُس نے پودوں کی جڑوں سے غذائی ضرورتیں پوری کرنے کا کام لینا شروع کیا۔

3۔ پانی کے حصول کے طریقے

انسان نے پیاس بجھانے کے لیے پانی کی خاصیت معلوم کی اور پھر کنوئیں کھود کر پانی حاصل کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور ضرورت کے وقت کام میں لانے کے لیے محفوظ کرنے کے واسطے گھڑے، مٹکے، مشکیزے، چھاگلیں بنائیں۔

4۔ اظہار مافی الضمیر کے لیے زبان کی ایجاد

انسان نے اپنے اس دور میں ایک اَور بہت بڑا کام کیا، جس سے وہ حیوانات سے بہت آگے نکل گیا۔ یہ اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کے لیے زبان کی ایجاد ہے۔

حیوانات اپنے جذبات کا اظہار مختلف آوازوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً کسی حیوان کی ایک قسم کی آواز اس کے درد کا، جب کہ دوسری آواز محبت کا اظہار کرتی ہے۔ چناں چہ اگر کُتے کی دُم پر پاؤں پڑ جائے تو وہ ایک خاص قسم کی آواز نکالتا ہے، لیکن جب اُسے غضب کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے تو اُس کا رنگ بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ اسی پر دوسرے جانوروں کا قیاس کر لینا چاہیے، لیکن انسان نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ آوازوں کو کاٹ کر حرفوں (حروفِ تہجی) میں تقسیم کیا اور پھر حرفوں کو جوڑ کر الفاظ (اسما و افعال) بنائے۔

فطرت نے انسان کو ایسی طبیعت دی ہے کہ وہ اس کی صورتِ ذہنیہ کی ترجمانی کر سکتی

ہے۔ یعنی اُس کے ذہن میں جو جذبات و خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ ان کے حسبِ حال آواز نکال سکتا ہے۔

انسان آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کانوں سے سنتا ہے۔ ان دونوں ذرائع سے بیرونی دنیا کی جو تصویریں اس کے نہاں خانۂ دماغ میں پہنچتی ہیں، ان کی ترکیب و تحلیل (Synthesis & Analysis) سے وہ نئے نتائج نکال لیتا ہے۔ یہ صفت کسی اَور حیوان میں نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ان نتائج کو معیّن آوازوں کے ذریعے سے — جن میں وہ بے حد اختلاف پیدا کرسکتا ہے — ادا کرلیتا ہے۔ یہ بات بھی کسی دوسرے حیوان میں نہیں پائی جاتی۔ چناں چہ انسان آوازوں کو جوڑ کر ''الفاظ'' بناتا ہے اور ان سے اپنی مختلف ذہنی صورتوں کو ظاہر کرتا ہے، جسے دوسرے انسان سمجھ کر ان کے جواب میں اسی قسم کے جوابی ''الفاظ'' استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انسان کے اس کمال کی داد دینی چاہیے کہ وہ سوال و جواب کرسکتا ہے۔ یعنی ایک انسان سے کوئی معلومات حاصل کرنا چاہے تو معین آوازوں کے ذریعے سے حاصل کرسکتا ہے۔ یہ بات کسی دوسرے حیوان میں نہیں پائی جاتی۔

5۔ حیوانات کو اپنے کاموں کے لیے استعمال کرنا

ارتفاقِ اوّل میں انسان نے دوسرے حیوانات کو اپنے تابع کرکے ان سے کام لینا شروع کردیا۔ اس طرح اپنی جسمانی مشقت میں بہت کمی کرلی۔ مثلاً جانوروں کے ذریعے زمین جوتنا، اُن پر سوار ہوکر دُور دراز مقامات پر پہنچنا اور اُن پر بوجھ پہنچانا۔ اپنی غذائی ضروریات کے لیے جانوروں سے دودھ اور گوشت حاصل کرنا اور اپنے استعمال کے لیے اُن کی کھال اور اُون وغیرہ حاصل کرکے کام میں لانا۔

6۔ رہائش کے لیے مکان بنانا

اسی ارتفاق کی ایک چیز رہائشی مکانات بنانا ہے۔ حیوانات گھونسلوں اور بھٹوں میں رہتے ہیں۔ وہ ان سے آگے ترقی نہیں کرسکتے، مگر انسان کی عقلِ خداداد نے پہلے اسے مٹی

کے گھروندوں اور غاروں میں رہنے کی طرف رہنمائی کی اور وہ بہت جلد خیمے اور گھر بنا کر رہنے لگا۔ پھر اگلے ارتفاقات میں فلک بوس عمارات تعمیر کر کے رہنے لگ گیا۔

7۔ جسم ڈھانپنے کے لیے لباس کا استعمال

ایسے ہی اس منزلِ ارتفاق میں انسان نے لباس کا استعمال شروع کیا، جس سے نہ صرف گرمی اور سردی سے اس کے بدن کی حفاظت ہوئی، بلکہ عریانی کو چھپانے کے نفسیاتی جذبے کی تسکین بھی ہوئی۔ ارتفاقِ اوّل میں جانوروں کے چمڑوں اور درختوں کے پتوں سے اُس نے کام لیا۔ پھر کپاس کاشت کر کے اُس سے دھاگے بنانے اور کپڑا بنانے کا طریقہ دریافت کیا، جس سے اُس کے لباس کی ضروریات پوری ہوئیں۔

8۔ نکاح اور منکوحہ بیوی کا خاص اُسی کے لیے متعین ہونا

اسی ارتفاق میں ایک چیز یہ بھی ہوئی کہ انسان نے اپنے لیے ایک زوجۂ منکوحہ متعین کرنے کا طریقہ وضع کیا، تاکہ اس کے جذبۂ جنسی کی تسکین ہو اور نسل بڑھے۔ کوئی غیرانسان سوچ سمجھ کر اپنے لیے ''منکوحہ'' معین نہیں کرتا۔ ان میں جو نر و مادہ مل بیٹھتے ہیں تو اس کے خارجی اسباب ہوتے ہیں، جن میں غیرت اور انانیت کا جذبہ اُس ترقی یافتہ شکل میں کارفرما نہیں ہوتا، جس شکل میں انسان میں ہوتا ہے۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ اُس کی منکوحہ خاص اُسی کے لیے متعین ہو۔ کوئی دوسرا اس میں مزاحمت نہ کرے۔ صرف وہی اُن سے جنسی تعلق قائم کرے اور اُس کی نسل پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ وہ گھریلو ضروریات میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اس کے بچوں کی پرورش اور تربیت کا کام کرے۔

9۔ صنعتی آلات کی تیاری

ارتفاقِ اوّل میں گزشتہ تمام امور سرانجام دینے کے لیے اوزار اور آلات کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ کاشت کاری، کنواں کھودنا اور جانوروں کو مسخر کرنا آلات کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چناں چہ اس موقع پر اُس نے کدال، ڈول، رسہ، ہل اور اُس کا پھل وغیرہ آلات تیار کیے اور اُن کے ذریعے سے ان تمام کاموں کو اچھے طریقے سے سرانجام دینے

کی سہولتیں بہم حاصل کیں۔

10۔تعاونِ باہمی اور اشیا کے تبادلے کا طریقہ

ارتفاقِ اوّل کے ابتدائی دور میں انسان نے اپنی تیار کردہ اشیا کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا طریقہ بھی سیکھا۔ کیوں کہ انسانی معاشرہ تعاونِ باہمی اور ایک دوسرے کے ساتھ لین دین اور خرید و فروخت کے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ اس طرح انسان حیوانات کی سطح سے اوپر اُٹھ کر اپنے معاملات طے کرنے لگا۔

11۔اپنے سربراہ کا انتخاب اور اُس کی اطاعت

ارتفاقِ اوّل کی اس سطح پر انسانوں میں سے جو اپنی رائے کے اعتبار سے زیادہ سمجھ دار اور اپنی طاقت اور قوت کے اعتبار سے زیادہ بہادر اور مضبوط تھا۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے خاندان اور قبیلے کا سربراہ بن گیا۔ اُس نے سربراہ بن کر خاندان، قبیلے اور نسل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ذمہ داریاں ادا کیں۔

12۔جھگڑے نمٹانے کے مسلمہ طریقۂ کار کی دریافت

ارتفاقِ اوّل کی سطح پر انسانوں میں معاملات اور لین دین میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ انھیں نمٹانے کے لیے قبیلے تمام افراد کے اتفاقِ رائے سے تسلیم شدہ رسوم و رواج اور طریقہ ہائے کار بنائے گئے۔ ان کے ذریعے سے باہمی جھگڑے نمٹائے جانے لگے۔ اُن کے ظالموں کو سزا دی جانے لگی اور دشمنوں سے دفاع کا طریقۂ کار وضع کیا گیا۔

بہترین اجتماع

غرض! انسان نے تہذیب و تمدن کی اس پہلی منزل میں اپنی حیوانی ضرورتوں کو انسانی عقل و دانش کی روشنی میں طبعی تقاضوں کے مطابق پورا کرنا شروع کردیا۔ یہ حیوانی ضرورتیں اس کے لیے دائمی ہیں۔ یعنی کوئی انسانی فرد یا اجتماع اس زمین پر ان کے بغیر

زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وَجہ ہے کہ ارتفاقات کے ذریعے سے ان فطری ضرورتوں کو پورا کرنا ہر ایک انسانی اجتماع کے لیے ضروری ہے۔ بہترین اجتماع وہ ہے، جس میں ہر فرد کی یہ ضرورتیں بہترین طریقے سے پوری ہوئی ہوں۔

ارتفاقِ دوم

''ارتفاقِ اوّل'' انسانی ترقی کی پہلی منزل ہے۔ جب نوعِ انسانی ابھی اتنی پھلی پھولی نہ تھی، لوگ جنگلوں یا چھوٹے چھوٹے دیہاتوں (گوٹھوں) میں رہتے تھے۔ اپنی جماعت میں سے کسی بڑے کے ماتحت رہا کرتے تھے۔ انسانی معاشرے کا یہ دورِ اوّلین تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نوعِ انسانی جو پہلے اقلیت میں تھی، اکثریت میں تبدیل ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس کے افراد کا شمار ہزاروں میں ہونے لگا۔ زندگی میں ایک تنوع (رنگا رنگی) پیدا ہوا اور باہمی معاملات میں اضافہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کشادہ، وسیع اور بارونق شہروں میں بدل گئے اور ایک اچھا خاصا تمدنی نظام وجود میں آ گیا۔ اب اس نظام کے تحت انھوں نے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ یہ اگلے درجے کی شہری زندگی' دراصل ''ارتفاقِ ثانی'' کا دوسرا نام ہے۔

ارتفاقِ دوم کی حقیقت اور مفہوم

ارتفاقِ اول کے مسائل کو صحیح تجربات کی کسوٹی پر کسنا' ارتفاقِ دوم کا ایک بنیادی اُصول ہے۔ ان تجربات کی روشنی میں ارتفاق کے تمام شعبوں میں وہ باتیں اختیار کی جاتی ہیں، جس میں نفع کا فی صد زیادہ سے زیادہ اور نقصان کی شرح کم سے کم تر ہو۔ اگر کوئی رسم یا عادت اس مرکزی اُصول سے ٹکراتی ہے تو اسے فی الفور ترک کر دیا جاتا ہے۔ ارتفاق کی اس دوسری منزل میں ارتفاقِ اوّل کے آداب کی از سرِنو چھان بین ہوتی ہے۔

ارتفاقِ ثانی کی مثال ہمیں حضرت ادریس علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔

ارتفاقِ دوم میں مفادِ عامہ کا لحاظ رکھنا

اگر ارتفاقِ اوّل میں بیان کردہ یہ امور اور آداب کسی سمجھ دار، عقل مند اور کامل کی نگاہ میں معتدل نہیں ہوتے تو ان میں مناسب ترمیمات اور تغیرات (تبدیلیاں) کیے جاتے ہیں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ بنیادی اُصول کے موافق بنایا جاتا ہے۔ ان امور اور آداب کا ہر پہلو اور ہر طریقۂ کار ہمیشہ رائے کلی (مفادِ عامہ)، حُبِّ جمال اور نئی ایجادات اور اُن کی تقلید کے حسبِ منشا ہونا چاہیے۔ ان میں ہمیشہ عام مصلحت کو پیشِ نظر رکھا جائے جن میں عمومی خوبیوں کو خصوصی مصلحت پر ترجیح حاصل ہو۔

ارتفاقِ دوم کے بنیادی اُمور

اس اِرتفاق میں اُن اُمور اور آداب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، جو انسان کے طعام، لباس، نشست و برخاست، خلوت و جلوت، رہائش، نیز غم اور مسرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً طعام کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ انسان مردہ جانوروں کے گوشت سے پرہیز کرے اور ان جانوروں کے گوشت سے بھی جن کا مزاج غیر معتدل ہو۔ ہر سلیم الطبع اور معتدل مزاج شخص ایسے کھانے سے یقینی طور پر اِجتناب کرے گا۔ اسی طرح کھانا عمدگی سے تیار کیا جائے۔ نفاست سے پیش کیا جائے۔ کھانے سے پہلے ہاتھ منہ پانی سے اچھی طرح دھولیے جائیں۔ صاف پانی استعمال کیا جائے اور برتن میں ڈال کر پیا جائے، نہ کہ جانوروں کی طرح برتن میں منہ ڈال کر پیا جائے۔

عام صفائی کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنا جسم صاف اور نجاست سے پاک رکھے۔ منہ میں پیدا ہونے والے تعفن کو مسواک اور منجن کے استعمال سے دُور کرے۔ بغل اور زیرِ ناف کے بال برابر صاف کرے۔ سر اور داڑھی کے بال عمدہ طریقے سے کٹوائے۔ ستھرے ملبوسات زیبِ تن کرے اور گھر کو صاف رکھے۔ لباس کے ضمن میں اس بات پر خصوصی توجہ دے کہ اس سے جسم کا بیش تر حصہ ڈھکا رہے اور ستر پوشی بھی مکمل ہو۔

www.rahimia.org

مستقبل کے حالات وقواعد سے خود کو آگاہ رکھنے کا میلان انسان میں طبعی ہے۔ نیز ساری دُنیا میں عام طور پر اس کا رواج پایا جاتا ہے۔ اس لیے بعض موقعوں پر خوابوں کی تعبیرات اور مستقبل کے علم کے لیے رمل اور علمِ نجوم سے مدد لی جاتی ہے۔ کیوں کہ آنے والے حالات کو معلوم کرنے کا فکر کم وبیش دنیا کی تمام اقوام میں پایا جاتا ہے۔

ارتفاقِ دوم میں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تقریر کی فصاحت، لہجے کی عام فہمی اور اُسلوب کی سلاست (بیان کے طریقۂ کار کی بہتری) کا بھی خیال رکھے اور ان خصائص (خوبیوں) کو اپنی گفتگو میں استعمال بھی کرے۔

ارتفاقِ دوم کے پانچ بنیادی شعبے

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک جب انسان اپنی طبعی ابتدائی ضرورتیں حاصل کر لیتا ہے تو اجتماعی زندگی کی اصلاح کے تجربے کرتا ہے۔ وہ ارتفاقِ اوّل کے امور اور چیزوں کو زیادہ صفائی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ ارتفاقِ دوم میں ترقی کرتا ہے، جسے حضرت شاہ صاحبؒ مندرجہ ذیل پانچ شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں:

1۔ حکمتِ معاشیہ Science of Livelihood

یہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کھانے پینے، لباس، مکان، نشست و برخاست اور گفتگو کے آداب وغیرہ پر انسانی اجتماعی تجربات وغیرہ کی روشنی پڑتی ہے اور حُبِّ جمال اثر انداز ہوتی ہے۔

2۔ حکمتِ اکتسابیہ Science of Professions

یہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب بعض لوگ اپنی اپنی استعداد اور حالات واسباب کے مطابق کسی خاص پیشے میں مہارتِ تامہ پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی کپڑا بُننے کا ماہر بن جاتا ہے، کوئی اناج پیدا کرنا اپنا مخصوص پیشہ بنا لیتا ہے اور کوئی فنِ تعمیر میں کمال پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح انسانی معاشرے میں پیشہ وارانہ تقسیم پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وَجہ سے

بعض لوگ اپنے اپنے مخصوص کاموں میں پوری پوری مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔

3۔حکمتِ منزلیہ Science of Home

یہ گھر بنا کر بیوی بچوں سمیت رہنے، اُس کے امور کو نظم ونسق سے جاری کرنے، اقربا اور دوستوں کے ساتھ حسنِ معاشرت سے پیش آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے ''تدبیرِ منزل'' یعنی خاندانی زندگی کو بہتر طریقے پر قائم رکھنا کہا جاتا ہے۔ اس میں خاص طور پر ان چار باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔

الف: خاوند بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق اور اَحکام

چوں کہ نوعِ انسانی کے قیام کے لیے افزائشِ نسل نہایت ضروری ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ خاوند اور اس کی بیوی آپس میں خوش گوار زندگی بسر کریں۔ اولاد کی پرورش میں عورت کا حصہ طبعی طور پر زیادہ ہے۔ نیز گھر کے کاموں کو اچھے انداز میں سرانجام دینے کی صلاحیت بھی اس میں کامل طور پر موجود ہے۔ اس کی فطرت میں فرماں برداری اور اطاعت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔ مرد کے اوصاف عورت کی صفات سے اکثر مختلف ہیں۔ یہ فہم ودانش اور پیچیدہ معاملات کو سلجھانے میں عام طور پر عورت پر فوقیت رکھتا ہے۔ مشکلات سے نمٹنا، سخت محنت اور مشقت کے کاموں کو بجا لانا بھی گویا اس کے ذمے ہے۔ ان خوبیوں کی جانب وہ طبعاً مائل ہے۔

یہ دونوں مل کر اپنی (صنفی) خصوصیات کے اختلاف کے باوجود بہتر طور پر ''تدبیرِ منزل'' (خاندانی نظام کو بہتر طریقے پر قائم کرنے) کے لیے ایک دوسرے کے محتاج اور ایک دوسرے کے معاوِن ہیں۔ چوں کہ مرد عام طور پر عورت کی نسبت زیادہ غیرت مند ہوتا ہے، نیز اس میں مردانگی اور شجاعت کے جذبات کا ملاً موجود ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہر مرد کے لیے ایک مخصوص عورت ہو، جس میں دوسرے کو دخل اندازی کی اجازت نہ ہو۔ مرد اور عورت کے نکاح کی تقریب کھلی مجلس میں ہونی چاہیے، تاکہ ہر وہ دوسرا شخص جو اس عورت کو اپنانے کا خواہش مند ہو، بہ چشمِ دید دوسرے شخص کے ساتھ منسوب ہوتا

دیکھ کر اس کی جستجو سے کنارہ کش ہو جائے۔ مرد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ''حق مہر'' کے ساتھ اپنی عورت کی مزید دیگر ضروریات بھی پوری کرے، تا کہ عورت کے دل میں اس کے لیے وَفا، محبت اور تکریم کے جذبات پیدا ہوں۔

شادی کے بعد یہ ضروری ہے کہ میاں بیوی اپنے تعلقات بہت دلچسپ بنائیں، تا کہ وہ زندگی کی اس طویل شاہراہ پر حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کے ہم سفر، شریک اور معاوِن ثابت ہو سکیں۔ اگر آپس میں ناگوار تعلقات اور کشیدگی اس درجے کو جا پہنچے کہ باہم ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے تو ایسے موقع پر طلاق بہتر حل ثابت ہوتی ہے کہ بہ رضا و رغبت علاحدہ ہو کر زندگی کے باقی ایام آرام اور چین سے گزار لیں۔

ب: اولاد اور ماں باپ کے باہمی حقوق

تدبیرِ منزل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد کی پرورش، تربیت عمدہ طریقے سے ہو۔ انھیں بہتر تعلیم دی جائے۔ ان کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ نیز ان میں اَخلاق کی بلندی پیدا کرنے کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے۔

اولاد پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کوششوں، مشقتوں اور تکلیفوں کا پورا خیال رکھیں، جو ان کی مناسب تربیت اور پرورش کے لیے اُن کے والدین نے برداشت کی تھیں۔ وہ ان کی عزت و تکریم سے اپنا دامن نہ بچائیں۔ ان کا کہنا مانیں۔ کبھی تلخ کلامی سے پیش نہ آئیں۔ وہی سلوک و احسان کریں، جو انھیں والدین کی جانب سے ملا تھا۔

ج: خدمت گاروں کے حقوق

اس ضمن میں حاکم اور محکوم کا باہمی تعلق بھی اہم درجہ رکھتا ہے۔ انسانی نفسیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ رُوئے زمین پر بسنے والے تمام انسان مزاجاً یکساں نہیں ہوتے۔ بعض طبعی طور پر قیادت کے اہل ہوتے ہیں اور حاکم بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں تو بعض اس سے محروم رہتے ہیں۔ تمام انسانوں کے درمیان یہ اختلاف ان کی استعداد کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ ہمارے مشاہدے میں روز ہی ایسے لوگ آتے

ہیں جو پیدائشی طور پر روشن دماغ اور اعلیٰ فہم کے مالک ہوتے ہیں اور ایسے بھی جو کم فہم اور کُند ذہن ہوتے ہیں۔ چناں چہ ایک بہتر زندگی کی خاکہ کشی (تعمیر) کے لیے ان دونوں اقسام کا وجود لازمی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ نتیجتاً ایک کی مسرت اور راحت دوسرے کی مسرت اور راحت سے وابستہ اور اس کی رہینِ منت (احسان مند) ہے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ دونوں اس باہمی رشتے کو مضبوطی سے قائم رکھیں۔ نیز ایک دوسرے کے رنج وغم، شادی ومسرت میں برابر کے شریک ہوں۔

د: صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے حقوق

اس سلسلے کی چوتھی کڑی عام انسانوں کے آپس میں رہن سہن اور تعلقات سے متعلق ہے۔ بعض افراد اِتفاقی حادثات اور بیماریوں کے سبب مختلف تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ذی استعداد (قابل اور صلاحیت) لوگوں کو ان تکلیف زدہ لوگوں کی مدد کرنی چاہیے اور ان کا سہارا بننا چاہیے۔ ان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھنے چاہئیں، تاکہ یہ لوگ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ اسی طرح تمام شعبوں میں ایک دوسرے کی معاونت بھی اچھی معاشرت کا جزو ہے۔ علاوہ ازیں مشکل اوقات میں رشتے داروں کا ایک دوسرے کے کام آنا' جسے شرعی اصطلاح میں ''صلہ رحمی'' کہتے ہیں، ایک اہم اور ضروری فرض ہے۔

4۔ حکمتِ تعاملیہ Science of Trade

جب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں تو لین دین اور خرید وفروخت کرنا، اُدھار لینے دینے، رہن وغیرہ کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس طرح باہمی تعاون سے طے کیے جانے والے معاملات سے حکمتِ تعاملیہ پیدا ہوتی ہے۔

5۔ حکمتِ تعاونیہ Science of Co-operation

جب انسانی اجتماع وسیع ہوجاتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو کفالت، مشترکہ کاروبار، وکالت، مزدوروں سے کام لینے وغیرہ کے سلسلے میں

حکمتِ تعاونیہ کے اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں ملک اور قوم کی ترقی کے لیے تعاونِ باہمی پر مبنی انجمن سازی اور جماعتوں کی تشکیل بھی شامل ہیں۔

ان پانچوں امور پر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''البُدورُ البازِغہ'' کی پانچ فصلوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان تمام کے بنیادی اساسی امور اور قواعد وضوابط کی نشان دہی کی ہے۔

ارتفاقِ دوم کی سطح پر انسانی معاشرے میں پہلے درجے کی تنظیمات (Organizations) قائم ہوتی ہیں۔ چناں چہ معاشی امور کی انجام دہی سے وابستہ افراد کی جماعتیں ہوں یا پیشوں سے وابستہ لوگوں کی انجمنیں ہوں، گھریلو اور خاندانی نظام سے وابستہ اجتماعیت ہو یا باہمی تعاون سے متعلق جماعتیں اور تنظیمیں ہوں، ان تمام کا تعلق ارتفاقِ دوم کے ساتھ ہے۔ گویا ارتفاقِ دوم کے لوازمات میں سے یہ ہے کہ لوگ کسی نہ کسی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنے اپنے شعبے میں مہارت اور استعداد حاصل کرتے ہوئے انسانی معاشرے کی ترقی کے لیے کردار ادا کریں۔

جب انسانی معاشروں کی انجمنیں اور جماعتیں طاقت ور اور مضبوط ہوتی ہیں تو اُن کے باہمی امور کو نمٹانے کے لیے ایک ملک میں قومی سطح پر سیاسی، معاشی نظام پر مبنی حکومتی اتھارٹی قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہاں سے ارتفاقِ سوم کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ ملکی سطح کے سیاسی اور معاشی امور کی چھان پھٹک کی جاتی ہے اور رائے کلی، حُبِّ جمال اور ایجادات کی روشنی میں تجربات کر کے خوب سے خوب تر ملکی نظام بنایا جاتا ہے۔

☆

www.rahimia.org

مقالہ 12

ارتفاقات

(ارتفاقِ سوم و چہارم)

www.ferimia.org

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

”جاننا چاہیے کہ ارتفاقات کے عملی نظام کی حیثیت انسانی معاشرے میں ایسی ہی ہے، جیسے انسانی جسم میں دل کی۔ تمام شریعتوں کا پہلا اور براہِ راست مقصد ارتفاقات کا عملی نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسی سے تمام مقدس کتابیں بحث کرتی اور رہنمائی دیتی ہیں۔

ارتفاقات کے عملی نظام کے قیام، فروغ اور استحکام کے اسباب یہ ہیں:

(1) ارتفاقات کے عملی نظام کا قیام درجِ ذیل اسباب سے ہوتا ہے:

(الف) معاشرے کے عقل مند اور حکمت پسند لوگوں کے تجربات اور اخذ و استنباط سے ارتفاقات کا نظام قائم ہوتا ہے۔

(ب) یا حق تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اُن لوگوں کے دلوں میں الہام کیا جاتا ہے، جنھیں نورِ مَلکی کی تائید حاصل ہوتی ہے (انبیاؑ کے قائم کردہ نظام)۔

(2) ارتفاقات کے عملی نظام کا فروغ اور پھیلاؤ کے اسباب یہ ہیں:

(الف) کسی ایسے بڑے اور طاقت ور حکمران کی جاری کردہ رسومات کا نظام کہ لوگ جس کی فرماں برداری اور اطاعت ضروری سمجھتے ہیں۔

(ب) ارتفاقات کو پورا کرنے کے لیے عملی نظام کا ایسا (نبوی) طریقہ، جسے لوگ وجدانی طور پر اپنے سینوں میں محسوس کریں اور اپنے دلوں کی گواہی سے قبول کرلیں۔“(99)

ارتفاقات

(ارتفاقِ سوم و چہارم)

ارتفاقِ سوم

یہ ارتفاق، سیاستِ مُدُن (شہریت) سے تعلق رکھتا ہے جو مختلف شہروں کے مختلف باشندوں کے باہمی تعلقات کا نام ہے۔ اس کی مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی سے ملتی ہے۔

ارتفاقِ سوم کی حقیقت اور مفہوم

اس ارتفاق میں ہر قوم' خواہ اس کے افراد کی تعداد لاکھوں سے ہی زیادہ کیوں نہ ہو، ایک شخص کے مانند سمجھی جاتی ہے۔ چناں چہ جب قوم کے کسی ایک فرد کو کوئی نقصان یا غم پہنچتا ہے تو اس سے اس شخص کی طرح پوری قوم متأثر ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کہ جب جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم اس سے متأثر ہوتا ہے۔ اس منزل میں لوگوں کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کا شمار بھی نہیں کیا جاتا اور پھر انسان ان سب میں شائستگی اور حسن کا طلب گار رہوتا ہے۔ چوں کہ انسان کا اپنی تمام ضروریات کو تنہا حسبِ منشا عمدگی سے پورا کرنا ناممکن ہے، اس لیے اسے مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے اجتماعی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے، جسے ''تمدن'' کہا جاتا ہے۔

قومی سیاسی، معاشی اور عسکری نظام کی ضرورت اور فرائض

اس قسم کے معاشرے میں چوں کہ ہر فرد کا پیشہ دوسرے فرد کے پیشے سے مختلف ہوتا ہے، اس لیے باہمی تعاون اور مدد کی ضرورت لازمی ہو جاتی ہے۔ پھر ان میں ایک سیاسی نظام کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیوں کہ یہ اُن کی ضرورت ہے۔ باہمی لین دین کے لیے انھیں تمام امور سے قبل ایک جنسِ مبادلہ (سِکّے) کی حاجت ہوتی ہے، جسے وہ غور و فکر کے بعد سونے چاندی کے سکوں کو ڈھال کر پورا کرتے ہیں۔ کاروبار کی اقسام اور ان کی زیادتی کے سبب ہر فرد اپنے پیشے میں اپنی صلاحیت کے مطابق عمدگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس یہیں سے تمدن کی صحیح معنوں میں تکمیل ہوتی ہے۔ چوں کہ اہلِ شہر کو آج کی اصطلاح میں ''اہلِ تمدن'' کہا جاتا ہے، ان کی تعداد بے شمار ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہر وقت ایک مکمل عادلانہ نظام کے پابند رہیں۔ کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔ چناں چہ کسی حکمران کا ہونا ضروری ہے۔

حکمران کا انتخاب اور اُس کے اوصاف اور فرائض

حکمران کے لیے ضروری ہے کہ اُسے عقل مند لوگوں نے متفقہ طور پر منتخب کیا ہو۔ وہ فی الواقع (واقعی) ایسی قوت و صلاحیت کا مالک بھی ہو، جو لوگوں کو مقررہ قوانین کی پیروی پر مجبور کر سکے، تاکہ بدامنی اور انتشار نہ پھیلے۔ اس حاکم کو مختصراً جن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے، ان میں شجاعت، بردباری، تحمل، شیر دِلی اور عمدہ اَخلاق سب سے اہم ہیں، تاکہ لوگ اس سے متنفر نہ ہوں، بلکہ مرعوب ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے نظم و نسق کو چلانے کا سلیقہ بھی رکھتا ہو۔ معزز اور شریف ہو۔ ہمیشہ رعایا کی بھلائی کا خیال رکھے۔ حکمتِ عملی برتے۔ اِخلاص کا پیکر ہو، تاکہ ہر دلعزیزی حاصل ہو سکے۔

اس حاکم کو یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے حد درجے شعور اور ہوشیاری کا ثبوت دے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت یا حاکم کو اپنی رعایا کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک رَوا رکھنا چاہیے، تاہم مجرمین کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں

سستی سے قطعاً کام نہ لیا جائے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ مجرم کو سزا' جرم ثابت ہونے کے بعد دی جائے۔ علاوہ ازیں جو لوگ نہایت دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیں، اُن کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے۔ مختصر یہ کہ حاکم ایسا مردم شناس اور روشن دماغ ہو کہ ایک جھلک دیکھ کر ہی آدمی کی اندرونی صلاحیتیں پہچان لے۔ نیز وہ ایسی گہری نظر رکھتا ہو کہ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے اور اس کے نتائج سے باخبر ہو جائے۔

حکومتی شعبے اور ان کے ذمہ داران کے فرائض

ملک کا حاکم تنِ تنہا سارے نظامِ مملکت کو چلانے سے قاصر ہے۔ تمام شعبہ ہائے مملکت کے نظام کو بہتری اور عمدگی سے چلانے کے لیے وہ مددگاروں کا محتاج ہے۔ چناں چہ وہ خوب ٹھوک بجا کر مددگار عملے کا انتخاب کرے۔ تقرر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھے کہ عملے میں کسی ایسے شخص کو عہدہ نہ مل جائے کہ جسے مستقبل میں اپنی بدنیتی اور خیانت کے سبب برطرف کرنا مشکل ہو جائے۔ اکثر لوگ ذاتی اغراض کی بنا پر حکومت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بس ضروری ہے کہ پہلے انھیں سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جائے، ورنہ بہ صورتِ دیگر انھیں معطل کیا جائے۔ حاکم کو خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کسی کارکن سے اس کی استعداد اور استطاعت سے زیادہ کام نہ لے۔

بیت المال کا قیام اور مالی وسائل کی فراہمی

حکومت کے وسیع کاروبار کو بہ خوبی چلانے کے لیے مالی وسائل کی ضرورت لازمی پڑتی ہے۔ چناں چہ بہتر یہی ہے کہ ایک بیت المال قائم کیا جائے، جس کی آمدنی کا ذریعہ مختلف ذرائع ہوں۔ آمدن کے ذرائع کو صحیح معنوں میں اس طرح کارآمد بنایا جائے کہ کوئی بھی ذریعۂ آمدن ادھورا نہ رہ جائے۔ ہر جگہ سے صحیح طور پر آمدنی حاصل ہو۔ ان ذرائع میں عام طور پر زمینی ذخائر معدنیات اور زراعت وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ علاوہ ازیں ضرورت کے وقت کچھ ٹیکس بھی لگائے جا سکتے ہیں، لیکن ٹیکس عائد کرتے وقت ہمیشہ عدل سے کام لیا جائے اور رعیت پر غیر معمولی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ ٹیکس محض انھیں لوگوں سے وصول کیے

جائیں، جن کا مال روز افزوں ترقی کرتا ہو، یا پھران سے جو بڑے صنعت کار ہوں۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ٹیکس صرف انھیں سے وصول کیا جائے، جن کی آمدنی ضروریاتِ زندگی کی کفالت سے زیادہ ہو۔

عسکری طاقت پیدا کرنا اور فوجی نظام کا قیام

اپنی قوم کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے حاکم کو افواج کی تنظیم بہتر طریقے پر کرنی چاہیے۔ نیز افواج کو منظّم، وفادار اور طاقت ور بنانے کے لیے مناسب ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ افواج کا اعتماد اور وفاداری اِسی پر موقوف ہے کہ حاکم زیادہ سے زیادہ اپنی رعایا کا خیال رکھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں ان کے لیے مخلصانہ اور بے لوث جذبات کی پرورش کرے۔

انسانی سماج کی درستگی کے پانچ بنیادی اُمور

تیسرے ارتفاق میں سیاسی نظام کے لیے مندرجہ بالا باتیں ذہن نشین کرنی ضروری ہیں اور انسانی معاشرے کو صحت مند رکھنے کے لیے حسبِ ذیل پانچ اُمور لائقِ توجہ ہیں:

1۔ حرص، بخل اور حسد سے بچانا

یہ وہ مذموم خصائل ہیں جو افرادِ معاشرہ کے دلوں میں اختلاف اور کشیدگی کو جنم دیتے ہیں۔ اگر ان اِختلافات اور کشیدگی کو ختم نہ کیا جائے تو نوبت قتل و غارت گری تک جا پہنچتی ہے۔ ایک بااختیار اور قومی سیاسی نظام کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے باہمی جھگڑوں کا منصفانہ طور پر فیصلہ کرے اور اپنی قوت کے سبب باہمی اختلاف کو ختم کردے۔

2۔ بداَخلاق لوگوں سے بچانا

بسا اوقات معاشرے کے کچھ لوگ مخربِ اَخلاق (اَخلاق کو بگاڑنے والے) عمل میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ نیز ان پر حیوانی جذبات کا غلبہ جنون کی حد تک طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو سزاؤں اور تنبیہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ چناں چہ ضروری ہے

کہ وہ تمام ذرائع اختیار کیے جائیں جو انھیں ناپاک ارادوں سے باز رکھ سکیں، ورنہ قوی اندیشہ ہے کہ آگے چل کر وہ پورے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔

3۔استحصال کرنے والے شرپسندوں سے بچانا

معاشرے کا وجود بالکلیہ ایسے افراد سے پاک نہیں ہوتا، جن کا مقصود اجتماعی نظام کی خوبی اور یک جہتی کو درہم برہم کرنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہر وقت موقع کی تاک اور گھات میں رہتے ہیں اور جہاں اور جب موقع ملے، دوسروں کا مال لوٹ کھسوٹ لیتے ہیں۔ اس چھین جھپٹ اور ڈاکو پن کے پسِ پشت حکومت پر قابض ہو کر اپنے ناجائز حوصلوں کی تکمیل کا مذموم جذبہ کارفرما ہے، ایسے بدنیت، ہر قسم کے شرپسند عناصر کو تکمیلِ مقاصد کے لیے اپنا شریکِ کار بنا لیتے ہیں۔ ایک بہترین سیاسی نظام کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت ایسے فتنہ سامان شرانگیز عناصر کے خلاف جہاد کے لیے کمر بستہ رہے۔

4۔عدل وانصاف کا قیام

انسانی اجتماع کو بہترین شکل میں قائم رکھنے کے لیے اُمت کے مفکرین کے پیشِ نظر ہر دور میں ایک نصب العین رہا ہے۔ ان کی تمام تر جدوجہد کا مقصد اس ارفع و اعلیٰ نصب العین کو حاصل کر لینا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ معاشرے میں عدالت اپنی مکمل ترین شکل میں قائم رہے۔ چناں چہ ایک اچھے سیاسی نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ حصولِ مقصد کے لیے ان مفکرین کے ساتھ مکمل تعاون کرے۔

5۔اَخلاقی اَقدار کا فروغ

خارجی جھگڑوں اور دنیا کے چکروں میں پھنس کر انسان اپنے اَخلاق اور مذہبی تقاضوں کی تکمیل سے غافل ہو جاتا ہے۔ نیز صحیح دین اور اس کے فرائض یکسر بھلا بیٹھتا ہے۔ اچھے سیاسی نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان فراموش کردہ اَخلاقی اقدار اور فرائضِ منصبی کے احیا کے لیے رعیت کو وقتاً فوقتاً پند و نصائح کرتا رہے اور انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرے۔

ارتفاقِ چہارم

ارتفاقِ چہارم کی حقیقت اور مفہوم

اس ارتفاق میں مختلف قوموں کے باہمی روابط اور تعلقات پر بحث کی جاتی ہے۔ جب ملکی حدود دُور دراز تک پھیل جاتی ہیں اور انسانی آبادی بڑھ جاتی ہے تو سارا ملک مختلف صوبوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں گورنر اِن صوبوں کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ ہر صوبہ اپنی کفالت کے لیے آمدنی کے چند ذرائع رکھتا ہے اور محافظت کے لیے فوج، لیکن افراد کے طبائع میں اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ان میں شر و فساد راہ پا جاتا ہے۔ جذبات کی رَو میں وہ صحیح و غلط کا امتیاز قائم نہیں رکھ پاتے اور اکثر غلط راہ پر لگ جاتے ہیں۔ آپس کی کشیدگی اور رقابت کے سبب ایک فرد دوسرے کے مال و متاع، زر وَ زمین کو غصب کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ جب حالات ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیں تو ان کو ایک ایسے حاکم کے ماتحت رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے، جس کے پاس فوج اتنی کثیر اور طاقت ور ہو کہ کوئی اس سے مقابلے کی جرأت نہ کر سکے۔ جب کبھی ایسا قوی حکمران مل جاتا ہے، جو خود بھی صالح نظام کا تابع ہو تو بقیہ تمام طاقتیں اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں اور اس کی اطاعت گزار بھی۔ نتیجتاً افراد کی زندگی مامون اور مسرور ہو جاتی ہے۔

چوں کہ کوئی قوم بھی کلیتاً شر پسند عناصر کے وجود سے خالی نہیں ہوتی، اس لیے حکمران کو جنگ و جدل کی ضرورت بھی پیش آتی ہے، تاکہ تمدنی نظام میں خلل اندازی کرنے والوں کو قانون کا پابند کیا جائے۔ ان میں سے ان کو بالکل ختم کر دیا جائے، جن سے آگے چل کر قوم کو گزند یا آزار (تکالیف) پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اکثر اوقات حکومت کے مکمل تسلط کے باوجود حاکم کو تلوار اُٹھانی پڑتی ہے۔ کیوں کہ درندہ صفت لوگ فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتے ہیں۔ نتیجتاً ملک سے امن و امان رُخصت ہوتا ہے۔ اس پر

www.rahimia.org

خوف و ہراس کی ایک عام فضا طاری ہو جاتی ہے۔ جنگ کے لیے فوج اور ساز و سامان کی ضرورت لازمی ہے۔ چناں چہ ملک میں فوجی طاقت رہنی چاہیے اور مرکزی خزانہ بھی پُر رہنا چاہیے، تاکہ ہر فتنے کو کچلا جا سکے۔

ایسے حکمران کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنگ اور صلح کے موقعوں کو پہچانتا ہو۔ اس کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنی بصیرت، آگہی اور موقع شناسی کا اس طرح استعمال کرے کہ مخالفین کی قوت کم سے کم تر ہو جائے اور وہ دوبارہ سر اُٹھانے کے قابل نہ ہوسکیں۔ علاوہ ازیں ان تمام ممالک میں جو اس کے باغی اور دشمن ہیں، جاسوسوں کا ایسا جال پھیلا دے کہ ان کی ہر خفیہ سرگرمی، اِرادے اور فیصلے سے قبل از وقت ہی آگاہی ہو جائے، تاکہ کسی فتنے کے رونما ہونے سے پہلے ہی اس کو ختم کر دیا جائے۔ الغرض! اس کا دشمن اس درجے بے بس ہو جانا چاہیے کہ وہ اپنے کم تر اور وفادار ہونے کا ثبوت اپنے قول اور عمل سے پیش کرے۔ محض زبانی یقین دہانی پر بھروسہ نہ کر لیا جائے، بلکہ اُس وقت تک اس سے خبردار رہا جائے جب تک وہ اپنے بے لوث اور مخلص ہونے کا واضح ثبوت اپنے عمل سے نہ پیش کر دے۔

ان ارتفاقات پر تمام عالَم کا اتفاق

باوجود ملکی اور مذہبی اختلافات کے، تمام عالَم کا اُصولی طور پر ان تمام ارتفاقات پر اتفاق ہے۔ سبھی ان کی خوبیوں کے معترف اور ان کے پابند ہیں۔ اسے یوں سمجھا جائے کہ ایک انسان کسی غیرآباد علاقے میں پیدا ہوتا ہے، چناں چہ وہ رسمی تعلیم سے تو ضرور بے بہرہ رہ جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اسے اپنی بھوک، پیاس، لباس اور جنسی خواہشات کی تکمیل کی ضرورت یقیناً پیش آتی ہے۔ چناں چہ وہ خوراک و لباس کے علاوہ گرمی و سردی اور بارش کے موسم میں کسی پناہ گاہ کا ضرور محتاج ہوگا۔ جنسی خواہش اسے مجبور کرے گی کہ وہ اپنی مخالف جنس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرے۔ نتیجتاً اولاد پیدا ہوگی۔ اس سے یقیناً اس کی نسل میں اضافہ ہوگا۔ مکانوں کی ضرورت بھی اسی رفتار سے بڑھے گی، حتیٰ کہ وہ چھوٹا سا خاندان قبیلے میں تبدیل ہو جائے گا۔ آخرکار وہ قبیلہ بھی اضافے، نشو ونما اور

پھیلاؤ کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا ایک قوم بن جائے گا۔ آبادی کے اضافے کے باعث آپس میں تعلقات قائم ہوں گے۔ لین دین کی نوبت آئے گی۔ اس اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے یقیناً پہلے ارتفاقِ اوّل اور پھر دوم، سوم اور چہارم کی ضرورت پیش آئے گی اور ایک اچھا خاصا معاشرہ وجود میں آجائے گا۔ آخری ارتفاق میں ملکوں سے مل کر ایک بین الاقوامی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

انسانی معاشرے میں ارتفاقات کی چار منازل

القصہ! حیاتِ انسانی ان چار منازل سے گزرتی ہے:

☆ پہلی منزل میں انسانی سوسائٹی جانوروں کی زندگی سے قدرے افضل ہوتی ہے۔

☆ دوسری منزل میں یہ سوسائٹی قابلِ ذکر طور پر ترقی کرتی ہے۔

☆ تیسری منزل میں انسان کی ایک قومی زندگی مرتب ہوتی ہے۔

☆ چوتھی منزل میں قدم رکھتے ہی ایک بین الاقوامی تنظیم وجود میں آجاتی ہے، جسے ہم آج کی اصطلاح میں ''انٹرنیشنل آرگنائزیشن'' کہہ سکتے ہیں۔

انسانی معاشرے کے یہ چاروں درجے (ارتفاقات) یکے بعد دیگرے ترتیب سے آتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ دوسری منزل پہلی منزل سے پیشتر معرضِ وجود میں آچکی ہو۔ اجتماعی شکل یا معاشرے دوسرے درجے میں اُس وقت قدم رکھتے ہیں، جب پہلا درجہ عبور کر چکے ہوں۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ دوسرا درجہ اُسی وقت وجود میں آئے، جب پہلا تکمیل کے سارے مراحل طے کر چکے۔ نیز اس کا ہر پہلو حسن وخوبی کے عین معیار کے مطابق ہو۔

معاشرے کا ہر درجہ دو اقسام کے عناصر پر مشتمل ہوتا ہے:

ایک عنصر اس کے وجود کے لیے لازمی ہوتا ہے، نیز معاشرے کا رُکن ہوتا ہے۔

دوسرا اگر معدوم (ناموجود) بھی ہو تو معاشرے کی بنیاد متأثر نہیں ہوتی۔ معاشرے کا وجود تو قائم رہتا ہے، البتہ اس میں حسن وخوبی کی کمی رہ جاتی ہے۔

معاشرے کے ہر دوسرے درجے میں انسان اس وقت بھی پہنچ سکتا ہے، جب کہ

درجۂ اوّل کے صرف ارکان ہی موجود ہوں۔ مثلاً جب انسان کو اپنی طبعی حاجتوں یعنی بھوک، پیاس اور جنسی جذبے کی آسودگی (تکمیل) میسر ہو۔ پہلی منزل میں حسن وخوبی پیدا کرنے والے عناصر دوسری منزل میں قدم رکھنے کے بعد بھی پیدا ہو سکتے ہیں، بلکہ بسا اوقات تو انسان معاشرے کی ہر بلند منزل پر متمکن ہونے کے بعد پہلے درجے کے عناصر میں حسن وخوبی اور کمالِ شائستگی (سلیقہ) پیدا کرنے پر زیادہ قادر ہو جاتا ہے۔

یہ تھا ارتفاقات کا باب، جس کا ہم نے تعارف کروایا ہے۔ تاہم ارتفاقات کی جس قدر بھی کیفیت بیان کی گئی ہے، اس میں مزید تجزیہ اور وضاحت کی گنجائش باقی ہے۔

سماجی اداروں کی کمزوری کے اسباب اور ضرورتِ انقلاب

انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے جب مذکورہ ادارے قائم ہوتے ہیں تو وہ کچھ مدت گزرنے کے بعد مختلف حادثات اور انتشار کا شکار ہو کر کھوکھلے پڑ جاتے ہیں۔ ان میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

1۔ مفادِ عامہ کی پامالی

ان خرابیوں کا ایک بڑا اور اہم سبب مفادِ عامہ کو نظر انداز کرنے والے وہ افراد ہوتے ہیں، جن کے ہاتھ میں اپنی رہنمائی اور معاشرے کے نظام کی باگ ڈور آ جاتی ہے۔ یہ اجتماعی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اپنی حیوانی اغراض کی تکمیل میں ہمہ تن منہمک اور غرق ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ تہذیب وتمدن کی بنیاد خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ایسے نازک موقع پر معاشرے کو ہلاکت سے بچانے کے لیے فطرت ایسی طاقت ور اور باکردار شخصیتیں پیدا کرتی ہے، جو معاشرے کی ازسرِنو تطہیر (پاکی) اور تزکیے (ترقی) کا کام سر انجام دیتی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کو اپنی صحیح منزل کی طرف گامزن کر دیتی ہیں۔

2۔ حکمرانوں کی نفس پرستی

یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ عیش پرستی اور آرام کے نت نئے سامان تنہا افراطِ زر کا نتیجہ بنتے ہیں۔ جب سربراہِ مملکت عیش میں مبتلا ہو جائیں تو ان کی بے راہ روی کے مہلک

www.rahimia.org

نتائج غریب عوام کو (مہنگائی کی صورت میں) بھگتنے پڑتے ہیں۔

3۔ بھاری ٹیکسوں کا بوجھ

عیاشی کے سامان کے حصول کے لیے مزدور، کسان، تاجر اور صنعت کار پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ جن کی ادائیگی کے لیے وہ جانوروں کی طرح دن رات کام کرتے ہیں۔ اتنی مشقت کے بعد بھلا اُن کے پاس اتنی مہلت کہاں ہوتی ہے کہ خدا' یا آخرت کو یاد کرسکیں۔ بھوکا اور ننگا انسان نہ اپنی زندگی سنوار سکتا ہے اور نہ آخرت۔

4۔ بے کاری اور بے روزگاری

حکام کی نفس پرستی، نیز بھاری ٹیکسوں کو عائد کرنے کے علاوہ سوسائٹی کی بربادی کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے۔ نتیجہ سرکاری خزانے کے لیے ایک بوجھ ثابت ہوتے ہیں۔ اب اگر ایک مطمئن زندگی کسی طور پر گزر سکتی ہے تو یوں کہ ٹیکس تھوڑے ہوں اور ملازمین صرف حسبِ ضرورت ہوں۔

5۔ غیر صحت مند پیشوں کا انتخاب

علاوہ ازیں تمدن کی جڑ ایک اَور سبب سے بھی کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ صحیح پیشہ نہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً ایک شخص جو مفلس ہے اور بھوکا بھی، وہ مجبوراً ایسا پیشہ اختیار کرتا ہے، جو اُس کی بنیادی ضرورت کی کفالت پر بھی قادر نہیں۔ چناں چہ لازمی بات ہے کہ وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہوگا۔ وہ مجبور بھی ایسا کہ ہر غلط او ذلیل کام کر گزرنے سے بھی نہیں کترائے گا۔ دوسری طرف بعض لوگ باوجود اپنی جسمانی استقامت کے' مناسب کمائی کے جائز ذرائع کی طرف راغب نہیں ہوتے، بلکہ کم محنت سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی فکر میں غلط پیشوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

6۔ مطلوبہ پیداوار میں کمی

معاشرے کی برائی کے اسباب میں ایک قوی تر سبب یہ بھی ہے کہ آبادی کے

www.rahimia.org

تناسب سے پیداوار کا خیال نہ رکھا جائے۔ مثال کے طور پر کسی جگہ دس ہزار کی آبادی ہے، لیکن اس آبادی کا اکثر حصہ ملکی پیداوار میں اضافے کی فکر سے خود کو آزاد رکھتا ہے تو اس صورت میں اس آبادی کا فنا ہو جانا باعثِ تعجب نہیں۔

سماج کی درستگی کے لیے عادلانہ معاشی نظام کی ضرورت

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ معاشرے میں تنزل (زوال) ٹھیک اُس وقت شروع ہو جاتا ہے، جب ایک گروہ دوسرے گروہ کی معیشت پر قابض ہونے اور اس کے گزر اوقات کے وسائل محدود کر دینے کے دَرپے ہو جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اجتماعی معاشیات، اجتماعی اَخلاق پر قابلِ ذکر حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ چناں چہ اجتماعی اَخلاق کی استقامت اور درستگی کے لیے انسانی اجتماع میں عادلانہ معاشی نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔ جب تک ایسا کوئی نظام سماج میں قائم نہیں ہو لیتا، اس کے اجتماعی اَخلاق کا حسن پسِ پردہ رہ جائے گا۔ زندگی کے ایک پہلو کا اس کے دوسرے پہلو سے چولی دامن کا ساتھ رہتا ہے۔ چناں چہ ایک کی خرابی دوسرے پر یقیناً اثر انداز ہوتی ہے اور یہ معاشی حالات ہی ہیں جو انسانی اَخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

معاشرے کی حقیقت شاہ صاحبؒ کی نظر میں

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں انسانی اجتماع پورے طور پر مکمل ہو ہی نہیں سکتا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسے تکمیل کے زیادہ سے زیادہ قریب لایا جا سکتا ہے۔ اجتماع کی مثال جسم کے مختلف اعضا جیسی ہے۔ جس طرح ایک شخص مکمل طور پر تندرست نہیں ہو سکتا، اس میں کہیں نہ کہیں کوئی بے اعتدالی ضرور باقی رہ جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح انسانی سماج اپنی صحت میں مکمل اعتدال کا مدعی ہو ہی نہیں سکتا۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کے مطابق دراصل یہ انسان کے فطری میلانات ہی ہیں جو معاشرے اور اجتماعی زندگی کا منبع و مخزن ہے۔ چناں چہ آپؒ کے خیال میں

معاشرے کے کسی مقصد کو متعین کرنے کے لیے انسان کے فطری تقاضوں کی معرفت (پہچان) صحیح طور پر رہنمائی کرسکتی ہے۔ معاشرہ چوں کہ انسان کے فطری تقاضوں کا نتیجہ ہے، اس لیے اس کا اوّلین اور واحد مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ وہ انسانیت اور معاشرے کے تمام افراد کے فطری تقاضوں کی تکمیل کرے۔ یعنی لوگوں کی بنیادی ضروریات کے لیے سامان فراہم کرے، مثال کے طور پر کھانا، کپڑا اور جائے قیام۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں اقتصادی حالات کے بہتر بنائے جانے پر کافی زور دیا اور ارتفاقات کے متعلق اس قدر وضاحت اور تفصیل سے اپنے نظریات کو سپردِ قلم کیا ہے کہ اس کے بعد کسی تفصیل اور وضاحت کی گنجائش نہیں رہتی۔ آپؒ کی تلقین کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ ضرور کمائے اور بڑی حد تک خود بھی اپنے کھانے پینے کا انتظام کرے۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا اور سماجی بھلائی کا اُصول

حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی معاشرہ دوسرے اور تیسرے ارتفاق سے محروم نہ ہو۔ یہی وَجہ ہے کہ کسی نبی نے ترکِ معاشرہ کا حکم نہیں دیا کہ لوگ سماجی رشتوں کو ختم کرکے تنہا کسی جنگل میں ڈیرے ڈال لیں۔ کیوں کہ یہ چیز سراسر انسانی مفاد کے خلاف ہے۔

اکثر اوقات معاشرے کے افراد اپنی منزل کی ابتدائی ضروریات کو نامکمل چھوڑ کر دوسری منزل کی ضروریات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس سے معاشرہ مستحکم (مضبوط) نہیں رہتا۔ لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ کُل جاتا رہے تو جزو کو کم ازکم ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ یعنی مثال کے طور پر اگر ارتفاقِ چہارم ان کی گرفت سے نکل جائے تو وہ لازماً ارتفاقِ سوم کے پابند رہیں، کم ازکم اسی سے دست بردار نہ ہوں۔ اس طرح اگر تیسرا ارتفاق رخصت ہوتو دوسرے ارتفاق کی طرف رجوع ہوں۔ مگر چوں کہ لوگوں کو ارتفاق کی مختلف اقسام کا مکمل علم نہیں ہوتا، اس لیے وہ ایک ارتفاق پر قائم رہتے ہیں۔ جس کی وَجہ سے سوسائٹی میں خلل پڑتا ہے اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

ضرورتِ انقلاب

جب سوسائٹی میں غیر معمولی خلل واقع ہو، یعنی عام حالات بگڑ جائیں تو انقلاب لانا لازمی ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرہ جو اپنے افراد کی بنیادی ضروریات کو پورا نہ کرے، اسے آگ لگ جانا ہی بہتر ہے۔ وہ سوسائٹی اور وہ قوم، جس میں درندہ صفت انسانوں کی اکثریت ہو، اس کی مثال بعینہٖ اس جسم کی سی ہے جس میں ایک زہریلا پھوڑا موجود ہو کہ اگر بروقت اس کا آپریشن نہ کیا جائے تو یہ یقینی ہے کہ وہ نظامِ جسم کو درہم برہم کر کے اس کی ہلاکت کا سبب بنے۔ جو لوگ مفادِ عامہ کے اُصول سے واقف ہیں، یہ انھیں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی نازک صورت حال میں سوسائٹی کی بقا کے لیے اِنقلاب لائیں۔

اِنقلاب کنجِ عافیت (عافیت کا گھر) نہیں، بلکہ یہ ایک دشوار گزار اور مصائب سے پُر زندگی کا نام ہے۔ انقلاب کو کامیابی کی حدود تک پہنچانے کے لیے نہ صرف انسان کو جان و مال کی قربانی پیش کرنے کے لیے آمادہ کرنا پڑتا ہے، بلکہ اپنی دل پسند اشیا اور محبوب وطن کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس کام کا بیڑہ وہی اُٹھا سکتے ہیں، جو بے غرض، مخلص، متحمل، دلیر اور خود پر اعتماد رکھتے ہوں۔

اس قسم کے جہاد (انقلاب) میں کبھی دشمن سے سرد جنگ کرنی پڑتی ہے اور کبھی نوبت باقاعدہ لڑائی تک جا پہنچتی ہے۔ چناں چہ اس کی راہ میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، بہترین اعمال میں شمار ہوتا ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اسلام دنیا میں ارتفاقِ چہارم (انٹرنیشنل آرگنائزیشن) کے قیام کے لیے آیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر بڑی سے بڑی بین الاقوامی طاقت قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ چناں چہ یہ مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ مذکورہ ارتفاق کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مُسلَّم ہے کہ انٹرنیشنل آرگنائزیشن کا قیام ارتفاقِ سوم کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان اس کے تصور ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس کا تصور ہمیشہ دل میں رہنا چاہیے اور ہر اُس موقع کی تاک میں رہنا چاہیے،

www.rahimia.org

جس سے اس تصور کو ٹھوس حقیقت میں تبدیل کیا جا سکے۔

جب تک مسلمانوں کی بین الاقوامی سطح تک کوئی حکومت قائم نہ ہولے، انھیں چاہیے کہ وہ ارتفاقِ ثالث کی تکمیل میں لگے رہیں اور خود کو اَخلاقی دینی اور سیاسی اعتبار سے قوی تر بنائیں۔ جنگ کے لیے ہر وقت کمر بستہ اور چاق و چوبند رہیں۔ جنگ کے جدید طریقوں سے خود کو پوری طرح آگاہ رکھیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں جنگ کی رُوح تازہ ہو، حتیٰ کہ وہ خود اس کا مجسمہ بن جائیں۔ یعنی جہاد کا جذبہ ہر وقت اور ہر لمحے مسلمانوں میں موجود رہے۔

غلبۂ دین کے لیے سماجی حکمتِ عملی

شاہ صاحبؒ بھی جس حقیقت کی طرف رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، اس کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ دینِ حنیف (اسلام) ارتفاقِ چہارم یعنی بین الاقوامی حکومت کے قیام کے لیے آیا ہے۔ اس کا مکمل غلبہ اُسی وقت ہوگا جب اس کے علاوہ تمام ادیان کو مغلوب کر دیا جائے اور صرف اسلام کی شان و شوکت کو قائم کیا جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا انحصار تمام تر دینِ حنیف پر ہی ہے۔ کیوں کہ یہ انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہر انسان کو اپنی نیکوکاری اور خدا پرستی کے سبب اسلام ہی کو قبول کرنا چاہیے کہ اب اس کے بغیر خدا کی رضا کا حصول ممکن نہیں۔ اس سے رُوگردانی کرنا سراسر معصیت (گناہ) ہے۔ بہرکیف قرآن پاک جو انقلاب لانا چاہتا ہے، وہ اس آیت میں مضمر ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹ (100)

(وہ ذات جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ غالب کرے وہ اس دین حق کو تمام ادیان پر، اگرچہ مشرکین اس کو بُرا ہی سمجھیں۔)

جس کا پہلے بھی کئی بار ذکر آ چکا ہے۔

☆

www.rahimia.org

مقالہ 13

تاریخِ اسلام کا اجتماعی نقطۂ نظر

اور قرآنی انقلاب

www.rafimia.org

قرآن؛ ایک جامعِ انسانیت کا نظریہ

''قرآن حکیم کا اجتماعی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے سے میرے دماغ پر دوسرا اثر یہ ہوا کہ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کتاب دنیا کی تمام اقوام کو ایک انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت دیتی ہے۔ اس کا مقصودِ اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک نقطۂ نظر پر جمع کرے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کے پیشِ نظر یہ ہے کہ دنیا کے سب دینوں سے اعلیٰ دین، یعنی سب فکروں سے بلند تر فکر، یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو ساری انسانیت پر جامع ہو، اس کی طرف لوگوں کو بلائے اور ان سے اس پر عمل کرائے۔ انٹرنیشنل انقلاب کا یہ مضمون میں نے قرآن کی اس آیت سے استنباط کیا ہے:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝٩ [101]

(اُس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔ اور اگرچہ مشرک ناپسند کریں۔)

www.rahimia.org

تاریخ اسلام کا اجتماعی نقطۂ نظر

اور قرآنی انقلاب

بدقسمتی سے ایک طویل زمانے سے ہمارے اہلِ علم تاریخ کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ مرض ہمارے ہاں ظالم بادشاہوں کے دور کی یادگار ہے۔ جبر کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ جماعت کے بجائے فرد پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے انفرادی نقطۂ نظر کا تجزیہ

تاریخ کے اُتار چڑھاؤ اور واقعات کے تغیر و تبدل کو اجتماعی رویوں کے بجائے چند اشخاص کے کردار پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری تاریخ کی کتابیں، قوموں کی مجموعی زندگی اور ان کے ارتقا و زوال پر بحث کرنے کے بجائے بادشاہوں اور ممتاز افراد کے حالات کی کھتونیاں بن گئی ہیں۔ انفرادیت پسندی کا یہ رُجحان ہے، جس نے ہمارے اہلِ علم کو اس طرف ڈال دیا ہے کہ وہ اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا سارا زور افراد کی شخصیتوں کو اُجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے۔

چناں چہ قوموں کی زندگی اور ان کی ترقی میں جماعت کو جو اہمیت حاصل ہے، ہمارے اہلِ علم اس پر بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھنے بیٹھتے ہیں تو مکہ کی اجتماعی زندگی، قریش کا قومی نظم و نسق، قُصی (بن کلاب۔ 400ء تا 480ء) کے عہد سے قریش کی تنظیم و توسیع کے حالات، جن کا کہ رسول اللہؐ کی بعثت اور آپؐ کے مشن سے بہت گہرا تعلق ہے، وہ ان باتوں کو سِرے سے

پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ ان کے ہاں نبی اکرمؐ کی نبوت اور رسالت پر صرف اس طرح غور کیا جاتا ہے کہ ''خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ ساری نسلِ انسانی میں ایک مکمل اور برتر انسان پیدا کرے۔'' ہر عالم کے سامنے سیرتِ نبویؐ کا بس یہ موضوع ہوتا ہے، جسے وہ اپنی علمی استعداد اور مخصوص فکری رجحان کے مطابق پیش کرتا ہے۔ چناں چہ صرف اس طرز پر ہمارے ہاں بڑی کثرت سے سیرت کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

مطالعۂ تاریخِ اسلام کے اجتماعی نقطہ نظر کی اہمیت

اس کے برعکس ہم قومی زندگی میں فرد کے بجائے انسانی اجتماع کو اہم مانتے ہیں۔ ہم نے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ بھی انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ دار العلوم دیوبند کی تعلیم، یورپ کی سیاست کا مطالعہ اور شاہ ولی اللہؒ کا فکر؛ یہ تین چیزیں ہیں جنھوں نے ہمیں تاریخ کے واقعات اور حوادث کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے، لیکن یہاں ہم اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اجتماعیت کے لیے لادینیت ضروری نہیں ہے۔

اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے مطالعۂ قرآن

اس فیصلے کا میرے افکار پر پہلا اثر یہ ہوا کہ مجھے قرآن شریف کی اپنی تفسیر پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ چناں چہ میں نے اسلامی اصولوں کی اجتماعی روح کو قائم رکھنا اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مجھے اس امر کا یقین ہو چکا تھا اور میں نے اس حقیقت کو خوب جان لیا تھا کہ قرآن شریف کو اس طرح سمجھے بغیر اسے دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ قرآن شریف کی تعلیم کا لُبِّ لباب (خلاصہ) اگر صرف یہ ہو کہ ''وہ اکمل ترین انسان کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور بس! اس لیے ساری دنیا کو یہ پیغام سننا چاہیے۔'' تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہر قوم اپنے بزرگ اور مقتدا (پیشوا) کو اکمل ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور خاص طور پر مسیحی قومیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برتر ثابت کریں گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کا جو ہمہ گیر مقصد ہے، وہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔

قریش کا تاریخی تسلسل

اس کے برعکس مَیں اب فرد کے بجائے جماعت پر زور دیتا ہوں اور انفرادیت کے برخلاف اجتماعیت کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ''دُعا'' کا پہلا نتیجہ تو یہ تھا کہ مکہ میں قریش کی اجتماعی حیثیت وجود میں آئی۔ کیوں کہ قریش کا فقط یہ اجتماع ہی دینِ ابراہیمی کا محافظ اور اس کی اشاعت کرنے والا بن سکتا تھا۔ البتہ ضرورت تھی اب ایسے فرد کی جو ان کو دینی تعلیم دے اور ان میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرے۔ یہ کام رسول اللہؐ نے انجام دیا۔

اب دنیا کی دوسری اقوام رسول اللہؐ اور آپؐ کی تعلیمات سے قریش (صحابہؓ) ہی کے ذریعے متعارف ہوسکیں۔ اس لیے آپؐ کا تعلق باقی دنیا سے قریش کے واسطے سے ہوا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اقوامِ عالم نے اسلام کو صرف رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس کے ذریعے سے ہی نہیں جانا تھا، بلکہ وہ اس اجتماعی تحریک کی بدولت بھی — جس میں قریش پیش پیش تھے — اسلام سے واقف ہوئیں۔ یعنی اسلام کو سمجھنے کے لیے صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر تمام زور ڈالنے کے بجائے اس اجتماعی تحریک کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، جو اس ذاتِ اقدس کے اردگرد ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اسلام کو اس طرح سمجھنے سے میرے بہت سے عُقدے (گرہیں) حل ہو گئے ہیں۔

سورت جمعہ میں رسول اللہؐ کی بعثت کے متعلق یہ تصریح کی گئی ہے کہ آپؐ کے پہلے مخاطب ''اُمیّین'' ہیں۔ اُمیّین سے مراد عرب کے وہ قبیلے ہیں، جنھوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کرلیا تھا۔ دوسرے موقع پر رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد قرآنِ عظیم نے اس طرح واضح کیا ہے کہ:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (102)

(اے ہمارے پروردگار! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرماں بردار۔)

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے مل کر دعا کی کہ ہماری نسل سے اُمتِ مسلمہ پیدا کی جائے۔ یہ ''گھر'' یعنی خانہ کعبہ اس کا منبع اور مرکز ہو۔ ظاہر ہے اس اُمت کو ایک نبی کی ضرورت تھی، جو دینِ ابراہیمی کی صحیح معنوں میں تعلیم دے۔ اسے تعلیم و تزکیے کے ذریعے اس قابل بنادے کہ وہ ابراہیمی دین' دُنیا کی تمام قوموں تک پہنچا سکیں۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہؐ اس لیے مبعوث ہوئے تھے کہ وہ قریش کی اصلاح کرسکیں۔ ان کو تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کر کے ان کو اقوامِ عالم میں اسلام کا نقیب (علم بردار) اور اس کی نشر و اشاعت کا حامل بنائیں۔

قریش کی اجتماعی حیثیت

بے شک قریش حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا وطن عراق اور پھر فلسطین تھا، لیکن قریشی عربوں کے ساتھ مل کر عرب بن چکے تھے۔ سب سے پہلے حضرت اسماعیلؑ عرب میں آ کر آباد ہوے۔ ان کی اولاد بہت پھیلی اور آگے چل کر ان کے مستقل قبائل بن گئے۔ تورات میں ایک پیش گوئی ہے کہ:

''حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے بارہ سردار ہوں گے۔''(103)

ہم اس پیش گوئی کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اولادِ اسماعیل کے ذریعے عرب میں ابراہیمی دین کی اشاعت ہوگی اور آگے چل کر ان کے بارہ سرداروں کی وساطت سے سرزمین عرب حنیفی ملت کا مرکز بنے گی۔

قُصی بن کلاب کی سربراہی میں قریش کی حکومت

تورات کی اس پیش گوئی اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد ''قُصی'' نام کا ایک سردار قریش کے منتشر قبیلوں کو مکہ معظّمہ میں آباد کرتا ہے۔ وہ ان کی اجتماعی زندگی کو ایک نظم دیتا ہے۔ ان کے مختلف قبیلوں کو مختلف کام سپرد ہوتے ہیں۔ ''دارالندوہ'' بنتا ہے، جس میں سب جمع ہو کر اپنے فیصلے کرتے ہیں۔ حج اور باہر سے آنے والوں کے لیے باقاعدہ انتظام کیا جاتا

ہے۔ یہ گویا تمہید ہے **خاتَمُ النّبِیّینؐ کی بعثت کی۔**

اس حکومت کی بین الاقوامی سوچ

قُصی بن کلاب کی یہ جماعت اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سمجھتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ محض اسماعیلی عربوں کے جدِاعلیٰ نہ تھے، بلکہ مسیحی اور موسوی ملتیں بھی ان کو اپنا پیشوا مانتی تھیں۔ اس لیے قُصی کی یہ جماعت محض عربوں کی سرداری پر اِکتفا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بڑے بلند حوصلے تھے۔ یہ ایک طرف تو عرب قبائل کو اپنے زیرِ اثر لانے کی کوشش میں تھی اور دوسری طرف عراق و شام تک کے علاقوں میں اپنے تجارتی قافلوں کے ذریعے اثر و رسوخ پیدا کر رہی تھی۔ اس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ وہ ان سب قوموں کو یک جا کر کے ایک مجمع الاقوام (کثیر القومی ادارہ) بنائے اور اس کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہو۔ اس جماعت میں خاندانی روایات کے طور پر یہ خیال نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ایک بہت بڑا نبی پیدا ہوگا جو ہمیں تمام اقوام کا سردار بنا دے گا۔

بنی اسرائیل کی باہمی کش مکش

یہی جذبہ بنی اسرائیل میں بھی موجود تھا۔ چناں چہ اسی بنیاد پر بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں خاندانوں میں باہمی رقابت بھی تھی، لیکن بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اَور کسی کو اُن کے برابر ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کام حضرت موسیٰؑ نے کیا، ان کے نزدیک وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا مصداق تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم تو بنی اسرائیل تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیوں نے ابراہیمی دین کو سب قوموں کا دین بنانے کے بجائے فقط ایک خاندانی یا زیادہ سے زیادہ ایک قوم کا دین بنا دیا تھا۔

بنی اسرائیل میں سے بے شک مسیح علیہ السلام کی تعلیم غیر اسرائیلی لوگوں تک پہنچی۔ ان کے حواریوں نے صابیوں یعنی ''آرین'' قوموں میں بھی مسیحیت کی اشاعت کی۔ لیکن

ہوا یہ کہ خود بنی اسرائیل نے مسیحؑ کو ماننے سے انکار کردیا۔ چناں چہ یہود اِن کی تعلیم سے بہت کم مستفید ہوئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کا انکار کیا، لیکن حضرت مسیحؑ کے ماننے والوں نے یہود کے نبی حضرت موسیٰؑ اور ان کی کتاب تورات کی سب سے زیادہ اشاعت کی۔

قریشِ مکہ کی جدید تنظیم اور جماعتی زندگی

یہودیوں اور عیسائیوں کی ان کشمکشوں کا اثر قریش کے اہل الرائے بزرگوں پر بھی پڑتا رہا۔ انھوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے کس طرح بڑی سلطنتیں قائم کر لی ہیں، مگر اس کے ساتھ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ عیسائی، ابراہیمی دین سے دور ہوگئے ہیں اور حنیفی ملت کی قیادت سنبھال نہیں سکے۔ یہودی تو ابراہیمی دین کی اشاعت میں ناکام ہو ہی چکے تھے، اس سلسلے میں عیسائی بھی زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ قُصی کی اس جدید تنظیم کے بعد قریشِ مکہ میں یہ حوصلہ پیدا ہورہا تھا کہ ان میں سے کوئی بڑا آدمی پیدا ہو، جو ابراہیمی دین کی دعوت دے اور اس کے قیام کا مرکز بنے۔

قریش کا مکہ میں آباد ہونا اور قُصی کے بعد ان میں ایک خاص قسم کی جماعتی زندگی کی ابتدا، اسے مَیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ اس دعا کی تکمیل یوں ہی ہوسکتی تھی کہ ایک اُمت ہو جو دنیا کی تمام اُمتوں کی ہدایت کے لیے اُٹھے۔ پھر اس اُمت کو بھی ایک امام کی ضرورت تھی، جو اسے تعلیم اور تزکیے کے ذریعے دنیا میں ابراہیمی دین کی اشاعت کے لیے تیار کرے۔

قریش کے معاملے میں بھی مَیں ان میں سے کسی خاص گروہ کی خصوصیت اور اس کے امتیاز کا قائل نہیں رہا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ''اَلْاَئِـمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ''، یعنی ''قریش میں سے امام ہوں گے۔'' [104] ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: ''بارہ سردار ہوں گے، جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔'' (حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''لا یزال هٰذا الدّین عزیزاً منیعاً إلیٰ إثنی عشر خلیفة ...

کُلّھم قریش.'' (105)

(یہ دین ہمیشہ بارہ خلفا تک طاقت ور اور زبردست رہے گا۔ وہ تمام خلفا قریش سے ہوں گے۔)

اس بیان سے میرا مقصود یہ بتانا ہے کہ یہاں قریش کا بہ حیثیتِ مجموعی ذکر کیا گیا ہے۔ قریش میں سے کسی خاص خاندان کو مخصوص نہیں کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے ہم نے چیزوں کو اجتماعی طور پر سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور انفرادیت کے رُجحان نے ہمارے دماغ خراب کر دیے ہیں۔

صحابہؓ کی اجتماعی جدوجہد کی اہمیت

یہ اجتماعیت اور اجتماعی فکر ہی کا اثر ہے کہ مَیں سورۂ بقرہ کی آخری آیت:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (106)

(ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے)

سے یہ سمجھا ہوں کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیا علیہم السلام پر ایمان لائیں۔ ان انبیؑا میں ایک فردِ اکمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چناں چہ جماعتِ انبیؑا سے مکمل قطع نظر کرنا اور صرف رسول اللہؐ کی (ذاتی) سیرت پر غور کرنا میرے نزدیک اب کافی نہیں۔

غلطی یہ ہے کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کے شخصی اوصاف میں اس قدر اِنہماک کرتے ہیں کہ آپؐ کی تربیت یافتہ جماعت کی قدر و قیمت ہماری نظروں سے جاتی رہتی ہے۔ ہمارے اس غلط تخیل کو درست کرنے کے لیے قرآن شریف کا ایک اشارہ کافی ہے۔ سورۂ فتح میں

''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں)

کے ساتھ ساتھ

''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ'' (107) (اور وہ لوگ جو آپؐ کے ساتھ ہیں)

بھی ارشاد ہوا ہے۔ یعنی آپؐ کی تمام کامیابی میں آپؐ کی جماعت کو شریکِ کار بتایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں ایک مشہور روایت ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ: ''مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر رہے گی۔''(108) اس کی تفسیر میں رسول اللہؐ کا یہ قول:

''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ.'' (109)

(یعنی جس طریقے پر میں اور میرے اَصحاب ہوں گے، اس پر چلنے والی جماعت حق پر ہوگی۔)

نقل کیا گیا ہے۔

ہمارے اس فکر کی تائید اس دعا سے بھی ہوتی ہے، جو قرآن عظیم نے ہمیں سکھائی ہے۔ یہ دعا سورت فاتحہ میں مذکور ہے۔اس میں ''صراطِ مستقیم'' کی تفسیر

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ﴿۶﴾ (110)

(یعنی سیدھا راستہ وہ ہے کہ جس کے چلنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا) کی گئی ہے۔ ان کا تعین خود قرآن مجید نے کردیا ہے، اس کے نزدیک انعام یافتہ لوگ انبیاؑ، صدیقین، شہدا اور صالحین کی جماعتیں ہیں۔ (جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ (111)

(وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا، وہ نبی اور صدیق اور شہید اور صالح ہیں۔)

اس سے زیادہ قرآن مجید کے اجتماعی تصور کے حق میں اَور کیا دلیل ہوسکتی ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں ہماری توجہ ادھر نہ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اجتماعیت سے بے اِلتفاتی برتی اور انفرادیت کی دلدل میں پھنس گئے۔

قرآن؛ ایک جامعِ انسانیت کا نظریہ

قرآن حکیم کا اجتماعی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے سے میرے دماغ پر دوسرا اثر یہ ہوا کہ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کتاب دنیا کی تمام اقوام کو ایک انٹرنیشنل انقلاب کی

دعوت دیتی ہے۔ اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک نقطۂ نظر پر جمع کرے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کے پیشِ نظر یہ ہے کہ دنیا کے سب دینوں سے اعلیٰ دین، یعنی سب فکروں سے بلند تر فکر، یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو ساری انسانیت پر جامع ہو، اس کی طرف لوگوں کو بلائے اور ان سے اس پر عمل کرائے۔ انٹرنیشنل انقلاب کا یہ مضمون میں نے قرآن کی اس آیت سے استنباط کیا ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٩﴾ (112)

(اُس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔ اور اگرچہ مشرک ناپسند کریں۔)

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ ایک زمانے میں ایک قوم ایک مذہب کو اختیار کرتی ہے اور یہ مذہب اس کے قومی افکار و اعمال کا مقدس حصہ بن جاتا ہے۔ چناں چہ اس طرح دنیا میں ہر قوم کا علاحدہ علاحدہ دین وجود میں آ گیا۔ اب قرآن تمام انسانیت کے لیے ایک دین پیش کرتا ہے اور اس دینِ حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا قرآن کا مقصد ہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے تمام اقوام میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہو گا۔

قرآن کے اس دینِ حق کو تمام ادیان پر غالب کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں:

(۱) ایک صورت تو یہ تھی کہ تعلیم و تربیت اور وعظ و ارشاد کے ذریعے یہ دین تمام ادیان پر غالب آ جاتا۔ اگر یہ چیز اس طرح ممکن ہوتی تو جنگ و جدل یعنی جہاد بالسیف کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اور تمام قومیں خوشی سے اس دین حق کو قبول کر لیتیں۔

(۲) لیکن مذکورہ بالا آیت کے آخری حصے میں وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (یعنی مشرکین بے شک بُرا مانیں) کا جملہ بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین کو یہ ناپسند ہے کہ وہ اس دینِ حق کا غلبہ دیکھیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ

ناپسندیدگی اور کراہت اس دینِ حق کی راہ میں ضرور حائل ہوگی۔ اس لیے ایک ایسی مرکزی طاقت کی لامحالہ ضرورت پڑے گی، جس کے زور سے اس دین کو غالب کیا جائے۔

یہ ہے انقلاب! اور چوں کہ اس کا دائرہ ایک ملک یا ایک قوم تک محدود نہیں، بلکہ یہ ساری انسانیت پر جامع ہے، اس لیے یہ انقلاب انٹرنیشنل ہوگا۔ چناں چہ یہ قرآن دنیا میں اسی انٹرنیشنل انقلاب کا پیغام ہے۔

قرآنی نظریے پر جدوجہد کے لیے انقلابی جماعت کی اہمیت

عام طور پر یہ خیال پھیلایا گیا ہے کہ عدمِ تشدد کے ذریعے بھی اقوام پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا ہے، یعنی انقلاب کے لیے جنگ کرنا ضروری نہیں۔ چناں چہ عدمِ تشدد کو اس طرح ماننے والے کہتے ہیں کہ اب جو انقلاب ہوگا، وہ اس نئے طریقے پر ہوگا۔ جب کہ یہ بات واضح ہے کہ اب تک انقلاب کا جو مفہوم لیا جاتا تھا، یہ خیال اس سے بالکل جدا ہے۔

ہمارے نزدیک انقلاب کی ابتدائی منزل میں ایک حد تک عدمِ تشدد کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ ذاتی طور پر ہم ایک محدود زمانے کے لیے عدمِ تشدد کی پالیسی اپنے لیے معین بھی کر چکے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تاریخ میں بڑی بڑی مقدس ہستیوں نے عدمِ تشدد کی پالیسی کو ایک خاص وقت کے لیے ضروری سمجھا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ عدمِ تشدد کے ذریعے کام نہیں نکل سکتا۔ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پر تشدد کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔

قرآنی انقلابی جماعت کے تین عناصر

اب جب کہ قرآن کا مقصد انٹرنیشنل انقلاب مان لیا گیا تو اس کے لیے تین چیزوں کا تعین ضروری ہے:

(الف) انٹرنیشنل انقلاب کا ''آئیڈیل''، یعنی نصب العین یا مطمحِ نظر

(ب) انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام

(ج) اس پروگرام کو چلانے والی کمیٹی (یعنی جماعت)

ہر انقلاب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی جماعت اس انقلاب کی پشت پناہ (یعنی اسے برپا کرنے والی) ہو۔ اس انقلابی جماعت کا ایک نہ ایک ''آئیڈیل'' ہوتا ہے۔ اور پھر اس ''نصب العین'' کو حاصل کرنے کے لیے اسے پروگرام بھی بنانا پڑتا ہے۔ ان تین چیزوں کے بغیر کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ اسے ضرورت ہوتی ہے اوّل ایک ''آئیڈیل'' (نصب العین) کی، دوسرے ایک پروگرام کی اور تیسرے ایک جماعت کی جو اس پروگرام کو چلائے۔

میرے نزدیک اسلام ایک عالم گیر اور بین الاقوامی انقلاب کی دعوت دیتا ہے۔ اس انقلاب کا ''آئیڈیل'' ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہی آیت

(هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٩﴾) ہے۔

قرآن کی انقلابی جماعت کا پہلا نمونہ؛ دورِ خلفائے راشدینؓ

پروگرام کی وضاحت سے پہلے اس جماعت یا ''حزب'' کا تعین ضروری ہے، جس کے ہاتھوں یہ پروگرام نافذ ہوگا۔ اس ''جماعت'' کا نام قرآن کی زبان میں ''حزبُ اللّٰہ'' (اللہ کی جماعت) ہے۔ حزبُ اللہ کے فرائض اور مقاصد کے سلسلے میں قرآن عظیم کی مختلف سورتوں میں کافی ہدایات دی گئی ہیں۔ چناں چہ جہاں جہاں ''یا ایّھا الذین آمنوا'' (اے ایمان والو!) وغیرہ سے قرآن میں مؤمنین کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو بتایا گیا ہے کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں یا فلاں فلاں حکم کی اس طرح پابندی کریں تو ان تمام احکامات اور بیانات کو ''حزبُ اللہ'' کا پروگرام سمجھنا چاہیے۔

قرآن نے ''یا ایّھا الذین آمنوا'' کے عنوان سے جا بہ جا اسی ''حزبُ اللہ'' کو مخاطب کیا۔ اور یہ ''حزبُ اللہ'' مشتمل ہے ان سب افراد پر، مردوں پر، عورتوں پر، عرب اور عجم پر، جو کسی نہ کسی زمانے میں قرآن کے انٹرنیشنل انقلاب کو برسرِ کار لانا چاہیں گے۔

اس ''حزبُ اللہ'' کا پہلا نمونہ مہاجرین اور انصار کا گروہ ہے۔ جسے قرآن نے
''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ ''(113)
(جو لوگ قدیم ہیں پہلے ہجرت کرنے والوں میں سے)
کا نام دیا ہے۔ اس گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپؐ کے بعد قرآن کے انقلاب کو کامیاب کر کے دکھایا۔

قرآن کی انقلابی جماعت کا دوسرا نمونہ

ان کے بعد ''حزبُ اللہ'' کا سلسلہ منقطع نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ برابر جاری ہے اور رہے گا۔ ان کے بعد والوں کو قرآن نے
''وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ''(114)
(اور وہ لوگ جو نیکی میں ان کی پیروی کرنے والے ہیں)
سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں وہ سب مسلمان قومیں شامل ہیں جو قیامت تک قرآن کے پروگرام کو چلانے کے لیے سرگرم عمل رہیں گی۔ اور یہ قرآنی انقلاب کا دوسرا نمونہ ہے۔

یہ ہے قرآن کے انٹرنیشنل انقلاب کا ''آئیڈیل''۔ اس کا ''پروگرام'' اور ''جماعت'' کا تعین۔ ہمارے نزدیک مندرجہ بالا آیت ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ '' اس مرکزی کمیٹی یا جماعت کا بہترین تعین ہے۔

☆

مقالہ 14

اسلام کے عالم گیر انقلاب کی پہلی منزل

تاریخ اسلام کا عہدِ اوّل

(دورِ نبویؐ و خلافتِ راشدہ)

(۱/نبوی تا ۴۱ ہجری/610ء تا660ء)

www.alimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حدیثِ نبویؐ

”خیرُ النّاس قرنی، ثمّ الّذین یلونهم، ثمّ الّذین یلونهم“ [115]

کی تشریح میں فرمایا:

”قَــرْن“ کا لفظ لغت میں ایسی قوم کے لیے بولا جاتا ہے، جو تاریخی سن کے حساب سے ہم عصر ہو۔ اس کے بعد یہ لفظ ایسی قوم کے لیے استعمال کیا جانے لگا، جو خلافت وحکومت اور ریاست کے نظام میں ہم عصر ہو۔ چناں چہ جب کوئی نیا حکمران اور خلیفہ آ جائے، نئے لوگ اُس کے وزرا بن جائیں، عوام، فوج کے سپاہی اور سپہ سالارانِ لشکر تبدیل ہو جائیں اور دشمنوں کا نظام بھی بدل جائے تو ایسی صورت میں ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں درجِ ذیل ادوار ہیں:

”1۔ پہلا قرن (دَور) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانے سے شروع ہوکر آپؐ کے وِصال تک ہے۔ (۱ھ/622ء تا ۱۱ھ/632ء)

2۔ دوسرا قرن (دَور) حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے آغاز سے لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی وفات تک ہے۔ (۱۱ھ/632ء تا ۲۴ھ/643ء)

3۔ تیسرا قرن (دَور) حضرت عثمانؓ کا زمانہ ہے۔ (۲۴ھ/643ء تا ۳۵ھ/656ء)۔“[116]

اسلام کے عالم گیر انقلاب کی پہلی منزل

تاریخ اسلام کا عہدِ اوّل

(دورِ نبویؐ و خلافتِ راشدہ)

(۱رنبوی تا ۴۱ ہجری/ 610ء تا 660ء)

www.rahimia.org

اسلام کی جامعیت

سب سے پہلے اسلام کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ تمام مذاہب اور فلسفوں کا **نِعمُ البَدَل** (اچھا بدل) بن کر آیا تھا۔ اسلام کے **نِعمُ البَدَل** ہونے کی جانچ پرکھ ان مذاہب اور فلسفوں نے کر دی۔ چناں چہ جہاں کہیں ان مذاہب اور فلسفوں کی اسلام سے ٹکر ہوئی، اسلام غالب آیا۔ یہ مذاہب اور فلسفے یا تو مٹ گئے یا اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ بنالیا۔ اسی طرح مشرق قریب میں قدیم تمدنوں کے بچے کھچے جو بھی آثار تھے، وہ یا تو ناپید ہو گئے اور یا وہ نئے اسلامی تمدن کے جزو بن گئے۔ غرض یہ کہ اسلام ہزار ہا برسوں کی اس مذہبی جدو جہد کا آخری نقطۂ تکمیل تھا، جو دنیا میں جاری تھی۔ مسلمانوں نے جس تمدن کی بعد میں تشکیل کی، وہ تمام مذاہب اور تمدنی روایات کے اجزائے صالح اور باقیاتِ صالحات (اچھی باقیات) کا حاصل تھا۔

قریش کی امتیازی حیثیت

مکہ کے قریش کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ عرب کے دیگر بدو قبائل کی طرح ایک قبیلہ تھا، صحیح نہیں۔ صحرائی و بدوی زندگی اور اس کے لوازمات و خصائل جو دوسرے بدوی قبائل میں موجود تھے، قریش ان سے بہرہ وَر تو ضرور تھے، لیکن عرب کی بدوی ذہنیت کا نمونہ نہ تھے۔ قریش کی اپنی خاص روایات تھیں اور قُصَی کے زمانے سے مکہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک نظم چلا آتا تھا۔ نیز تجارتی قافلوں کی وَجہ سے قریش کو ہمسایہ ملکوں میں آنے جانے کا موقع ملتا تھا۔ حج و عُکاظ کے میلوں کے موقعوں پر عرب قبائل سے بھی ان کے راہ رسم پیدا ہو جاتے تھے۔ یہ اسباب تھے جن کی وَجہ سے قریش ایک طرف مشرق قریب کے تمدنی سرمائے اور ذہنی روایات سے واقف تھے اور دوسری طرف قبائل کے بدویانہ خصائل سے بھی نابلد نہ تھے۔ چناں چہ قرآن کے بلند معانی اور اعلیٰ مضامین قریش کے لیے اجنبی نہ تھے۔ وہ یہودی اور نصرانی روایات کو بھی سمجھتے تھے اور قرآن میں علم و حکمت کی جو باتیں بیان کی جاتی تھیں، ان سے بھی محظوظ ہوتے تھے۔ البتہ ان کے دماغوں میں اپنا کوئی واضح اور مستقل فکر نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مادی اغراض میں اس طرح اُلجھے ہوئے تھے کہ وہ اِدھر توجہ نہیں کرتے تھے۔

قرآن کا خطاب؛ قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف

قرآن کو عرب کی بدوی ذہنیت کا ترجمان کہنا سخت غلطی ہے۔ [117] قرآن کا خطاب تو قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف تھا، لیکن اُن کے پاس قرآن ایسی کتاب نہیں تھی، نہ ہی ان کے بس میں تھا کہ وہ قیصر و کسریٰ سے ٹکر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کی وساطت سے قریش کے لیے یہ دو چیزیں ممکن کر دیں۔ بے شک قرآن قریش کی زبان یعنی عربی اور اُن کی ذہنیت کے مطابق اُن کی اصلاح کے لیے نازل ہوا، لیکن تھا وہ خدا کا پیغام، جو قریش کے واسطے سے ساری دنیا کو دیا جا رہا تھا۔

www.rahimia.org

مکہ میں قریش کا باقاعدہ نظام

مکہ میں قریش کا اپنا ایک باقاعدہ نظام تھا۔ تجارتی اور سیاسی معاملات سلجھانے کے لیے قواعد وضوابط تھے۔ قومیت کا اُن کا اپنا ایک مخصوص تصور تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایسی مذہبی رُسوم بھی بنالی تھیں، جو اُن کے مادی اور اجتماعی مفاد کے لیے مفید تھیں۔ اس کی وَجہ سے بدو قبائل میں ان کا مذہبی وقار بھی قائم ہوتا تھا۔

ایک مشہور اہلِ قلم اِس عہد کے محقق کے الفاظ میں:

''متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وَجہ سے یہاں کی آبادی میں یک نسلی نہ تھی۔ اسماعیلی خاندان عراق یا فلسطین سے آئے تھے۔ خزاعہ یمن کے تھے۔ مکہ والوں کی رشتے داری اور کاروباری تعلقات شہرِ مدینہ اور طائف سے بھی کافی تھے۔ قُصی بن کلاب کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قُضَاعہ سے تھا۔ قصی کی کوشش اور قابلیت سے قریشی قبائل نے شہرِ مکہ میں سربر آوردہ حیثیت حاصل کی۔ قُصی ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی، جس میں سماجی اور انتظامی عہدے موروثی طور پر مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے، حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم ہونے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعے کا پتہ نہیں چلتا، لیکن قانونِ معاہدہ اور قانونِ جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام روایات نے محفوظ رکھے۔ حتیٰ کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم سے بچنے کے لیے ''حِلفُ الفُضول'' کے نام سے ایک رضا کارانہ نظامِ تہدید و تدارُک (ظلم سے روکنے والا ابتدائی نظام) وجود میں آگیا تھا۔'' (118)

قریش کے اس نظام کی چند بنیادی خرابیاں

مکہ کے اس نظام میں چند بنیادی خامیاں تھیں، جن کی بنا پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی:

(۱) طبقاتی نظام: مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار اور تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔

(۲) سودی کاروبار: مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا۔

(۳) تعیش پسندی: امیر طبقہ مال میں مست تھا۔ تجارت اور سرمائے سے انھیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لیے حبشی غلام خریدتے اور حظِ نفس (نفسانی لذت) کے لیے لونڈیاں لاتے۔ چناں چہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں اور شراب کا دور چلتا۔ سفر کے سلسلے میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام سے گزر ہوتا تو وہاں سے عیش و عشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے۔

(۴) اکثریت اقتصادی بدحال: مکہ کا یہ گنا چنا اوپر کا طبقہ اس لہو و لعب میں منہمک تھا، لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی۔

کسی نظام کے مشکل مسائل اور اُن کے حل کی کوشش

دُنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمیوں کی ضرورت پڑی اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطۂ نظر متعین کرنا لازمی ہوا:

(۱) انسانیت میں تعاونِ باہمی: انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان — جن میں اکثر کش مکش رہتی ہے — صلح وصفائی اور میل ملاپ کی راہ پیدا کرنا ہے۔

(۲) طبقاتی مسائل: امیر و غریب کا فرق، آسودہ حال و قلاش کی چپقلش، زمین داروں اور کسانوں کا تفاوت، زرداروں اور بے زر والوں کی آپس کی کھینچا تانی، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی باہمی بے اعتمادی۔

(۳) مسائل کا حل: اس کش مکش، اس اختلاف اور اس دُشمنی کو — جو ایک قوم کے

مختلف طبقوں میں قدرتاً ہوتی ہے — دُور کرنا ہر صاحبِ مذہب اور نئے نظام کا فرض ہوتا ہے۔

اسلام؛ظلم کے اس نظام کے خلاف انقلاب

اس لحاظ سے اپنے زمانۂ ظہور میں اسلام کو بھی اس مسئلے کا حل کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ مذہبِ اسلام اعلانِ جنگ تھا؛ ظالم، فاجر، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کے خلاف۔ جو پس ماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہمات پرستی سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ مکہ کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے، بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ انھوں نے رنگ ونسب کے عجیب وغریب تصورات بنا رکھے تھے۔ یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعے سے رَوا (جائز) رکھی جاتی تھی۔ مذہب ہو یا سیاست، تجارت ہو یا اجتماع، اِن سب کا حاصل یہ ہو گیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اَور فروغ ملے۔ قریش کے سربرآوردہ طبقے اگر اسی رَو میں بہتے چلے جاتے تو ان کا انجام صاف نظر آرہا تھا۔

رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کے دو مقاصد

چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے قریش کی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی۔ قریش اگر راہِ راست پر آجاتے تو ان کے ذریعے عربوں کی اصلاح ہوسکتی تھی۔ اگر عربوں جیسی جنگ جُو اور جری قومؑ قریش کی قیادت کو مان لیتی تو رسول اللہؐ کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچ سکتا تھا۔ بے شک رسول اکرمؐ ساری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور قرآن کا پیغام سب قوموں کے لیے تھا، لیکن آپؐ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح وتہذیب ہو جائے، تاکہ وہ اس پیغام کو دوسری قوموں تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں۔

چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں:

(۱) ایک قومی (۲) دوسری عمومی و بین الاقوامی

آپؐ کی قومی حیثیت کا مظہر قریش کی قیادت تھی۔ آپؐ کی بعثت کی بین الاقوامیت اور عمومیت کی دلیل یہ ہے کہ اسلام صرف قریش تک محدود نہ رہا۔ ان کے ذریعے عام عربوں تک پہنچا۔ پھر دوسری قومیں بھی زمرۂ اسلام میں داخل ہوگئیں۔

اس حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

”إعلم أنّ النّبیّ ﷺ اجتمعت فیه خصلتان:

إحداهما النّبوّة، و الثّانیة سعادة قریش بسببه.

فالنّبوّة عمّت کُلّ الأصناف، و الأحمر و الأسود مستویان فیما یرجع إلٰی الفیض الّذی هو من باب النّبوّة ... و لذٰلک لمّا اقتضت المصلحة الکُلّیة عموم سلطنة التُّرک ألهمهم التّدیّن بدین الإسلام. و أمّا سعادة قریش، فسببها کانت خلافتهم إلٰی زمان طویل.“ (119)

(جاننا چاہیے کہ نبی اکرمؐ میں دو خصوصیتیں جمع ہوگئی تھیں:

(۱) ایک نبوت

(۲) دوسرے آپؐ کے ذریعے قریش کی کامیابی اور ترقی۔

پس آپؐ کی نبوت ہر قوم اور ہر نوع کے لیے عام تھی۔ نبوت کی حیثیت سے آپؐ کے فیوضات حاصل کرنے میں سرخ اور کالے سب برابر ہیں۔ یہی وَجہ ہے کہ جب اللہ کی مصلحتِ کلیہ نے تقاضا کیا کہ ترکوں کی سلطنت اقوامِ عالم پر قائم ہو تو اللہ نے اُن کے دل میں دینِ اسلام کو قبول کرنے کا الہام کردیا۔ قریش کی ترقی یہ ہے کہ حضورؐ کی وَجہ سے اُن کی خلافت ایک لمبے عرصے تک قائم رہی۔)

جب تک بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دو حیثیتیں پیشِ نظر نہ ہوں، اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنا بڑا مشکل ہے۔

بعثتِ محمدیؐ کے بارے میں مؤرّخین کی غلطی

مؤرّخوں نے غلطی سے ان دونوں حیثیتوں کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ ان کی باتیں پڑھ کر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ:

''اسلام خالص عربوں کے لیے تھا۔ عربوں نے اسے بلند نام کیا۔ وہ نہ رہے تو اسلام کو بھی زوال آ گیا۔ اب اگر اسلام کی قسمت میں کچھ اچھے دن لکھے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ عرب اُٹھیں اور دوبارہ پھر اس میں جان ڈالیں۔ گو عجمی قوموں نے تلوار سے ڈر کر اسلام قبول کرلیا، لیکن وہ مسلمان ہوئیں تو اپنے ساتھ اِلحاد و زندقہ کے جراثیم بھی لیتی آئیں۔ ان کی وَجہ سے ''حجازی'' اسلام کا صاف اور پاکیزہ چشمہ گدلا ہو گیا۔''

اس ذہنیت کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف عربی زبان کو مقدس مان لیا گیا۔ عربوں کو سب قوموں سے افضل بتایا گیا اور قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ممنوع قرار پایا۔

بعثتِ محمدیؐ کی عمومی نوعیت کا سمجھنا ضروری ہے

اس وقت ضرورت ہے کہ اسلام اور قرآن کو ان پریشان خیالیوں سے نکالا جائے۔ بے شک قریش اور عرب کی تاریخی برتری اپنی جگہ مُسلَّم ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی عمومی دعوت کا ذریعہ بنے، لیکن جہاں تک بعثتِ محمدیؐ کی عمومیت کا تعلق ہے، سب مسلمان قومیں اس میں مساوی اور یکساں ہیں۔ کسی کو دوسرے پر امتیاز نہیں۔ قریش اور عرب کی یہ برتری استحقاق کی بنا پر تھی۔ اس میں ذات یا نسل کو کوئی دخل نہیں۔ اسلام جتنا حجازی ہے، اتنا وہ عجمی بھی ہے اور اتنا ہی ہندی اور ترکی بن سکتا ہے۔

بعثتِ محمدیؐ کی قومی حیثیت کی تکمیل کا دور

الف: مکی دور؛ انقلابی جماعت کی تیاری

بعثتِ محمدیؐ کی قومی حیثیت کی تکمیل تو یوں ہوئی کہ قریش کے ایک ممتاز گروہ نے

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔ چناں چہ یہی لوگ نئی تحریک کے چلانے والے بنے۔ اس گروہ کو اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے — جو اس نئی تحریک کے مخالف تھے — لڑنا بھی پڑا۔ یہ مکہ کی رجعت پسند طاقت تھی۔ بارہ تیرہ سال تک مکہ میں ان دونوں جماعتوں میں بڑے زور کی کشمکش رہی۔ ایک طرف رسول اکرم ﷺ کی قیادت میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت حمزہ، حضرت سعید اور حضرت مُصعَب رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہم نوجوان تھے۔ دوسری طرف خود آپؐ کے حقیقی چچا اور دوسرے عمر رسیدہ سردار ابوجہل، ابولہب، ولید، عتبہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے۔ ان رجعت پسندوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا۔

وہ اس مسلمان جماعت کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے۔ جو حضرت بلالؓ اور حضرت یاسرؓ جیسے لاوارث اور کمزور تھے، اُن کو بدنی سزائیں دی جاتیں۔ جو قریش کے خاندانوں میں سے تھے، ان کا یہ لوگ مذاق اڑاتے۔ عام مجلسوں میں ان پر پھبتیاں کستے۔ موقع ملتا تو مار پیٹ بھی کر دیتے۔ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں کم تھا۔ اگر کھلم کھلا لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی تو شاید ان کو ہزیمت اُٹھانا پڑتی۔

اس کے باوجود عرب میں — جہاں کی روایات یہ تھیں کہ ایک شخص ہزار کے مقابلے میں ڈٹ جاتا اور جان دے دیتا، لیکن وہ دوسرے کے ظلم کو برداشت نہ کرتا — خلافِ معمول مکہ کے یہ افراد خاموشی سے قریش کے مظالم سہتے اور حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ جیسے جاں باز اور غصہ ور بہادر بھی ہاتھ نہ اُٹھاتے۔

قرآنی نظریے پر جدوجہد کے لیے انقلابی جماعت کی اہمیت

بات یہ کہ انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جماعت اس وقت تک نہیں بن سکتی، جب تک کہ:

1۔ انقلاب کے پیغام کو ان تک نہ پہنچایا جائے۔

2۔ نہ صرف یہ، بلکہ وہ اس پیغام کو سمجھیں۔

3۔ ان کے دلوں میں یہ پیغام رچ بس جائے۔
4۔ وہ اس پر ایک عرصے تک عمل بھی کریں۔
5۔ اس راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کو برداشت کرنا بھی سیکھیں۔
6۔ امتحانوں میں پڑکر جب وہ نکلیں تو اس قابل ہوں کہ انقلاب کے لیے اپنی جانیں دے سکیں۔
7۔ تیاری کے دور میں عدمِ تشدد پر عمل کرنا مفید، بلکہ ناگزیر ہوتا ہے۔ چناں چہ تاریخ میں اکثر مقدس ہستیوں نے عدمِ تشدد کی پالیسی پر ایک خاص مدت کے لیے عمل کیا ہے۔

ب: بعثتِ نبویؐ کا مدنی دور؛ انقلابی جماعت کی حکومت

مکی زندگی کے بارہ تیرہ سال اس انقلابی جماعت کی تربیت میں گزرے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں یہ جماعت — جو مکہ میں انقلاب کی پوری تربیت پا چکی تھی — اپنی حکومت بناتی ہے۔ مدینہ کے وہ لوگ — جو ان کے ہم خیال ہو چکے تھے — اس کے ''اَنصار'' (مددگار) بنتے ہیں۔ جب مکہ کی رجعت پسند طاقت اس نئی حکومت سے برسرِ نزاع ہوتی ہے تو رسول اللہؐ اور اُن کے ساتھیؓ انقلاب کو بچانے کے لیے میدانِ رَزم (جنگ) میں اُترنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بدر کی جنگ میں اس رجعت پسند طاقت کا زور توڑ دیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد مکہ والے اُحد میں اپنی گرتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے میں قدرے کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر دو سال بعد غزوۂ خندق کا واقعہ پیش آتا ہے۔ اس میں مکہ والوں کے ساتھ عرب کی دوسری رجعت پسند طاقتیں — یعنی یہود اور بدو قبائل — مل کر مدینہ پر چڑھائی کرتے ہیں، لیکن وہ اس مجموعی طاقت سے بھی انقلاب کے مرکز مدینہ منورہ کو سَر نہیں کر پاتے۔

یہاں سے مکہ کی حکومت کا زوال شروع ہوتا ہے اور مدینہ کی انقلابی حکومت بہ تدریج آگے قدم بڑھاتی ہے۔ چناں چہ رسول اللہؐ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ سے نکلے آٹھ سال

ہی ہوئے تھے کہ قریش کی ساری کی ساری جمعیت نے انقلاب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ مکہ کا فتح ہونا تھا کہ عرب کے دوسرے قبائل بھی جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے۔ عرب کے اس سِرے سے لے کر اُس سِرے تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ جب رسول اللہؐ رحلت فرماتے ہیں تو سارا عرب مدینہ کی نئی حکومت اور اسلام کے نئے نظام کو تسلیم کر چکا ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کی پہلی منزل۔

قریش کے تصورِ قومیت میں کل انسانیت کے لیے وسعت

رسول اکرمؐ کی تعلیمات اور فیضِ صحبت سے اب قریش اور اُن کے پیرو، یعنی ان کے دوسرے عرب بھائی بند اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ اسلام کے پیغام اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اُٹھا سکتے۔ ایک لحاظ سے یہ قدم قریش کی قومیت ہی کی اِرتقائی شکل تھی۔ دراصل قریش میں اب تک قومیت کا جو محدود تصور تھا، اسلام نے اسے دوسرے معنی دے دیے تھے۔ اسلام نے قریش کی قومیت کو جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، مٹایا نہیں، بلکہ اسے بحال رکھا، البتہ اِس کا دائرہ وسیع کر دیا۔

اسلام قومیّتوں سے انکار نہیں کرتا۔ وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے، لیکن اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے۔ وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو، وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے، لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سِرے سے نہ رہے، یہ ناممکن ہے اور نہ فطرت اس کو گوارا کرتی ہے۔

اسلام نے قریش کے محدود قومی تصور کو یوں بدلا تھا کہ اب دوسری قوموں کے اچھے آدمی بھی قریش کی اس اصلاح شدہ قومیت میں شامل ہو سکتے تھے۔ اسلام سے پہلے قریش کی قومیت صرف مکہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔ خاص مکہ میں بھی قریش الگ تھے اور غیر قریشی عناصر — جن کی تعداد غالباً قریش سے کچھ کم نہ تھی — الگ تھے۔ اگر قریش ابولہب اور ابوجہل کے قومی تصور پر چلتے رہتے اور خون اور نسل ہی کو اپنے محدود معنوں میں معیارِ قومیت مانتے چلتے جاتے تو قریش کا وجود خطرے میں پڑ جاتا۔ اس کے برعکس اسلام

نے اس قومی تصور میں اتنی وسعت اور صلاحیت پیدا کردی کہ ایک طرف وہ تصور ساری عرب قوم پر مشتمل ہو گیا۔ دوسری طرف دیگر قوموں کے اچھے افراد بھی اس قومیت کے انسانی پہلوؤں کو اپنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ قریش اس نئی قومیت کے ترجمان اور قائد تھے اور عرب اور دوسرے لوگ ان کے ساتھی اور سپاہی۔

بعثتِ محمدیؐ کی بین الاقوامی حیثیت کی تکمیل کا دور

دنیا میں بعثتِ محمدیؐ کے بین الاقوامی مقصد کو نافذ العمل کرنے کا بار (بوجھ) قریش کی قیادت پر ڈالا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اس بار کا اپنے آپ کو پورا اہل ثابت کر دیا۔ چناں چہ ان کے ذریعے ہی چین سے لے کر فرانس تک بسنے والی خدا کی مخلوق اسلام سے متعارف ہوئی۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے قریش آپس میں لڑے اور ان کی انقلابی جماعت نے اپنے رجعت پسند بھائی بندوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہمارے خیال میں ابوجہل، ابولہب اور اس قبیل کے نام ور قریش سرداروں کو رسول اللہؐ کی عظمت و دیانت سے انکار نہ تھا۔ سکون واطمینان کی گھڑیوں میں وہ آپؐ کو — **نعوذ باللہ** — ''کاذِب'' (جھوٹا) اور ''مُفتری'' (آیات گھڑنے والا) بھی نہ کہتے ہوں گے، لیکن ان کو اعتراض یہ تھا کہ بلالؓ ایک حبشی زادہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کہنے سے ابوبکرؓ، عثمانؓ اور زبیرؓ جیسے اصیل و نجیب قریشیوں کا کس طرح بھائی بن سکتا ہے۔

رُؤسائے مکہ کی نظروں میں جو چیز ناممکن تھی، قریش کی اس جماعتؓ نے اسے امرِ واقعہ کر دکھایا۔ ابوجہل و ابولہب کا معیارِ قومیت غلط قرار دیا گیا۔ فتح مکہ کے دن قریش کی خاندانی نخوت و نسبی غرور — جو اُن کے لیے حقیقت میں جان کا لاگو بن رہا تھا — سب خاک میں مل گیا۔ کعبہ کی چھت پر بلالؓ کی آواز مکہ کی فضا میں بلند ہوئی۔ قریش کا خون اور نسل کی برتری کا محدود قومی تصور — جو کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے ذریعے عوام و خاص سے منوایا جاتا تھا — بتوں کے ساتھ وہ بھی رُخصت ہو گیا۔ اس کے بجائے ایک نیا قومی تصور معرضِ وجود میں آیا، جس میں جو کوئی بھی قریش کے افکار و خیالات سے متفق ہوتا،

www.rahimia.org

بہ آسانی سما سکتا تھا۔

اسلام کی دعوت ''لاقومیت'' (قومیت کی نفی) کی دعوت نہیں تھی، بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کو وجود میں لانے کا ذریعہ بن گئی۔

اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا جو ذہنی لحاظ سے تو اس وقت کا ایک بین الاقوامی شہر تھا، لیکن وہاں کے رہنے والے جسمانی لحاظ سے بدویوں کی سی صحت وتوانائی کے مالک تھے۔ مکہ میں اسلام کے اوّلین پیروؤں کی جو جماعت بنی، اس میں ہر قوم کے لوگ شامل تھے۔ ان میں قریش بھی تھے۔ بلال حبشیؓ جیسے بھی تھے اور صہیب رومیؓ بھی تھے۔

مکہ سے جب یہ جماعت مدینہ میں منتقل ہوئی تو اس میں عبد اللہ بن سلامؓ ایسے یہودی عالم اور انصار کے بڑے بڑے سردار بھی شریک ہوگئے۔ قرآن مجید نے اس جماعت کو ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' (120) (پہلے وہ لوگ جو آگے بڑھ کر کام کرنے والے) کا نام دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس جماعت میں قریش کی حیثیت سب میں ممتاز تھی، لیکن یہ امتیاز صلاحیت کی بنا پر تھا۔ کسی خاندان یا نسب کی وَجہ سے نہ تھا۔ درجے میں سب لوگ برابر تھے۔ چناں چہ اس عہد کی یہ ایک صحیح انٹرنیشنل جماعت تھی۔

مکہ کے سَر (فتح) ہونے کے بعد جب قریش کے بچے کھچے عناصر بھی نئی جماعت میں شامل ہوگئے تو یہ جماعت اتنی قوی ہوگئی کہ عرب کی سرزمین میں کوئی عرب یہودی یا عیسائی ان کے مقابلے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ چناں چہ عرب کے تمام قبائل اپنی قبیلہ یا قوم پرستیوں سے تائب ہو کر قریش کی نئی قومیت کا حصہ بن گئے۔ سب نے قریش کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ حجۃ الوداع میں جو رسول اکرمؐ کا آخری حج تھا، ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ نفوس تھے اور سب کی زبانوں سے ''لبّیک اللّٰھمّ لبّیک'' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سب کا ایک خدا، ایک نبی، ایک قوم اور ایک شاہراہِ زندگی تھی۔

اِرتداد اور ردِ انقلاب کی ناکام کوشش

عرب سے رجعت پسندی کے جراثیم ابھی پوری طرح فنا نہیں ہوئے تھے۔ چناں چہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرماتے ہی عرب کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک ردِ انقلاب کا ہنگامہ بر پا ہو گیا۔ چناں چہ مدینہ اور مکہ کی اس جماعت کو دوبارہ عربوں کو بہ زورِ شمشیر فتح کرنا پڑا اور انھیں قریش کی قیادت ماننے پر مجبور کیا گیا۔ ارتداد کا طوفان بڑا سخت تھا، لیکن انقلابی جماعت کے ایمان اور ہمت سے یہ بلا ٹل گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ارتداد کے خلاف جو بڑے بڑے معرکے ہوئے، ان میں پیش پیش مکہ کے نوجوان قریشی تھے، جن کو اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ارتداد حقیقت میں عرب کے بدو قبائل کی رجعت پسندی کا مظاہرہ تھا۔

قریش میں قیادت کی صلاحیت اور خلافتِ راشدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے تربیت یافتہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپؐ کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ یہ ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کی جماعت تھی۔ انھوں نے:

1۔ آپؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ چنا۔

2۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد اُن کی رائے سے حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔

3۔ یہی جماعت تھی جنھوں نے بہ اتفاقِ رائے حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی جگہ منتخب کیا۔

4۔ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے تو اسی جماعت کے غالب حصے نے حضرت علیؓ کو خلیفہ مانا۔

بے شک اس کی وجہ کوئی خاندانی اعزاز یا نسبی امتیاز نہ تھا، جیسا کہ بعد میں غرض مندوں نے سمجھ لیا۔ بات یہ تھی کہ مکہ میں اسلام سے بہت پہلے قُصَی کے زمانے سے ہی قریش کی ایک ایسی نسل پل رہی تھی، جو عرب کی قیادت کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں سے سمجھتے تھے۔ اپنے مذہب کو دینِ ابراہیمی مانتے تھے۔ چوں کہ حضرت ابراہیمؑ اسماعیلی عربوں کے مورثِ اعلیٰ تھے اور بنی اسرائیل بھی انھیں کو اپنا بڑا جانتے تھے، نیز غیر اسماعیلی یعنی قحطانی عرب بھی اسماعیلیوں سے گھل مل

رہے تھے، اس لیے ان روایات نے قریش کے ذہنوں میں بڑی وسعت کا امکان پیدا کر دیا تھا۔ دوسری طرف قریش پڑوس کی ترقی یافتہ قوموں اور ان کے مذاہب سے بھی آشنا تھے اور اپنے آپ کو ان سے کسی طرح بھی کم نہ سمجھتے تھے۔ پھر ان کا تجارتی سفروں کی وَجہ سے ان ممالک میں آنا جانا بھی تھا۔ نیز مکہ میں رہتے ہوئے جو عربوں کا دینی، اجتماعی اور ایک حد تک تجارتی مرکز بھی تھا، وہ عربوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے تھے۔

قریش کی قیادت؛ بعثتِ محمدیؐ کا لازمی نتیجہ

ان داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر قریش میں سے ائمہ (حکمرانوں) کا ہونا ایک قدرتی اَمر تھا۔ اس طرح قریش کا عرب کی قیادت کی سعادت حاصل کرنا بعثتِ محمدیؐ کا ایک لازمی نتیجہ بن گیا۔ یہی وَجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے سامنے اُن کی اسلام کے لیے خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد قریش میں سے ہی امیر کو چننے کے حق میں جہاں اَور دلیلیں دی تھیں، اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ عرب' قریش کے سوا کسی اَور کی اَمارت کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔ (چناں چہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس موقع پر فرمایا تھا:

"ما ذکرتم فیکم من خیرٍ فأنتم لہٗ أھلٌ، و لن یُّعرفَ ھٰذا الأمر إلَّا لھٰذا الحیّ من قریشٍ، ھم أوسط العرب نسباً و داراً." (121)

(جو کچھ تم نے اپنے بارے میں بھلائی کے کاموں کا تذکرہ کیا ہے، تو تم یقیناً اس کے اہل ہو۔ جہاں تک حکومت کا معاملہ ہے تو لوگ قریش کے قبیلے کے سوا کسی اَور کو نہیں جانتے۔ قریش کے لوگ نسب اور مکہ کی مرکزیت کے حوالے سے عربوں میں میانہ رو کے طور پر معروف ہیں۔)

رسول اکرمؐ کی رحلت کے فوراً بعد ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں آپؐ کا جانشین چننے کے لیے مدینہ کے انصار کا اجتماع ہوا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ خلیفہ انصار میں سے ہو۔ اُن میں آپس میں مشورے ہو ہی رہے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ

وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ مکہ کی ابتدائی جماعت کے نام ور افراد تھے۔ اس موقع پر اَنصار اور قریش صحابہؓ کی طرف سے بحث و مباحثہ ہوا اور طرفین کی طرف سے تقریریں ہوئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر نبی اکرمؐ کی یہ حدیث بیان کی کہ:

"اَلْاَئِمَّةُ مِنَ الْقُرَيْش." (حکمران قریش میں سے ہوں گے)(122)

اس تمام تر بحث کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ انصار نے قریش کی قیادت و امارت کے اصول کو تسلیم کرلیا، تاہم حضرت ابوبکرؓ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ:

"نحن الاُمراء و أنتم الوُزراء." (123)

(امیر ہم میں سے ہوں گے اور وزیر تم میں سے۔)

ہم (قریش) انقلاب کی قیادت کریں گے اور تم (انصار) ہمارے دست و بازو (وزیر) ہوگے۔

حضرت ابوبکر نے سقیفہ بنی ساعدہ میں قریش کی امارت کے حق میں جو دلیل دی تھی، بعد میں تاریخی واقعات نے بھی ان کے اس دعوے کی تصدیق کردی۔ چناں چہ عربوں کی جہاں کہیں حکومتیں بنیں، قریش کے خاندان کے لوگ ہی ان میں برسرِ اقتدار آئے۔ اُمویوں کے وارث عباسی بنے۔ اسپین میں جو عربی سلطنت قائم ہوئی، اس کے فرماں روا اُموی تھے۔ مصر میں قریش ہی کی فاطمی شاخ اپنی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اُمویوں، عباسیوں اور فاطمیوں کا دور ختم ہوا تو عرب بھی مسندِ اقتدار سے برطرف کردیے گئے اور ان کی جگہ مسلمانوں کی دوسری قوموں نے لے لی۔

صحابہ کرامؓ کی مرکزی جماعت میں اختلافِ رائے کی نوعیت

رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد اس مرکزی جماعت نے بالاتفاق حضرت ابوبکرؓ کو سردار چنا۔ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے تک مرکزی جماعت کا اتفاق قائم رہا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ "خیر القرون" کا زمانہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک مانتے ہیں۔ وہ "إزالة الخفاء" میں درجِ ذیل حدیث نقل کرتے ہیں:

"عن عبداللّٰہ (بن مسعود) عن النبیّ ﷺ: "خیر النّاس قرنی، ثمّ الّذین یلونھم، ثمّ الّذین یلونھم، ثمّ یجیء من بعدھم قومٌ: تسبق شھادتُھم أیمانَھم، و أیمانُھم شھادتَھم." (124)

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

"سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو ان کے قریب تر ہوں، پھر وہ جو ان کے قریب تر ہوں۔ پھر ایسی قوم آئے گی کہ (مال و جاہ کے حصول کی جلد بازی میں) کبھی گواہی کے الفاظ، قسم اٹھانے سے پہلے ادا کرے گی اور کبھی قسم کے الفاظ گواہی دینے سے پہلے ادا کرے گی۔)

اس کی تشریح میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"قرنِ اوّل از زمانِ ہجرتِ آں حضرت ﷺ است تا زمانِ وفاتِ وے ﷺ۔ و قرنِ ثانی از ابتدائے خلافتِ حضرت صدیق تا وفاتِ حضرت فاروق رضی اللہ عنہما۔ و قرنِ ثالث قرنِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ۔ و در ہر قرنے قریب بہ دوازدہ سال بودہ۔" (125)

(۱۔ پہلا قرن (دور) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانے سے شروع ہو کر آپؐ کے وِصال تک ہے (اھ/ 622ء تا ۱۱ھ/ 632ء)۔

۲۔ دوسرا قرن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے آغاز سے لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی وفات تک ہے (۱۱ھ/ 632ء تا ۲۴ھ/ 643ء)۔

۳۔ تیسرا قرن حضرت عثمانؓ کا زمانہ ہے (۲۴ھ/ 643ء تا ۳۵ھ/ 656ء)۔

ان میں سے ہر ایک "قرن" (دور) تقریباً بارہ سال کا ہے۔)

"خیر القرون" (بہترین زمانے) کی یہ تعیین ہم نے صرف امام ولی اللہ دہلویؒ کے ہاں پائی ہے۔ انھوں نے واضح دلائل کے ساتھ "إزالة الخفاء" میں اس تشریح کو اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اس کے صحیح ہونے پر دل پورا مطمئن ہو جاتا ہے۔

ہم نے امام (ولی اللہ دہلویؒ) کے زمانے سے لے کر اب تک اپنے تمام مشائخ کو

دیکھا ہے کہ وہ سب شاہ صاحبؒ کی اس تشریح پر متفق ہیں۔ چناں چہ تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک اور عقائد کے باب میں ان کے بیان کردہ تمام دینی معارف میں حدیث کی اسی تشریح کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ چناں چہ ولی اللٰہی جماعت کے محققین اور پھر دیوبندی حضرات ''خیر القرون'' میں حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پہلے کے زمانے کی تقلید کرنے اور اس کی اتباع کرنے کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

چناں چہ اس پہلے دور میں تین خلفائے راشدین ہیں:

[1] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

[2] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[3] حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

اس دور میں تجدیدی کردار ادا کرنے والے صحابہ کرامؓ کی جماعت میں تفقہ، دینی بصیرت کے حوالے سے نمایاں حضرات میں یہ تین خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی المرتضیٰؓ ہیں۔ تمام علوم و افکار اور سلسلہ ہائے اسناد انھیں سے جاری ہوئے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کے عہد میں صحابہؓ کی دو جماعتیں ہوگئیں:

(۱) ایک جماعت سمجھتی تھی کہ اگر حاصل شدہ سلطنت کے استحکام کی طرف توجہ نہ کی گئی تو سلطنت میں بڑا انتشار پیدا ہوجائے گا۔ پھر ایک طرف بدوعرب بھی بے قابو ہورہے تھے۔ دوسری طرف دیگر مفتوحہ اقوام ہنوز (ابھی تک) پوری طرح مطیع نہ ہوئی تھیں۔ اس جماعت کا کہنا یہ تھا کہ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کے لیے عربوں کو بہ حیثیت ایک قوم کے آگے بڑھنا چاہیے۔

(۲) اس کے خلاف دوسری جماعت' عربیت کو مؤخر اور ابتدائی زمانے کی اسلامیت کو مقدم رکھنا چاہتی تھی۔

چناں چہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں میں یہ کشمکش زوروں پر رہی۔

مرکزی جماعت کے اس اختلاف سے عربوں کے شورش پسند طبقوں نے فائدہ اُٹھایا اور حضرت عثمانؓ (۳۵ھ میں) شہید کر دیے گئے۔ ان شورش پسند عربوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ یہ دراصل بدوؤں کی پُرانی نراجی ذہنیت کا مظاہرہ تھا۔

بے شک حضرت علیؓ کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد کو تازہ کرنا تھا، لیکن ان کو کوفہ اور بصرہ میں جن لوگوں سے سابقہ پڑا، وہ عہدِ اوّل کی بلند نظری تو کجا، عربی تنظیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ حضرت علیؓ کا بلند نصب العین واقعی قابلِ تعریف تھا، لیکن جن لوگوں کے ذریعے وہ اس نصب العین کو عمل میں لانا چاہتے تھے، وہ بین الاقوامی تنظیم تو کیا' قومی تنظیم سے بھی ناواقف تھے۔

ان کے برخلاف حضرت امیر معاویہؓ عربوں کو بہ حیثیت ایک قوم کے منظّم کر کے اسلام کا محافظ بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے شام والوں کو عربیت کے نام سے جمع کیا۔ نصب العین تو ان کا بھی اسلام رہا، لیکن ان کا یہ نصب العین عرب قوم کا قومی مسئلہ بن گیا۔

جماعتِ صحابہؓ کے اختلافات کا درست تجزیہ

ہمارے نزدیک حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے اور حضرت علیؓ کی خلافت کے دور میں مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں، انھیں یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک یہودی مفسد یا چند بدطینت منافقوں کی سازشوں کا نتیجہ تھا، ٹھیک نہیں۔ خود ہی انصاف فرمایئے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا نظام سب سے برتر و اعلیٰ ہے اور جن بزرگوں نے اس نظام کو عملی شکل دی، وہ دنیا کے بہترین لوگ تھے۔

اگر یہ صحیح ہے اور ہم مانتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح اور درست ہے تو کیسے ممکن تھا کہ ایک یہودی یا چند نابکار اس نظام کو آسانی سے درہم برہم کر دیتے۔ اگر بہ فرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے تو لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ اسلام کا نظام اور اس کے اوّلین کارفرما —**نعوذ باللہ**— اتنی صلاحیت بھی نہ رکھتے تھے کہ ان کا لگایا ہوا پودا ایک معمولی سے جھکڑ کا مقابلہ کر سکتا۔

کسی نظام کی برتری اور اس کے نافذ کرنے والوں کی عظمت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ نظام نافذ کرنے والوں کے بعد بھی قائم رہے۔ نہ صرف قائم رہے، بلکہ اَور ترقی کرتا جائے۔ ورنہ تاریخ میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم میں کوئی غیر معمولی شخصیت پیدا ہوئی اور اس نے ایک مختصر سی مدت میں قوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن جوں ہی وہ شخصیت دنیا سے رُخصت ہوئی، اس کے ساتھ اس کی حاصل کی ہوئی عظمت بھی ختم ہوگئی۔

خدا نہ کرے اگر تاریخِ اسلام کے ان نظریات کو مان لیا جائے، جو آئے دن ہمارے بڑے بڑے ''اربابِ علم و فضل'' پیش کرتے ہیں اور اپنے ان نظریات کی بنا پر دنیا سے یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ وہ ان کے نظام کو سب نظاموں سے افضل اور مفید تر مان لے گی، جو بہ قول ان کے صرف تیس برس تک ٹھیک طرح چلا اور جس کے ان تیس برسوں کے بھی آخری دس سال آپس کی لڑائیوں اور خون ریزیوں میں گزرے۔

انقلابات کی ایک بنیادی حقیقت

درحقیقت خانہ جنگی یا Civil War ہر انقلاب کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ انقلاب کے ہنگامے میں (عوام کی شمولیت کے بعد) ہر مزاج اور ہر رُجحان کے آدمی باہم مل جاتے ہیں۔ ان (عوام) کا یہ اتحاد داخلی سے زیادہ خارجی اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ انھیں چوں کہ مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ:

''دوسروں کی دشمنی اور عداوت ناہم جنسوں کو بھی اکٹھا کر دیتی ہے۔''

چناں چہ ہر خیال کے آدمی، جن کا نصب العین انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے، اس جماعت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کی کشمکش میں جہاں ہر آدمی کو مرنے مارنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا، طبیعتوں کے یہ اختلافات اُبھرنے نہیں پاتے اور جماعت میں یکجہتی قائم رہتی ہے، لیکن جوں ہی مخالف قوتیں ختم ہوجاتی ہیں اور سامنے کوئی فوری اور سخت خطرہ نہیں رہتا تو پھر دبے ہوئے جذبات اُبھرتے ہیں۔ شروع شروع میں نظری اختلافات ہوتے ہیں۔ پھر ہر خیال کا ایک گروہ بن جاتا ہے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچتی

ہے کہ خود انقلابی جماعت آپس میں پھٹ جاتی ہے۔ دوسروں سے لڑنے کے بجائے یہ باہم دگر لڑنے لگ جاتے ہیں۔

دنیا میں جہاں بھی انقلاب برپا ہوا، ہمیشہ ہنگامۂ انقلاب کے سرد پڑتے ہی وہاں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ لیکن یہ خانہ جنگی انتشار یا زوال کی علامت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک کام کرنے کے متعلق مختلف رائیں ہوجاتی ہیں۔ اب اگر ہر ایک رائے کو مان لیا جائے تو اجتماعیت (سوسائٹی) کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ ایک رائے والے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالیں، لیکن دوسرا فریق بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسرے کی دلیل و منطق سے وہ قائل نہیں ہوتا، اس لیے لازمی طور پر تلوار سے معاملہ کو نبٹانا پڑتا ہے۔

پارلیمانی نظام حالتِ امن میں کام کرتا ہے

پارلیمنٹری نظام میں یہ جھگڑا عام انتخاب کے ذریعے طے ہوجاتا ہے اور تلواروں کے بجائے ووٹوں سے جمہور فیصلہ کردیتے ہیں کہ کون سا فریق برسرِ اقتدار ہو۔ ہارنے والی جماعت اس فیصلے کو تسلیم کر لیتی ہے، لیکن غالب فریق شکست خوردہ جماعت کو خارج از بحث نہیں کردیتا، بلکہ اس کو شریکِ حکومت (نظام میں شریک) بناتا ہے۔ اس سے مشورے لیتا ہے۔ بعض دفعہ اگر ان کا مشورہ صحیح سمجھے تو اسے قبول بھی کر لیتا ہے۔ ہارنے والی جماعت غالب فریق کی حکومت صرف اس لیے تسلیم کر لیتی ہے کہ اسے یہ اُمید ہوتی ہے سال، دو سال یا پانچ سال کے بعد ہم پھر جمہور سے استصوابِ رائے کر سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اب کے ہم غالب آئیں۔ لیکن یاد رہے کہ پارلیمنٹری نظام صرف امن و امان اور عام حالات ہی میں چل سکتا ہے۔

غیر معمولی حالات میں انقلابیوں کے رویے اور کردار

اس کے برعکس کسی انقلاب کا ہونا خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ملک کے حالات غیر معمولی تھے۔ اس لیے باتوں اور رائیوں کے بجائے تلواروں سے کام لینا پڑا۔ اس سے

کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انقلابی طبعاً خون آشام ہوتے ہیں۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ وہ لوگ جن کو اپنی دعوتِ انقلاب کے سلسلے میں تلوار چلانی پڑی، ان میں اکثر ایسے تھے جو بڑے رقیق القلب (نرم دل) تھے۔ وہ بچوں کے ساتھ ہوتے تو بالکل معصوم بچے بن جاتے۔ وہ طبیعت کے بے حد نرم اور مزاج کے بڑے ٹھنڈے تھے۔

ہوا یہ کہ ان کے زمانے کے لوگ دلیل کے بجائے محض تلوار کو حَکَم اور پنچ مانتے تھے۔ چناں چہ ان بزرگوں کو مجبوراً تلوار بے نیام کرنی پڑی۔ جب انقلاب میں تلوار ہی حَکَم ٹھہری تو ظاہر ہے کہ انقلاب کے بعد خود انقلابی جماعت میں جو اختلاف ہوگا، اس کا فیصلہ بھی تلوار سے کیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور اس عہد کی دوسری لڑائیاں دراصل دو رائیوں کا تصادم تھا۔ عام حالات ہوتے تو دونوں جماعتوں میں ووٹوں کے ذریعے فیصلہ ہو جاتا، لیکن وہ زمانہ اَور تھا۔ ہر شخص شمشیر بند تھا۔ اس لیے اس کی رائے کا اظہار شمشیر ہی سے ہوتا تھا۔

اسلام؛ ایک انقلابی تحریک

بے شک رسول اللہﷺ کے بڑے ممتاز اور قریبی صحابہؓ میں تلوار چلی۔ اسلام کے مخالف اس پر ہنستے ہیں۔ جو مسلمان ہیں، وہ اس کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہﷺ کی پیشین گوئیاں بیان کرتے ہیں۔ دبی زبان میں کچھ کہتے تو بعد میں جو بات کہی تھی، اُسے اَن کہی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر اسلام کو ایک انقلابی تحریک کی نظر سے دیکھا جائے تو سارے معاملات واضح ہو جاتے ہیں۔ کسی کو بُرا بھلا کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ دل میں کچھ اَور اور زبان و قلم سے کچھ اَور کہنے اور لکھنے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔

ایران، شام اور مصر کو فتح کرنے اور کسریٰ کو ختم اور قیصر کو ایشیائی مملکت سے محروم کرنے کے بعد عربوں کا انقلابی جوش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ ایک بدو مدینہ سے اونٹ پر سوار ہوتا تو اسلامی سلطنت کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے اس کا دم ختم

www.rahimia.org

ہو جاتا۔ پہلے عرب اپنے آپ کو مخالف قوتوں میں گھرا ہوا پاتے تھے۔ ہر طرف ان کے ایسے دشمن بھی موجود تھے، جن کا سَر کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ قدرتی طور پر اس زمانے میں ان کی طبیعتوں کا انقلابی رُجحان پورے عُروج پر تھا، لیکن جب انھیں اتنی بڑی سلطنت مل گئی اور ان کے سامنے کوئی فوری خطرہ بھی نہ رہا تو ظاہر ہے کہ اس جوش و خروش میں کمی آ گئی۔ اگر عربوں میں واقعی اس وقت انقلاب کا پہلا سا زور ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جیسے اولوالعزم خلیفہ کو نامساعد حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

☆

www.rahimia.org

مقالہ 15

اسلام کے عالم گیر انقلاب کی دوسری اور تیسری منزل

عربوں کی قومی حکومتوں کا دور

(دورِ اُموی اور دورِ عباسی)

(۴۱ھ تا ۱۳۳ھ/660ء تا 749ء)

www.rahimia.org

انقلاب کی دوسری منزل میں نئی انقلابی حکمتِ عملی

''جب کوئی قوم انقلاب کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے لائحۂ عمل کو نیا رنگ دے۔ شروع شروع میں قوم کے سارے کے سارے فرد انقلاب کے سپاہی ہوتے ہیں۔ اگر کسی سبب سے حرب وضرب کا سلسلہ رُک جائے تو اُن میں آپس میں لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں یہی ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو سمجھا۔ انھوں نے اس انقلاب کو قومی شکل دے دی۔ عرب بہ حیثیتِ قوم کے، اس کے حامل ومحافظ بن گئے۔ چناں چہ حضرت امیر معاویہؓ نے دمشق کو پایۂ تخت بنایا اور اپنا بحری بیڑہ — جو سترہ سو جہازوں پر مشتمل تھا — تیار کیا اور عربوں کو نئی فتوحات کی طرف متوجہ کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی اس سیاست اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ عرب، جو آپس میں لڑلڑ کر فنا ہو رہے تھے، پھر متحد ومتفق ہو گئے اور خشکی وتری میں اُن کی فوجیں اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔''

اسلام کے عالم گیر انقلاب کی دوسری اور تیسری منزل

عربوں کی قومی حکومتوں کا دور

(دورِ اُموی اور دورِ عباسی)

(۴۱ھ تا ۶۵۶ھ/ 660ء تا 1258ء۔ سقوطِ بغداد)

www.rahimia.org

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے ساتھ ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کا دورِ اقتدار ختم ہوتا ہے۔ اسلام کی بین الاقوامی تحریک کو چلانے والی اس وقت کوئی ایک ایسی مرکزی جماعت موجود نہ تھی، جو سب قوموں کی نمائندہ ہوتی، بلکہ اس وقت تک عربوں کے سوا کسی دوسری قوم نے بہ حیثیتِ مجموعی اسلام کو قبول بھی نہ کیا تھا۔ اور فرداً فرداً اگر کوئی غیر عرب گروہ اس میں شامل ہوا بھی تھا تو حضرت عمرؓ کی شہادت کے واقعے کے بعد اس سے اعتماد اُٹھ گیا۔ ان حالات میں یقیناً عرب ہی اس تحریک کے محافظ اور علم بردار بن سکتے تھے۔

اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک عام عربوں کے لیے قومی تحریک بن گئی۔ اس کی حفاظت اور بقا ان کی قوم کی موت و زندگی کا سوال ہوگیا۔ لامحالہ اس کا اثر حکومت کی روش پر بھی پڑا۔ گو اسلام کی بین الاقوامیت اپنی جگہ بدستور قائم رہی، لیکن عملاً عربوں نے آہستہ آہستہ بین الاقوامیت کو اپنے قومی دائروں میں لے لیا۔ کیوں کہ اس وقت اس کے بقا کی صرف یہی ایک صورت ممکن تھی۔ اگر عرب اس کو اپنا قومی مسئلہ نہ بنا لیتے تو

اسلام کی بین الاقوامیت مختلف عناصر کی کھینچا تانی کے ہاتھوں کبھی منڈھے نہ چڑھ سکتی۔ اب عربوں کی قومی حکومت شروع ہوتی ہے۔

انقلاب کی دوسری منزل: اُموی دور (۴۱ھ تا ۱۳۳ھ/ 660ء تا 749ء)

جب اسلام کی تحریک کی حفاظت عربوں نے اپنا قومی مسئلہ بنا لیا تو ظاہر ہے کہ اسلام سے پہلے قریش کے جس خاندان کے ہاتھ میں اقتدار تھا، وہ برسرِ عروج ہوتا۔ یہی وَجہ ہے کہ عربوں کی قومی حکومت کی قیادت بنواُمیہ کو ملی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کی حکومت' مسلمان عربوں کی قومی حکومت کا بہترین نمونہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمان عربوں کے بہت بڑے آدمی تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا تھا کہ:

> ''میں نے رسول اللہؐ کے بعد معاویہؓ سے زیادہ امورِ مملکت میں ماہر کسی کو نہیں دیکھا۔'' آپؓ سے کہا گیا کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کو بھی؟ آپؓ نے فرمایا کہ: ''وہ سب معاویہؓ سے افضل و بہتر تھے، لیکن معاویہؓ طریقِ جہاں بانی میں ان سے منفرد تھے۔''(126)

عام عربوں کا رُجحان بنوہاشم کے مقابلے میں اُمویوں کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے اپنے اسباب ہیں۔ علوی' خاندانِ رسالت میں ہونے کی وَجہ سے اپنے آپ کو دوسرے عربوں سے ممتاز سمجھتے تھے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اُمویوں کا برسرِاقتدار آنا حقیقت میں اسلامی اصولوں سے کسی قسم کی بغاوت نہ تھی، بلکہ اُموی دور' اسلام کی بین الاقوامی تحریک کے ارتقا کی ایک لازمی کڑی کا حکم رکھتا ہے۔

بنواُمیہ کے ساتھ مؤرّخین کی ناانصافی

ہمارے تاریخ نگاروں نے بنواُمیہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بنواُمیہ کے سیاسی مخالفوں نے بھی — جو بعد میں ان کے تخت و تاج کے وارث بنے — انھیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پہلے ہم بھی بنواُمیہ کے خلاف اپنے مؤرّخوں کی باتیں پڑھ کر متأثر ہو جاتے تھے، لیکن اب جو ہم نے دنیا کی انقلابی تحریکوں کا بہ غور مطالعہ کیا اور ایک

www.rahmia.org

انقلابی تحریک کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان کو جانا تو ہم پر اُموی دور کی اصل حقیقت واضح ہوگئی۔

جس زمانے میں بنواُمیہ کے خلفا سلطنتوں کے مالک ہوئے، اس زمانے میں بادشاہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مسئولیت سے بالا سمجھتے تھے، لیکن یہ عدمِ مسئولیت صرف شخصی اور نجی زندگی تک محدود ہوتی۔ جہاں تک قوم اور ملک پر حکومت کا تعلق تھا، اس کے لیے ایک معین دستور اور قانون تھا۔ جو بادشاہ یا فرماں روا اس مسلمہ دستور کی خلاف ورزی کرتا، اس کی سلطنت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی۔

بدقسمتی سے ہمارے تاریخ نگاروں نے فرماں رواؤں کے ذاتی حالات اور خانگی زندگی کے واقعات کو تاریخ میں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کی صحیح حیثیت ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

انقلاب کی دوسری منزل میں نئی انقلابی حکمتِ عملی

جب کوئی قوم انقلاب کی اس منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے لائحۂ عمل کو نیا رنگ دے۔ شروع شروع میں قوم کے سارے کے سارے فرد انقلاب کے سپاہی ہوتے ہیں۔ اگر کسی سبب سے حرب و ضرب کا سلسلہ رُک جائے تو اُن میں آپس میں لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے آخری زمانے میں یہی ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو سمجھا۔ انھوں نے اس انقلاب کو قومی شکل دے دی۔ عرب بہ حیثیتِ قوم کے، اس کے حامل و محافظ بن گئے۔ چناں چہ حضرت امیر معاویہؓ نے دمشق کو پایۂ تخت بنایا اور اپنا بحری بیڑہ — جو سترہ سو جہازوں پر مشتمل تھا — تیار کیا اور عربوں کو نئی فتوحات کی طرف متوجہ کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی اس سیاست اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ عرب، جو آپس میں لڑلڑ کر فنا ہو رہے تھے، پھر متحد و متفق ہو گئے اور خشکی و تری میں اُن کی فوجیں اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔

اس دور میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت کی بحالی

ہم نے بنواُمیہ کی غلطیوں کو تو خوب اُچھالا، لیکن اُن کی حکومت کی جو اچھائیاں تھیں، ان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا۔ بے شک اُمویوں نے اسلامی حکومت کو قومی اور عربی رنگ دیا، لیکن انھوں نے اسلام کے بین الاقوامی فکر کو اپنی قومی حکومت کے تابع نہ بنایا۔ چناں چہ عہدِ اُموی میں اسلام کا سیاسی مرکز دمشق تھا، لیکن ذہنی اور علمی مرکز مدینہ ہی رہا۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی فکر کی بین الاقوامیت بحال رہی۔

الغرض! اُموی حکومت کی سیاست تو بے شک عربی امتیاز کو لیے ہوئے تھی، لیکن اس سیاست سے جو علمی نتائج مرتب ہوئے، وہ مفتوح کے حق میں بے حد مفید تھے۔ عربی فتوحات نے مفتوحہ ملکوں کے اوپر کے طبقے کو، جن کے بار تلے ان کے عوام بُری طرح کچلے جا رہے تھے، ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ نیز جہاں جہاں عرب فاتح گئے، اُن کے ساتھ اسلام گیا۔ فتوحات کا سیلاب تو آیا اور گزر گیا، لیکن اسلام کے عقائد جس جس سرزمین پر پہنچے، وہاں لوگوں کی ذہنی اور جماعتی زندگیوں کو بدلتے چلے گئے۔ پہلے کے مذاہب جو بے جان اور بے روح کھلونے بن چکے تھے، اسلام کے فکری طوفان کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ پرانی دنیا اپنی تمام تر فرسودگیوں کے ساتھ رُخصت ہوئی اور تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اُموی دور میں اسلام کے زرّیں کارنامے

اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسا پایا تھا اور اس کی کیا کایا پلٹ کر دی؟ اسلام کے اس زرّیں کارنامے کی صدائے بازگشت غیر مسلم مؤرّخین کی زبانی سنیے۔ ایم این رائے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ’’اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی، جس نے عرب قبائل کو متحد کر دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنتِ روما کے وہ تمام ایشیائی و افریقی صوبے آ گئے، جو قدیم متزلزل نظام

سے نکلنا چاہتے تھے۔ عیسائیت میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی۔ وہ اپنے کمزور کندھوں پر خانقاہیت (رہبانیت) کا بوجھ لیے کانپ رہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں عربستان سے اُمید کی کرن پھوٹی۔ اسلام کی تلوار بہ ظاہر خدا کی خدمت کے لیے بلند ہوئی، لیکن درحقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگِ بنیاد رکھا، جس نے تمام فرسودہ خیالی، توہم پرستی اور (بے کار) قدیم مذاہب کو موت کی گہری نیند سلا دیا۔"(127)

اسلام کی اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے اجتماعیت پر لکھنے والا فرانس کا مشہور مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے:

"اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس زمانے کی عربی تہذیب کے اثر اور اس کی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی۔ اِیرانی، بازنطینی اور قبطی سب ایک لاعلاج کاہلی کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ عربوں سے ربط و ضبط پیدا ہونے کی وَجہ سے ان کی سستی دُور ہوگئی۔ ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہوگئی۔"(128)

اُموی فتوحات کے انقلابی کارنامے

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا، یا حکمران طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اُچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی، لیکن اسلامی انقلاب سے جو شان دار اور دُور رَس نتائج بر آمد ہوئے، ان کی تحقیق نہ کی۔ اُموی فتوحات کی وَجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہوسکے کہ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔ اس وقت ممالک فارس و رُوما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ ایک نیا سماجی نظام، نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لے کر اُٹھے اور تاریک دُنیا میں علم کا نور پھیلا دے۔ مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے ناگفتہ بہ

ماحول نے فارس اور روم کے ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اَخلاقی کمزوریوں کے قعرِ مذلت میں پھینک دیا تھا۔

بنواُمیہ کی عربی حکومت نے ایک تو ممالکِ فارس و روم کے کھنڈرات صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ دوسرے اپنی فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو بھی عام کیا۔ اس طرح مفتوحہ ممالک کی قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں۔ ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک بنانے پر مجبور ہوگئے۔

موسیو لیبان کے الفاظ میں:

> ''خون ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں دیا گیا، از سرِنو پھوٹتا ہے۔ جب طوفان تھم جاتا ہے تو اُمویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکبِ اقبال (عروج کے ستارے) کی درخشانی سے اُفق روشن ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت و جلال کے ایک شان دار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔''(129)

خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمان عربوں کی اس قومی سلطنت کو میں دنیا کی بہترین سلطنت مانتا ہوں۔ ہمارے نزدیک بہترین حاکم یا تو خلیفہ راشد ہوتا ہے، یا سلطانِ عادل۔ خلیفہ راشد صرف قانون کو حاکم مانتا ہے اور سلطانِ عادل اپنی قومی طاقت سے انصاف کرتا ہے۔ جب خاندانی بادشاہت ہوتی ہے تو سارے حکمران کبھی ایک سے نہیں ہوتے۔ ایک عادل ہوگا تو اُس کا جانشین غیر عادل۔ پھر ممکن ہے کہ ایک عادل تخت پر بیٹھ جائے۔ ولید بن عبدالملک نے کہا تھا کہ:

> ''(حضرت) داؤد اور (حضرت) سلیمان علیہما السلام کی حکومت شام میں رہی۔ وہ نبی تھے۔ اس سے قطع نظر کرلو۔ پھر میری حکومت کا اُن کی حکومت سے مقابلہ کرو۔ اور دیکھو کوئی اندھا نہیں، جس کے لیے میں نے عصا بردار مقرر

نہ کیا ہو۔ اور کوئی بھوکا اور بیمار نہیں ہے، جس کو کھانا اور دوا نہ پہنچتی ہو۔'' (130)

یہ ایک عرب بادشاہ کی حکومت ہے۔ خلیفہ راشد کی حکومت نہیں۔ خلیفہ راشد کی حکومت نمونے کی حکومت ہے۔ اس کی نظیر پھر مسلمان پیدا نہیں کر سکتے۔ خلفائے راشدینؓ کی حکومت تو گویا ایک مثالی حکومت تھی، تاہم قریش کے ان دیگر سرداروں کی حکومت بھی کچھ کم شان دار نہ تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان حکومتوں کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ مگر قریش کے یہ بادشاہ بھی انسانی اجتماع کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اسلام کے عالَم گیر انقلاب کی دوسری منزل یہاں ختم ہوتی ہے۔ عباسیوں سے اس کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

انقلاب کی تیسری منزل؛ عباسی دور (۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ/ 749ء تا 1258ء)

پہلے دور میں قریش سارے عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتے ہیں۔ دوسرے دور میں قریش اور عرب مل کر دنیا کے ایک وسیع رقبے کو اسلام کے زیرِ اثر لے آتے ہیں۔ گو عہدِ اُموی میں حکمران طبقوں میں عربی رنگ غالب تھا، لیکن اہلِ علم اسلام کی عمومی حیثیت کی بڑی شد و مد سے اشاعت کرتے رہے۔ چناں چہ اس عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر عرب مسلمان بھی حکومت میں مساوی حیثیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ اُموی عرب پہلے کی طرح قومیت کو ہی اشاعتِ اسلام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہ تھا کہ ایک صدی میں کتنی اَور قومیں مسلمان ہو چکی ہیں۔ اب ان کے وجود کا انکار کر کے کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔

عباسیوں نے بدلتے ہوئے زمانے کی اس ضرورت کو سمجھ لیا۔ وہ ایرانیوں کو ساتھ ملا کر اُمویوں سے اقتدار چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ عباسی دور آتا ہے تو عرب اور غیر عرب مسلمان مل جل کر حکومتیں قائم کرتے ہیں۔ گو اَخلاقی سیادت عربوں کے ہاتھ میں رہتی ہے، لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں پر غیر عربی چھا جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ عربوں کا اَخلاقی اقتدار بھی کم ہو جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایرانی قومیں اسلام کے بین

الاقوامی مرکز کی مالک بن جاتی ہیں اور عربوں کی حیثیت دوسرے درجے کی رہ جاتی ہے۔

’مدینہ منورہ‘ اسلام کے اوّلین بین الاقوامی اور انسانی دور کا مرکز تھا۔

’دِمشق‘ خالص عربی قوموں کا مرکز بنا۔

’بغداد‘ میں عرب امیر اور ایرانی وزیر تھے۔

ایرانیوں نے بغداد کی عباسی خلافت کے زیرِ تربیت حکومت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کی۔ شروع شروع میں تو ایرانی دَبے رہے۔ اگرچہ عباسیوں نے ان کی مدد سے ہی اُمویوں کو خلافت سے برطرف کیا تھا، لیکن ابتدا کے چند عباسی خلفا نے عربی سیادت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ چناں چہ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون نے جب بھی موقع ملا، اپنے ایرانی وزرا اور اُمرا کو — جو سلطنت میں بڑے دخیل اور صاحبِ اقتدار تھے — بے دریغ قتل کر وایا۔ ایران کے قدیم افکار کو جو اسلام پر غالب آنے یا اسے اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے سر اٹھا رہے تھے، بڑی سختی سے کچلا۔ لیکن ہارون کے بیٹے مامون کا اپنے بھائی امین کے مقابلے میں کامیاب ہونا‘ دراصل عربوں کے خلاف ایرانی عنصر کی فتح تھی۔ اس عہد میں خلافت کی فوج میں عربوں کا وجود برائے نام رہ گیا تھا۔

مامون کے بعد معتصم اور واثق کا زمانہ آیا تو تُرک — جنھیں ہم تمدنی اعتبار سے ایرانی ہی کہتے ہیں — خلافتِ عباسی کے سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے۔ مامون نے اپنے عہدِ خلافت میں غیر عرب مسلمانوں کو حکومت کا اہل پا کر انھیں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے بھی دیے۔ بعض کو تو صوبوں کی مستقل حکومتیں بھی عطا کیں۔

اسی زمانے سے عباسی خلافت کے ماتحت مشرق و مغرب میں نیم آزاد سلطنتیں بننا شروع ہوتی ہیں۔ جو اپنے اندرونی معاملات میں تو مستقل تھیں، لیکن حاکمیتِ بالا عباسی خلفا ہی کی تسلیم کرتی ہیں۔ چناں چہ مشرق میں بخارا، غزنی اور بعد میں دہلی کی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ اُدھر مغرب میں مصر اور مراکش کی حکومتیں بنیں۔ اس طرح تقریباً پانچ سو برس اسلام کی مرکزی قوت‘ عرب اقوام کے ہاتھ میں رہی۔ ان اقوام کی امامت قریش نے کی۔

عرب (اُموی وعباسی) دورِ حکومت کا جائزہ

قرآن حکیم کی اس اجتماعی تحریک کا پہلا مرکز قریش تھا۔ قریش کی حکومت تقریباً پانچ سو سال تک رہی۔ اس کے ابتدائی دور میں قریش میں سے وہ بارہ سردار ہوئے، جن کی خوش خبری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت امیر معاویہؓ، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک، منصور، مہدی، ہارون الرشید)۔ [131] ان بارہ سرداروں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں مٹا کر دُنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر اسلامی سلطنت قائم کی۔ اس حکومت کو اگر سیاسی شعور کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ انسانیت کے لیے ایک نمونے کی حکومت تھی۔ بے شک یہ لوگ شان دار زندگی گزارتے تھے، مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماع اور اس کی ضرورتوں کا بھی پورا پورا خیال رکھتے اور رعایا کے عمومی مفاد کو نظرانداز نہ کرتے تھے۔

تاریخ کے مطالعے کا صحیح طریقہ

بدقسمتی سے ہمارے مؤرّخین نے تاریخ کو اجتماعی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بہ حیثیتِ مجموعی کسی تحریک، حکومت یا اجتماع کو دیکھتے، وہ حکمرانوں کی خانگی زندگیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ یہی وَجہ ہے کہ ہماری تاریخوں میں ان فرماں رواؤں کے ذاتی اور شخصی نقائص بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مؤرّخ کے نزدیک جس خاندان کو حکومت ملنی چاہیے تھی، اس کے بجائے اس کے مخالف کو حکومت مل گئی اور اوّل الذکر کی مؤخر الذکر سے جنگ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ''قلم بہ دستِ دشمن'' کا معاملہ تھا، اس لیے یہ مؤرّخ اِن حکمرانوں کے متعلق جو کچھ بھی لکھتے، کم تھا۔

ہمیں چاہیے کہ اب ہم تاریخ کو اس طرح نہ پڑھیں، بلکہ ایک حاکم نے عام انسانیت کے لیے جو کچھ کیا، ہمیں اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چناں چہ اگر شاہانِ اسلام

کے اجتماعی کام اچھے تھے تو ان کے شخصی نقائص اور ان کا اَوروں سے تھوڑا بہت مالی تفوّق (یعنی اَوروں سے مال کی زیادتی)، یہ ایسی چیزیں نہیں کہ ہم انھیں اتنی زیادہ اہمیت دیں۔ آخر مسلمانوں کے علاوہ اَور قوموں میں بھی بادشاہ گزرے ہیں۔ مسلمانوں کے ان حکمرانوں کا ان سے مقابلہ کیجیے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے انتقال (۱۹۳ھ/ 858ء) اور امین الرشید اور مامون الرشید کے درمیان پیدا ہونے والے فتنوں کے بعد اس دور کے خلفا میں مامون الرشید کے زمانۂ خلافت ۱۹۸ء/ 813ء تا ۲۱۸ھ/ 833ء سے لے کر خلیفہ قادر باللہ اسحاق بن مقتدر کے زمانۂ خلافت ۳۸۱ھ/ 991ء تا ۴۲۲ھ/ 1031ء تک دس خلفا گزرے ہیں۔

انھوں نے دریائے سندھ کے دوسری طرف واقع شہروں اور علاقوں پر حکومت کی ہے۔ اس لیے ان علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں، بعد میں مسلمان ہونے والی شمال مغربی ہندوستان کی اقوام کے مقابلے میں زیادہ دینِ اسلام میں رسوخ پایا جاتا ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ خلافت کے مراکز میں اقتدار حاصل کرنے والی عجمی (ایرانی) اقوام کے غلبے سے ہندوستانی مسلمان بھی بہت متأثر ہوتے رہے ہیں۔ علامہ شیخ محمد خضری بک لکھتے ہیں:

"اہلِ خراسان اور بعد میں مسلمان ہونے والے موالی کے ہاتھوں عباسیوں کی حکومت اور سلطنت قائم ہوئی۔ اسی سبب سے عباسی دورِ خلافت میں ان لوگوں کو ایسا بڑا مرتبہ اور مقام حاصل ہوا، جو کسی طرح بھی عربوں کے مقام سے کم نہ تھا۔ اس لیے کہ (عباسی) حکومت کی عظمت و شان انھیں کی وَجہ سے قائم تھی۔ چناں اس دور میں اہل خراسان اور اہل عرب میں بڑے عظیم قائدین پیدا ہوئے۔

مامون کی حکومت اور خلافت کا قیام اہلِ خرسان کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس لیے اس حکومت میں ان کی عظمتِ شان میں اضافہ ہوا۔ جتنی ان کی عظمتِ شان میں اضافہ ہوا، اتنی ہی عربوں کے غلبے میں کمی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس دور میں کوئی قابلِ ذکر عرب رہنما اور مشہور قائد ایسا نہ رہا جیسا کہ

منصور، مہدی اور (ہارون) الرشید کے عہد میں تھا۔ اس دور میں عسکری قوتوں کو کنٹرول کرنے والے تمام بڑے لوگ صرف اہلِ خراسان میں سے تھے۔ انھیں پر بہت زیادہ اعتماد کیا جانے لگا۔ البتہ اس دور میں ماوراء النہر (دریائے آمو کی دوسری طرف) کے علاقوں میں بسنے والے ترکوں میں سے کچھ عناصر ایسے تھے کہ جن میں سے چند قائدین کے نام سامنے آتے ہیں۔ حکومت کے عسکری لشکروں کی یہ حقیقت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس دور میں عرب خلافت اور حکومت محض برائے نام کی رہ گئی تھی۔'' انتھیٰ [132]

میرے نزدیک یہ بات ثابت شدہ ہے کہ (اس دور میں) ''خلقِ قرآن'' کا جو مسئلہ (یعنی قرآن اللہ کی مخلوق ہے یا اس کا کلام ہے) پیدا ہوا تھا، وہ دراصل عجمی ذہنیت کا عرب ذہنیت کے ساتھ ٹکراؤ کا معاملہ تھا۔ اس کے نتیجے میں دینی حوالے سے عربی زبان کو مقدم سمجھنے اور اس کی برتری کا رعب لوگوں کے دلوں سے ختم ہوگیا۔ اس دور میں ان لوگوں نے ایسے اصولوں کی بنیاد رکھ دی، جن سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ قرآنی الفاظ کی نسبت' اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کی طرف حقیقت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ان پر ''**کلامُ اللّٰہ**'' کے لفظ کا اطلاق مجازی طور پر کیا جانا چاہیے۔

''**خاتم فقهاء العرب**'' (عربوں میں آخری فقیہ) امام احمد بن حنبلؒ نے اس نظریے کا بڑی شدت سے انکار کیا، جب کہ اہلِ عجم سے تعلق رکھنے والے بڑے محدثین جیسا کہ امام یحییٰ بن معینؒ، علی ابن مدینیؒ اور امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ وغیرہ بھی اس مسئلے سے خاصے متأثر ہوئے۔

اگر آپ چاہیں تو حنفی اور شافعی فقہا کے باہمی اختلافات کو بھی عرب وعجم کے اس باہمی جھگڑے کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ ائمہ مجتہدین امام مالکؒ و (امام) شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ، (امام سفیان) ثوریؒ اور (امام) ابویوسفؒ کے مسالک کے درمیان باہمی قربت ہونے کے باوجود (اس دور میں حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان پیدا ہونے والے)

اس اختلاف و افتراق کی شدت کا اور کوئی معنی نہیں ہے۔

حکومتوں پر فقہا کی نگرانی اور تنقید

بے شک اسلامی حکومتوں کا یہ عہد محدود مطلق العنانی (شخصی حکومت) کا عہد تھا۔ فرماں روا جو چاہتے تھے، کرنے کے مجاز ہوتے تھے، لیکن اس زمانے میں ملک میں ایسی با اَثر جماعتیں بھی ہوتی تھیں، جو ان حکمرانوں میں اعتدال پیدا کرتی تھیں۔ ان کو حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا کرتی تھیں۔ یہ فقہا اور صوفیا کی جماعتیں تھیں۔

فقہا قانون کو نافذ کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ ایک فقیہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوتا تھا۔ ساری قلم رَو کے قاضی اس کے ماتحت ہوتے۔ چناں چہ بادشاہ ان قاضیوں کے فیصلوں میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اسلامی قانون بادشاہ کی سیاست سے آزاد رہتا اور اس کی سلطنت میں ایک مستقل حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔

اس دور کے فقہا میں نمایاں نام امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا ہے۔ آپؒ حضرت علیؓ کے جانشین ائمہ اہلِ بیت اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تربیت یافتہ خلفا سے سلسلۂ سند رکھتے ہیں۔ وہ دینِ اسلام کے بین الاقوامی نظام کی قانون سازی کرنے والے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: ”میں نے امام زید بن علی بن حسینؒ سے زیادہ حاضر جواب کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے حضرت زید بن علیؒ سے کہا: اللہ تعالیٰ نے گناہوں کو بھی مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ تو انھوں نے فرمایا: کیا پھر زبردستی گناہ کروایا جاتا ہے؟۔“

حافظ یحیٰ بن حسین بن محمد بن قاسمؒ نے فرمایا:

> ”امام ابوحنیفہؒ حضرت زید بن علیؒ کے پاس دو سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ نے زید بن علیؒ کی طرف کچھ مال بھیجا تو انھوں نے فرمایا: آپ جس کام میں مشغول ہیں، اس میں اس مال کو استعمال کیجیے۔ حضرت زید بن علیؒ کی جانب سے امام ابوحنیفہؒ کی طرف آنے والے قاصد فضیل بن زبیر تھے۔“(133)

اس دور میں صوفیاؒ کے سردار حضرت داؤد طائیؒ اور حضرت ابراہیم ادھمؒ نے امامِ ابوحنیفہؒ سے روایت کی ہے۔ حضرت امامِ اعظمؒ نے امام محمد نفسِ ذکیہ سے روایت کی ہے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے امام حسن بن محمد بن حنفیہؒ سے بھی تلمذ حاصل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا نظریۂ انقلاب

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے لکھا ہے کہ:

''جب (امامِ اعظم) امام ابوحنیفہؒ کے پاس (امام) ابراہیم (بن میمون) صائغؒ (134) کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپؒ اتنا روئے کہ ہم نے یہ سمجھا کہ یہ عن قریب مر جائیں گے۔ اس کے بعد جب میں ان سے تنہائی میں ملا تو انھوں نے فرمایا کہ: ''اللہ کی قسم یہ بڑے عقل مند انسان تھے اور مجھے ان کے بارے میں اسی بات کا ڈر تھا۔''

میں نے پوچھا کہ: اس کا کیا سبب ہوا؟ تو انھوں نے فرمایا کہ:

''یہ میرے پاس آیا کرتے تھے اور مجھ سے زیادہ سوالات کیا کرتے تھے۔ یہ ایسے شخص تھے کہ اپنی جان کو اللہ کی اطاعت میں بہت زیادہ خرچ کرتے اور بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ (احتیاط وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ) میں جب بھی اس کے سامنے (کھانے کی) کوئی چیز رکھتا تو یہ اس کے بارے میں مجھ سے پوچھے بغیر کھانا پسند نہ کرتے اور نہ ہی اسے چکھتے تھے۔ بسا اوقات مطمئن ہوجاتے تو تھوڑا بہت کھا لیتے تھے۔

انھوں نے مجھ سے ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کے بارے میں بھی بہت زیادہ پوچھا۔ ہم اس بات پر متفق تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک فریضہ ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ:

''آپ اپنا ہاتھ بڑھایئے، تاکہ میں آپ سے بیعتِ (جہاد) کروں۔''

(ان کو شہید کرکے) دنیا نے میرے اور ان کے درمیان اندھیرا پیدا کردیا۔

میں نے پوچھا کہ کیسے؟ تو امامِ اعظمؒ نے فرمایا کہ:

''ابراہیم صائغؒ مجھے اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک حق بات کی دعوت

دی۔ میں نے انھیں روکا اور ان سے کہا کہ:

”اگر اس کام کو ایک اکیلا آدمی لے کر کھڑا ہوگا تو وہ قتل کر دیا جائے گا۔ اس سے لوگوں کا کوئی کام بھی درست نہیں ہوگا، لیکن اگر اس کام کے لیے بہترین صلاحیت والے مددگار اور معاونین موجود ہوں اور ایک ایسا آدمی ان کا سردار ہو، جس پر اللہ کے دین کے سلسلے میں اعتماد کیا جاسکے، تو وہ دشمن کا رُخ موڑ سکتا ہے۔“

امامِ ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ:

”وہ جب بھی میرے پاس آتے، اصرار کرنے والے قرض خواہ کی طرح مجھ سے اس بات کا بڑا تقاضا کرتے رہتے تھے۔

میں ان سے کہتا کہ یہ ایک ایسا کام ہے، جو اکیلے آدمی سے نہیں ہوسکتا۔ انبیا علیہم السلام کو بھی اس وقت تک اس بات کا حکم نہیں دیا گیا، جب تک کہ آسمان (اللہ کی جانب) سے اس کام کا فیصلہ نہیں ہوگیا۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے، جو دیگر فرائض کی طرح نہیں ہے، جنھیں ایک آدمی اکیلا بھی کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے کہ جب بھی کسی اکیلے آدمی نے یہ کام کرنے کی کوشش کی تو اس کا خون بہا دیا گیا۔ گویا اس نے اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کر دیا۔

مجھے ان کے بارے میں یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ خود اپنی جان کو ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔ جب ایسا ایک آدمی قتل ہوجائے تو کسی دوسرے کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ایسا کام کرکے اپنے آپ کو قتل ہونے کے لیے پیش کرے، لیکن وہ اس سلسلے میں انتظار میں رہتے تھے۔ پھر وہ ”مرو“ چلے گئے، جہاں ابومسلم (خراسانی حکمران) تھا۔ تو انھوں نے اس کے ساتھ بڑے سخت انداز میں گفتگو کی۔ اس نے انھیں گرفتار کرلیا۔ اس پر اہل خراسان اور وہاں کے فقہا اور عبادت گزار جمع ہوگئے، حتیٰ کہ انھوں نے انھیں رہا کروالیا۔ دوبارہ انھوں نے اسی انداز میں بات کی، تو اس نے انھیں سخت تنبیہ کی۔

اس کے بعد انھوں نے سہ بارہ وہی بات دہرائی، اور اس سے کہا کہ:

”میں اللہ تعالیٰ کے لیے جتنے کام بھی کرتا ہوں، ان میں سب سے زیادہ افضل کام

تجھ سے جہاد کرنے کو سمجھتا ہوں۔ میں اگرچہ اپنے ہاتھ سے تجھ سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن اللہ نے مجھے دکھا دیا ہے کہ میں ضرور اپنی زبان کے ذریعے سے تمھارے ساتھ جہاد کروں گا اور میں تجھ سے اس سلسلے میں بغض رکھتا ہوں۔''

اس پر اس (ابومسلم خرسانی) نے انھیں قتل کر دیا۔''(135)

حکمرانوں پر صوفیا کی نگرانی اور حق کی دعوت

ملک کا دوسرا عنصر جو ان حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کے آڑے آیا کرتا، وہ صوفیا کا گروہ تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ متوفی ۵۶۱ھ (1078ء تا 1116ء) بغداد میں اپنی خانقاہ میں بیٹھے خلفا (حکمرانوں) کے احکامات پر تنقید کیا کرتے تھے۔ خلفا تھے کہ آپؒ کی ان باتوں کو شیرِ مادر کی طرح پی جاتے۔ چناں چہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

''اے گم شدگانِ راہ! اُس کے طالب بنو جو تم کو آخرت کا راستہ بتائے۔ اللہ برتر تم سب پر بالا ہے۔ اے مردہ دلو! اور اے اسباب کو شریکِ خدا سمجھنے والو! اور اے اپنی طاقت، اپنی قوت، اپنی معاش، اپنے رأس المال (سرمایہ) کے بتوں کو، اور اپنے شہروں اور جن اطراف کی طرف پہنچ رہے ہو، ان کے بادشاہوں کو پوجنے والو! یہ سب اللہ عز و جل سے محجوب ہیں۔ ہر وہ شخص جو نفع اور نقصان کو غیر اللہ کی طرف سے سمجھے، وہ اللہ کا بندہ نہیں ہے۔ وہ اُسی کا بندہ ہے، جس کی طرف سے نفع نقصان سمجھا۔ پس وہ آج غصہ اور حجاب کی آگ میں ہے اور کل کو جہنم کی آگ میں ہوگا۔''(136)

اسی طرح اپنی ایک اَور مجلس میں مزید ارشاد فرماتے ہیں:

''بندے کا قلب جب اپنے پروردگار جل جلالہٗ تک وصول پا لیتا ہے تو حق تعالیٰ اُس کو اپنے ساتھ مشغول بنا کر مخلوق سے (اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے) بے پرواہ کر دیتا ہے۔ اپنا قرب نصیب فرماتا ہے۔ صاحبِ اختیار

اور بادشاہ بنا دیتا ہے۔ اور اس سے ارشاد فرماتا ہے کہ: ''بے شک آج تُو ہمارے نزدیک صاحبِ مرتبہ امانت دار ہے۔''[137] اس کو اپنے ملک میں خلیفہ بنا دیتا ہے۔ جس طرح شاہِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا اور اپنے ملکی معاملات اُن کے حوالے کیے۔ اور اپنے نوکر چاکر، اپنے ملک کا انتظام اور اُس کے وسائل اُن کی سپردگی میں دے کر اپنے خزانوں کا اُن کو امین مقرر کیا۔

اسی طرح جب قلب صحیح ہوجاتا ہے اور اس کی شرافت اور ماسوا اللہ (غیراللہ) سے طہارت حاصل ہوجاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کے قلوب پر قبضہ بخشتا ہے۔ اور وہ اپنی مملکت یعنی دنیا اور آخرت پر اس کو اختیار عطا کردیتا ہے۔ اس کا طریقہ علمِ دین کا سیکھنا اور علمِ ظاہر پر عمل کرنا ہے۔ حق تعالیٰ کی اطاعت سے کسل مند اور بے کار پڑے رہنے کا خوگر مت بن کہ وہ تجھ کو مبتلائے عذاب کردے گی۔''[138]

عربی حکومت کا یہ آخری دور تھا۔ اس سے پہلے جب عربی حکومت میں زیادہ قوت تھی اور اس کے فرماں روا بڑی طاقت اور دولت واقبال کے مالک تھے تو وہ صوفیا اور زُہّاد (زاہدوں) کی صحبت اور نصیحت کو اپنے لیے سعادت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ خطیب بغدادی (1002ء تا 1071ء) نے اپنی کتاب ''تاریخِ بغداد'' میں ہارون الرشید کے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔

☆

مقالہ 16

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا چوتھا دور
غیر عرب سلطنتیں اور حکومتیں

(1288ء تا 1918ء)

www.rahimia.org

اسلام کی اساسی حکمت، بین الاقوامی ہے

''ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے ہم نے اسلام کی اساسی حکمت کو بین الاقوامی قرار دیا ہے اور ہم قرآن عظیم کو انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت کا حامل سمجھتے ہیں، اس وقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو جماعت یا گروہ بھی قرآن کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہو، خواہ وہ عربوں میں سے ہو یا عجم میں سے، وہ سب کے سب ایک ہی درجے پر سمجھے جائیں۔ چناں چہ اسی بنا پر ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجے پر آ جاتے ہیں۔ جس طرح ہم قریش میں کسی خاص خاندان کا امتیاز نہیں مانتے، اسی طرح ہم اسلامی ملت میں عربوں کی انفرادیت کے قائل نہیں۔ ان کی قومی برتری یا شخصی بڑائی کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔

بے شک عرب، اسلام کی اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اسلام کے اُصولوں پر ایک اجتماع کی تشکیل کی۔ اس لحاظ سے وہ تمام انسانی نسلوں کے لیے قیامت تک قرآن کی اجتماعی زندگی کا ایک نمونہ ہیں۔''

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کی چوتھی منزل
غیر عرب سلطنتیں اور حکومتیں

(1288ء تا 1918ء)

www.rahmie.org

غیر عرب قوموں کی اہمیت اور اُن کا دورِ حکومت

سورت ''جمعہ'' میں جہاں اس امر کی صراحت یعنی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''اُمِّیّین'' یعنی عربوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی، جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ سورت ''جمعہ'' کی پوری آیت یہ ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲﴾ وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۳﴾ (139)

(وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے ''امیّین'' میں سے ان کے لیے رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے، نیز اس ذات اقدس نے اس رسول کو ان لوگوں کے لیے بھیجا ہے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے، بے شک وہ ذات بڑی عزت والی اور حکمت

والی ہے۔)

ہمارے نزدیک ''وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ'' کے مصداق اہلِ ایران، اہلِ ہند اور دیگر تمام عجمی قومیں ہیں، جو بعد میں شامل ہوئیں یا آئندہ ہوں گی۔ ''اُمِّيّٖن'' کے لیے رسول اللہ ﷺ کی بعثت' تو اسلام کا قومی منصب تھا۔ ''وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ'' کو ہم قرآن کی بین الاقوامی تعلیم کا حاصل سمجھتے ہیں۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت جیسے عربوں کے لیے تھی، ویسے ہی عجمیوں کے لیے بھی ہے۔ اب وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ '' (یعنی بعد میں آ کر ملنے والے لوگوں) کا زمانہ آتا ہے اور عربوں کے بجائے یہ لوگ اسلام کی بین الاقوامیت کے محافظ اور سرپرست بنتے ہیں۔

بعثتِ محمدیؐ کا بین الاقوامی تقاضا : غیر عرب قومی حکومتیں

اگر اسلام کو صرف عربی اقوام کے لیے معین کر دیا جائے تو غیر عرب مسلمان اقوام نے جو بڑی بڑی سلطنتیں بنائیں، وہ اسلامی اجتماع پر ایک دُنبل (پھوڑا) بن کر رہ جائیں گی۔ لیکن اگر بعثتِ محمدی ﷺ کی دونوں حیثیتیں — یعنی قومی اور عمومی — ملحوظ رہیں تو قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجہ پر آ جائیں گے۔ بے شک عرب اس اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے قرآن کی اجتماعیت کو دنیا میں کامیاب کر کے دکھایا، جو قیامت تک انسانی نسلوں کے لیے قرآن کی اجتماعیت پر عمل کرنے کے لیے نمونے کا کام دیں گے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کی مرکزی حکومت کمزور ہونے سے اسلام ہی ختم ہو گیا۔

چناں چہ کئی سو سال تک اسلامی دنیا کی یہ حالت رہی کہ ہر اسلامی ملک اپنی اپنی جگہ آزاد تھا۔ نظم و نسقِ سلطنت میں وہ کسی دوسری طاقت کو اپنا حاکمِ بالا نہ مانتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بغداد میں اور پھر قاہرہ میں ایک نام کی اسلامی خلافت قائم رہی، جس کے ساتھ دُور سے عقیدت کا اظہار کرنا سلاطین و مُلوک (بادشاہ) کافی سمجھتے تھے۔ یہ اسلامی خلافت حقیقت میں اسلام کے اِس تصور کی یادگار تھی کہ یہ دین قومی نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے۔

اسلامی اجتماع کی قیادت کے ارتقائی مراحل

اب ہوا یہ کہ اسلامی اجتماع کی قیادت پہلے تو عربوں کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد عجم اس کے مالک بنے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:

☆ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ایران فتح ہوا۔

☆ قریش کی اُموی خلافت کے دوران نومسلم ایرانیوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔

☆ عباسی آئے تو اسلامی ایران اُن کے ساتھ مل کر حکومت کا کام سیکھنے لگا۔ اس طرح خلفائے عباسیہ نے ایرانیوں کو حکومت کے لیے تیار کر دیا۔

☆ وہ ''بغداد'' میں تو خلفائے عباسیہ کے وزرا اور ماتحت کی حیثیت سے اسلامی سلطنت میں شریک تھے، لیکن ادھر مشرق میں انھوں نے اپنی مستقل حکومتوں کی بنیاد رکھی۔

☆ جب ''بغداد'' زوال کے نرغے میں آیا تو مشرق میں ''بخارا'' کی حکومت کا زور بڑھ گیا۔

☆ ''بخارا'' کی حکومت کمزور پڑ گئی تو ''غزنی'' کا ستارہ چمکا۔

☆ ''غزنی'' سے ایرانی مسلمانوں کا مرکز ''لاہور'' میں منتقل ہوا۔

☆ لاہور آگے چل کر ''دہلی'' کے مرکز کا پیش خیمہ بنا۔

تاریخی مراحل اور ادوار متعین کرنے کے اُصول

انسانی تاریخ میں جب بھی کوئی مثبت تبدیلی اور انقلاب پیدا ہو یا کوئی منفی تغیر و تبدل آئے اور اس کے اثرات خاصے عرصے تک انسانی سوسائٹی پر مرتب ہوں تو وہ تاریخ کا ایک دور یا مرحلہ قرار پائے گا۔ عام طور پر تاریخ کے مختلف ادوار کا آغاز اور اختتام درجِ ذیل انھی دو تاریخی واقعات سے ہوتا ہے:

1۔ کسی ایسے عمومی انقلاب سے کہ جو سماج کی خراب حالت کو اچھی حالت میں بدل دے۔ نیز عام لوگوں کے ذہن و فکر میں عمومی طور پر مثبت تبدیلی پیدا ہو جائے۔

2۔ دوسرے کسی ایسے رجعت پسند فتنہ پروری سے کہ جس نے سوسائٹی کے ارتقائی نظام میں فتنہ وفساد برپا کردیا ہو۔ (140)

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرن (دور) کی تعریف اس طرح کی ہے:

''قرن درلغت: قوم ''متقارنین فی السّنّ'' بعدازاں قومے کہ در ریاست وخلافت مقترن باشند، گفتہ شد۔ چوں خلیفۂ دیگر باشد، و وزرا حضورِ دیگر، وامرائے دیگر، ورؤسا جیوشِ دیگر، وسپاہیانِ دیگر، وحربیانِ دیگر، وذمیانِ دیگر، تفاوت قرون باہم مے رسد۔''(141)

(''قرن'' لغت میں ایسی قوم پر بولا جاتا ہے، جو تاریخی سن کے حساب سے ہم عصر ہوں۔ اس کے بعد یہ لفظ ایسی قوم کے لیے استعمال کیا جانے لگا، جو خلافت اور ریاست میں ایک ہی زمانے میں اکٹھے ہوں۔ چناں چہ جب:

الف: کوئی دوسرا حکمران آجائے

ب: نئے لوگ اُس کے وزرا بن جائیں

ج: عوام، فوج کے سپاہی اور سپہ سالارانِ لشکر تبدیل ہوجائیں

د: دشمن اور زیرِ نگیں افراد بھی بدل جائیں

تو ایسی صورت میں ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہوجاتا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی کسی اہم واقعے کے نتیجے میں سماجی زندگی میں مندرجہ بالا تغیرات پیدا ہوجائیں تو اس سے ایک نئے دور کا آغاز اور اُس کا اختتام متعین ہوتا ہے۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی سماج میں ہونے والے تغیرات و تبدلات کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی روشنی میں ہندوستان کی تاریخ کے ادوار اور مراحل کا تعین کیا جائے تو ہندوستان کی چودہ سو سالہ مسلم تاریخ کو درجِ ذیل بارہ ادوار اور پانچ اطوار ومراحل پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

www.rahimia.org

برصغیر کی تاریخ کے پانچ مراحل

ہندوستان کی تاریخ میں اسلامی خلافت کے انقلاب سے لے کر ہندوستانیوں کی مستقل حکومت کے قیام تک درجِ ذیل پانچ مراحل (اَطوار) ہیں:

پہلا مرحلہ: ہندوستان کے کچھ علاقوں کا خلافتِ اسلامیہ عربیہ میں شامل ہونا۔

دوسرا مرحلہ: خلافتِ عربیہ (بنوعباس) میں غیرعرب اقوام کی ہندوستان پر حکومت۔

تیسرا مرحلہ: خلافتِ عربیہ کے زمانے میں ہندوستانی اقوام کی ہندوستان پر حکومت۔

چوتھا مرحلہ: ہندوستان میں مستقل ہندوستانی حکومت کا قیام۔

پانچواں مرحلہ: ہندوستانی ملتوں (مسلمانوں، مرہٹوں، انگریزوں) کا اُبھار۔

ان مراحل کے مطابق تاریخی ادوار کی تقسیم کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

پہلا مرحلہ؛ خلافتِ اسلامیہ عربیہ میں کچھ ہندی علاقوں کی شمولیت

اس تاریخی مرحلے میں دو ادوار ہیں:

1۔ پہلا دور (کابل میں اسلام کی آمد)

پہلے دور کا آغاز کابل کی فتح (۳۱ھ) سے ہوتا ہے۔ یہ (اسلام کی آمد کے حوالے سے) ہندوستان کے شہروں میں سے پہلا شہر ہے۔ یہ دور ۳۱ھ (652ء) تا ۳۵ھ (مئی 656ء) حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کا دور۔ اس طرح ہندوستان میں ''خیرالقرون'' یعنی بہترین زمانے کا عرصہ چار سال تک رہا۔

2۔ دوسرا دور (سندھ میں اسلام کی آمد)

ولید بن عبدالملک (اُموی) کے زمانۂ خلافت میں امیرمحمد بن قاسم ثقفیؒ سے شروع ہوکر قریش کے بارہ خلفا میں سے آخری خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے آخری زمانۂ خلافت، یعنی ۹۲ھ (711ء) سے ۱۹۳ھ (809ء) تک کا زمانہ دوسرا دور ہے۔

www.rahimia.org

دوسرا مرحلہ: خلافتِ عربیہ میں ہندی علاقوں پر غیر عربی اقوام کی حکومت

اس مرحلے میں تیسرا دور ہے:

3۔ تیسرا دور (غیر عربی اقوام کی ہندوستان پر حکومت)

مامون (الرشید عباسی) کے زمانۂ خلافت سے لے کر سلطان محمود غزنوی کی جدوجہد سے لاہور میں اسلامی حکومت قائم ہونے تک کا زمانہ، یعنی ۱۹۳ھ (809ء) تا ۴۱۲ھ (1021ء) تیسرا دور ہے۔

تیسرا مرحلہ: خلافتِ عربیہ کے ماتحت ہندوستانی اقوام کی حکومت

اس تاریخی مرحلے میں دو ادوار ہیں:

4۔ چوتھا دور (خلافتِ عربیہ کے ماتحت ہندوستانی اقوام کی سلطنت)

سلطان محمود غزنوی کے زمانے (یعنی لاہور میں حکومت کے قیام) سے لے کر سلطان خسرو شاہ بن بہرام شاہ غزنوی کے زمانے میں ''سلطنت'' (لاہور) کی بنیاد قائم ہونے تک کا زمانہ، یعنی ۴۱۲ھ (1021ء) تا ۵۴۷ھ (1152ء) چوتھا دور ہے۔

5۔ پانچواں دور (خلافت کے ماتحت سلطنت اسلامیہ)

لاہور میں سلطنت قائم ہونے سے لے کر سلطان فیروز شاہ (تغلق) دہلوی کے زمانے میں ''سلطنتِ اسلامیہ'' کی تکمیل تک یعنی ۵۴۷ھ (1152ء) تا ۷۹۰ھ (ستمبر 1388ء) پانچواں دور ہے۔

چوتھا مرحلہ: ہندوستان میں مستقل ہندوستانی سلطنت کا قیام

اس مرحلے میں چار ادوار ہیں:

6۔ چھٹا دور (خودمختار ہندوستانی سلطنت کا آغاز)

سلطان فیروز شاہ (تغلق) کی سلطنت میں فتنے اور انتشار کے آخری زمانے سے لے کر سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں ''وطنیت'' کی بنیاد پر سلطنت قائم ہونے تک کا

زمانہ، یعنی ۷۹۰ھ (ستمبر 1388ء) تا ۸۵۵ھ (نومبر 1451ء) چھٹا دور ہے۔

7۔ ساتواں دور (خود مختار وطنی سلطنت اور حکومت)

سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں ''وطنی سلطنت'' قائم ہونے سے لے کر (مغل بادشاہ) سلطان جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں ''وطنی سلطنت'' کی تکمیل تک کا زمانہ، یعنی ۸۵۵ھ (نومبر 1451ء) تا ۹۸۷ھ (1579ء) ساتواں دور ہے۔

8۔ آٹھواں دور (ہندوستان کی وطنی سلطنت کا دورِ عروج)

سلطان جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں وطنی انتہا پسندی کے عروج سے لے کر سلطان نور الدین جہاں گیر کے آخری زمانے میں وطنیت میں اعتدال آنے تک کا زمانہ، یعنی ۹۸۷ھ (1579ء) تا ۱۰۳۶ھ (1627ء) آٹھواں دور ہے۔

9۔ نوواں دور (قومی سلطنت میں دین اسلام کی تجدید و تکمیل)

صاحبقرانِ ثانی سلطان شہاب الدین شاہ جہاں کے زمانے میں دین اسلام کی تجدید اور سلطان محی الدین عالم گیر کے زمانے میں اُس تجدید کی تکمیل کا دور یعنی ۱۰۳۶ھ (1627ء) سے لے کر ۱۱۱۸ھ (1707ء) تک کا زمانہ نواں دور ہے۔ یہ دور ہندوستان میں اسلام کے تمام ادوار میں سب سے بہترین اور مثالی دور ہے۔

پانچواں مرحلہ؛ ہندوستان میں مسلمان، مرہٹہ اور انگریز ملتیں

اس مرحلے میں تین دور ہیں:

10۔ دسواں دور (مرہٹوں اور مسلمانوں کی کشمکش)

سلطان محی الدین عالم گیر کے آخری زمانے سے لے کر سلطان عالم گیر ثانی کے آخری زمانے میں پانی پت کے میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی ہندو مرہٹہ جماعت پر فتح تک کا زمانہ، یعنی ۱۱۱۸ھ (1707ء) تا ۱۱۷۴ھ (1761ء) دسواں دور ہے۔

11۔ گیارھواں دور (انگریزوں اور مسلمانوں کی کشمکش)

پانی پت کی جنگ سے لے کر ہندوستانیوں کی انگریز سامراج کے خلاف جنگ اور خاتم السلاطین سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے آخری زمانے میں ہندوستان کی سلطنت کے مرکز دہلی پر انگریزوں کے تسلط تک کا زمانہ، یعنی ۱۱۷۴ھ (1761ء) تا ۱۲۷۴ھ (1857ء) گیارھواں دور ہے۔

12۔ بارھواں دور (انگریز سامراج کی غلامی کا دور)

دہلی پر انگریزوں کے غلبے سے لے کر خلافتِ عثمانیہ کے ختم ہونے تک کا زمانہ، یعنی ۱۲۷۴ھ (1857ء) تا ۱۳۴۰ھ (1922ء) بارھواں دور ہے۔

ان تاریخی ادوار کے اہم نکات

تجدیدِ دین کی تحریک کے پہلے تین ادوار سے متعلق چند نکات مقالات نمبر 13 تا 15 میں ذکر ہو چکے ہیں۔ یہاں مناسب ہوگا کہ گیارھویں صدی کے بعد کے برصغیر میں اسلامی اجتماع کے تاریخی ادوار کے اہم نکات ذکر کیے جائیں۔

چوتھے دور (۴۱۲ھ/ 1021ء تا ۵۴۷ھ/ 1152ء) کے اہم نکات

اگر تم چاہو تو اس دور کا آغاز اُس سَنّ سے کر سکتے ہو، جب امیر ناصرالدین سبکتگین نے ۳۶۶ھ (976ء) میں ہندوستان پر اپنی افواج بھیجیں، لیکن ہندوستان پر اُن کی حکومت کی حفاظت اُسی وقت ہوئی، جب یمین الدولہ سلطان محمود غزنویؒ اَنارَ اللّٰہُ بُرھانَہٗ (اللہ تعالیٰ اُن کی عظمت کو روشن رکھے) ۳۸۷ھ (997ء) میں تختِ سلطنت پر بیٹھے۔ یوں ان کی جدوجہد سے ۴۱۲ھ (1021ء) میں ہندوستانی حکومت لاہور میں قائم ہوئی۔ اس لیے ہم نے اس دور کا آغاز اسی سن سے کیا ہے، تاکہ سلطان محمود غزنویؒ کی جدوجہد اور ان کی کوشش کا تذکرہ اس دور کے شروع میں آجائے۔

ہندوستان کی فتح میں صوفیائے کرامؒ کی کاوشیں

مسلمانوں کے لیے ہندوستان کے فتح ہونے میں بڑی تاخیر کی وَجہ یہ ہے کہ عام طور پر ہندوستان کے لوگ فلاسفہ کے ایک مکتبِ فکر کی اتباع کرتے تھے۔ چناں چہ اُن میں فلاسفہ کے افکار اتنے راسخ ہو چکے تھے کہ اس فلسفے (ویدانت) کی روح گویا اُن کے گوشت اور خون میں پیوست ہو چکی تھی۔

جب مسلمانوں میں اِشراقی (روشن ضمیر) صوفی پیدا ہوئے تو ان لوگوں نے ہندوستانی لوگوں کی ذہنیت کا صحیح اندازا لگایا۔ اُنھوں نے ہندوستان کے شہروں کی جانب ظاہری اور مخفی طور پر بہت سی جماعتیں بھیجیں۔ انھوں نے ہندوستان کے جوگیوں کا اس حوالے سے مقابلہ کیا۔ اس طرح ہندوستانی شہروں کی فتوحات میں مسلمانوں کو اپنے غزوات میں کامیابی حاصل ہوئی۔

یہی وَجہ ہے کہ طریقت کے سلسلے کے بڑے بڑے مشائخ غزوۂ ہند کے اس جہاد میں شریک رہے ہیں۔ اس لیے کہ خفیہ جماعتوں کے کام ان مشائخ کے بغیر منظّم انداز میں آگے نہیں بڑھتے تھے۔ چناں چہ شیخ محمد بن ابو احمد چشتیؒ سومنات کے غزوے میں شریک رہے ہیں۔ وہ چشتیہ طریقے کے امام تھے۔ ان کا انتقال ۴۱۱ھ (1020ء) میں ہوا۔ اسی طرح سلطان محمود غزنویؒ کے جہاد میں امام ابوالحسن خرقانیؒ کی جدوجہد اور کوشش بھی شامل ہے۔

اس دور میں اللہ کی ''محبتِ ذاتیہ'' کا استنباط کرنے والے اہم صوفیا

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حجّة اللّٰہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ انسان کی روح میں ایک ''نورانی لطیفہ'' ہے، جو طبعی طور پر اللہ عز وجل کی جانب ایسا میلان اور جھکاؤ رکھتا ہے، جیسا کہ لوہا مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے، جو وجدانی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ پس ہر وہ آدمی، جو انسانی نفس کے لطائف میں گہرائی سے غور و فکر کرے اور ہر

ایک لطیفے کے تمام تقاضوں کو سمجھ لے تو لازمی طور پر وہ اس نورانی لطیفے کو پا لے گا۔ وہ طبعی طور پر اس لطیفۂ نورانی کا میلان اللہ کی طرف محسوس کرے گا۔

اہل وجدان کے نزدیک اللہ کی طرف اس نقطۂ نورانی کے میلان کو ''محبتِ ذاتیہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسا کہ دیگر تمام وجدانی چیزوں کی ہوتی ہے کہ جنھیں عقلی دلائل سے نہیں سمجھا جا سکتا، جیسے بھوکے آدمی کی بھوک اور پیاسے کی پیاس کو عقلی دلائل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔''(142)

میرا کہنا ہے کہ اس نورانی لطیفے میں جب مکمل طور پر ایسا استغراق ہو جائے کہ انسان اس حالت میں کسی دوسری چیز کا قطعی کوئی شعور نہ رکھتا ہو، یہاں تک کہ اس شعور کا علم بھی اُسے نہ رہے، تو اسی کا نام ''فنا فی اللّٰہ'' اور ''بقا باللّٰہ'' ہے۔ اس دور کے ائمہ اس بلند مرتبت معرفت کو مستنبط کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی کو انھوں نے صوفیا کے تمام طریقوں کا مرکز اور محور بنا لیا۔

اس دور کے نمایاں صوفیا میں امام ابوحامد محمد بن محمد غزالیؒ، شیخ الاسلام عبداللہ بن محمد انصاریؒ، امام ابوالقاسم قُشیریؒ، امام علی بن عثمان ہجویری لاہوریؒ، امام محمد بن ابواحمد چشتیؒ، امام ابوالقاسم جرجانیؒ، سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کے متبعین میں امام ابوالحسن خرقانیؒ اور امام ابوطالب مکیؒ مصنف ''قوُت القلوب'' شامل ہیں۔ کتاب ''قوُت القلوب'' کے بارے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''کتاب ''قُوتُ القلوب'' کے بارے میں علما کا کہنا ہے کہ دین اسلام میں اس جیسی کوئی کتاب اہلِ تصوف کے سلسلۂ طریقت کی باریکیوں کے بیان کرنے میں اور کوئی نہیں لکھی گئی۔ اور تصوف و سلوک پر جتنی بھی دیگر کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب اسی سے ماخوذ ہیں، جیسے ''احیاء (علوم دین)''، ''غنیة الطالبین'' اور ''عوارف (المعارف)'' وغیرہ ہیں۔''(143)

پانچویں دور (۵۴۲ھ-۷۹۰ھ/ 1147ء-1388ء) کے اہم نکات

سلطان خسرو شاہ [144] غزنی سے آیا اور اس نے ۵۴۲ھ (1147ء) [145] میں (عباسی خلیفہ ابوعبداللہ محمد) مقتفی لِأمر اللّٰہ (بن مستنظہر باللہ) کے زمانۂ خلافت (۱۲/ ذوالحجہ ۵۳۰ھ/ ستمبر 1136ء تا ۲/ ربیع الاوّل ۵۵۵ھ مارچ 1160ء) میں لاہور کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنایا۔

(سلطان خسرو شاہ بن بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن سلطان مودود بن سلطان محمود غزنوی نے اپنے والد سلطان بہرام شاہ کی وفات کے بعد حالات کی خرابی کے باعث غزنی چھوڑ کر لاہور آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے زمانے میں غزنوی سلطنت، غزنی سے لاہور منتقل ہوگئی۔ اس حوالے سے منشی ذکاء اللہ ''تاریخ ہندوستان'' میں لکھتے ہیں:

> ''سلطان بہرام شاہ نے جب وفات پائی تو بہ اتفاقِ امر خسرو شاہ تختِ (سلطنت) پر بیٹھا، لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ غزنی میں علاؤالدین غوری آن پہنچا ہے، تو وہ مع اہل و عیال کے ہندوستان کو روانہ ہوا اور لاہور میں اقامت (اختیار) کی۔ یہاں ہندوؤں نے اس کی نہایت تعظیم و تکریم کی۔ ان سب کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کے شہر میں ایک سلطنت قائم ہوگئی۔ اس طرح غزنی کی سلطنت ہندوستان میں منتقل ہوگئی۔'') [146]

سلطان خسرو شاہ کے بعد اس کے بیٹے سلطان خسرو ملک نے لاہور پر تقریباً 27 سال (۵۵۵ھ/ 1160ء تا ۵۸۲ھ/ 1186ء) حکومت کی۔ اس کے زمانے میں سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۲ھ/ 1186ء میں لاہور فتح کرلیا۔ اس طرح لاہور سے غزنوی حکومت اور سلطنت ختم ہوگئی۔ اس پر غوری حکومت کا ایک وزیر حاکم بن گیا۔ یوں لاہور پر غوری حکومت کا آغاز ہوا۔

سلطان شہاب الدین غوریؒ کی جدوجہد اور کوشش سے ۵۸۹ھ (1193ء) میں دہلی فتح ہوا۔ پھر ۶۰۲ھ (1205ء) میں (عباسی خلیفہ) ناصر لِدین اللّٰہ کے زمانۂ خلافت

(ذوقعدہ ۵۷۵ھ/ 1180 تا آخر ماہِ رمضان ۶۲۲ھ/ 1225ء) میں سلطان قطب الدین (ایبک) دہلوی کی کوششوں سے ہندوستان میں مستقل حکومت کی بنیاد پڑی۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ:

''(سلطان شہاب الدین غوری کی شعبان ۶۰۲ھ/ 1206ء میں شہادت کے بعد) سلطان محمود بن غیاث الدین غوری نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی قطب الدین (ایبک) کو ''مَلِک'' سے ''سُلطان'' بنا دیا اور آزادی اور خودمختاری کے فرمان کے ساتھ چتر اور بادشاہی کے دیگر لوازمات بھی اس کے لیے ہندوستان بھجوا دیے۔ قطب الدین اس فرمان اور خلعت کا استقبال کرنے کے لیے (دہلی سے) لاہور تک آیا۔ اور اپنے آقا کی طرف سے اپنی وفاداری کی یہ قدر و منزلت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ خلعت لے کر قطب الدین (ایبک) نے ۱۸/ ذوالقعدہ ۶۰۲ھ/ جون 1206ء کو لاہور میں اپنی تخت نشینی کی رسومات ادا کیں اور اپنی خودمختاری اور سلطان محمود بن غیاث الدین کے فرمان کا اعلانِ عام کر کے لاہور سے دہلی واپس آ گیا۔''(147)

ہندوستان کے سلاطین میں سے سلطان غیاث الدین بلبن، (سلطان) ناصر الدین محمود، (سلطان) شمس الدین اَلتمش، (سلطان) علاؤالدین اسکندر اور سلطان ابوالمجاہد محمد عادل، دنیا کے بڑے سلاطین میں سے گزرے ہیں۔ ان سلاطین کی وَجہ سے دہلی میں علم و صلاح (نیکی) کے حامل اتنے لوگ جمع ہو گئے کہ جن کی مثال مسلمان ممالک میں کہیں اور نہیں ملتی۔

اس (پانچویں) دور (۵۴۲ھ/ 1147ء تا ۷۹۰ھ/1388ء) میں ہندوستان کی حکومت و سلطنت، خلافتِ اسلامیہ کے بعض حقوق کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے تمام اداروں میں ایک مستقل حکومت تھی۔ یہاں تک کہ ۸۰۱ھ (دسمبر 1398ء) میں امیر تیمور (گورگان) دہلی پہنچا۔ اس (تیموری انقلاب) نے ہندوستانیوں سے (خلافتِ اسلامیہ

سے وابستگی کے رہے سہے) اس فکر اور تصور کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد ہندوستانی حکمرانوں نے قومی اور وطنی سیاست کے اصولوں سے اپنی وابستگی کا آغاز کیا۔

پانچویں دور کا اختتام سلطان فیروز شاہ تغلق کی تاریخ وفات یعنی ۳ر رمضان ۷۹۰ھ / 23ر اکتوبر 1388ء[148] پر ہو جاتا ہے۔

چھٹے دور (۷۹۰ھ تا ۸۵۵ھ/ستمبر 1388ء تا نومبر 1451ء) کے اہم نکات

چھٹے دور سے پہلے ہندوستان کی سلطنت، خلافتِ (اسلامیہ) کے کچھ حقوق کا اعتراف کرتی تھی اور اس سے اظہارِ لاتعلقی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ایک اظہار یہ تھا کہ سلطان محمد شاہ تغلق نے ۷۴۴ھ/ 1343ء میں مصر میں خلیفہ عباسی کی غائبانہ بیعت کا اعلان کیا اور سِکّے میں اپنے نام کے بجائے خلیفہ کا نام کندہ کرایا۔ اپنا ایلچی بھیج کر خلافت کا منشورِ حکمت اور خلعتِ خلافت منگوایا۔ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ خطبے میں سے اُن تمام بادشاہوں کا نام نکلوا دیا، جنھوں نے خلیفہ کے حکم کے بغیر ہندوستان میں سلطنت کی تھی، یہاں تک کہ اپنے باپ کا نام بھی نکلوا دیا۔[149]

امیر تیمور کے انقلاب کے بعد معاملہ بدل گیا۔ (سمرقند میں) امیر تیمور کی حکومت کی ابتدا ۷۶۸ھ (1367ء) میں ہوئی۔ اس نے ۸۰۷ھ/1405ء میں وفات پائی۔

۸۰۱ھ (1399ء) میں امیر تیمور کے دہلی سے واپس چلے جانے کے بعد ہندوستان کے لوگ صرف اسی کے خاندان کی طرف ہی دیکھتے رہے۔ اسی لیے علم کی ریاست و حکمرانی بھی امیر تیمور کے صدر الصدور علامہ سعدالدین تفتازانیؒ اور امیر تیمور کے منظورِ نظر علامہ سیّد شریف علی جرجانی (خلیفہ خواجہ علاؤالدین عطار خلیفہ خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہٗ) میں منحصر ہو کر رہ گئی۔

اس دور میں اگر ائمہ فقہا اور صوفیا —— مثلاً امام بہاؤالدین نقشبند بخاریؒ اور ان کے ہم عصر لوگ —— اسلامی اجتماع کو زندہ کرنے میں جدوجہد اور کوشش نہ کرتے تو بہت تھوڑے عرصے میں عام ہندوستانی مسلمان اور صابی (ہندو) ایک ہی ملت بن کر رہ جاتے۔

ساتویں دور (۸۵۵ھ تا ۹۸۲ھ/ 1451ء تا 1575ء) کے اہم نکات

ساتویں دور میں:

1۔ ہندوستانی بادشاہوں کی کوشش سے مستقل ہندوستانی سلطنت کی بنیاد پڑی۔

2۔ اس دور میں ایسی ہندوستانی زبان (اُردو) رائج ہوئی، جو کہ مسلمانوں اور صابئین (ہندو) کے درمیان مشترک تھی۔

3۔ بادشاہوں کے ابھارنے سے ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھنی شروع کی اور پھر حکومتی معاملات میں داخل ہونے لگے۔ [150]

4۔ ان میں بہت ذہین اور نابغۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنھوں نے ائمہ صوفیا کی مدد اور تعاون سے اپنے دھرم کی اصلاح کرنا شروع کر دی۔ انھوں نے توحید کی دعوت دی اور رسوم کی اصلاح کی۔ اس طرح عام لوگوں میں اسلامی روح پھیلا دی۔

5۔ ہندوؤں میں سے سکھ سلسلے کے بانی بابا (گرو) نانک پنجابی [151] ان میں سے ایک ہیں۔ ہمارے شیخ، شیخ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بابا نانک کو مسلمان قرار دیتے ہیں۔

(حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی سوانح "تذکرۃ الرّشید" میں "ارشادات" کے ضمن میں حضرت گنگوہیؒ کا ایک ارشاد بیان کیا گیا ہے:

"ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ: "شاہ نانک، جن کو سکھ لوگ بہت مانتے ہیں، حضرت بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سے ہیں۔ چوں کہ اہلِ جذب سے تھے، اس وَجہ سے اُن کی حالت مشتبہ ہوگئی۔ مسلمانوں نے کچھ ان کی طرف توجہ نہ کی۔ سکھ اور دوسری قومیں (اُن کے) کشف و کرامات دیکھ کر اُن کو ماننے لگیں۔"") [152]

آٹھویں دور (۹۸۷ھ تا ۱۰۳۶ھ/ 1579ء تا 1627ء) کے اہم نکات

آٹھویں دور کے ابتدائی عرصے ۹۸۷ھ (1579ء) میں سلطان جلال الدین (محمد) اکبر — جس نے تیموری خاندان میں سب سے پہلے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا — کے عہد میں ہندوستانی حکومت کو اسلامی شریعت سے علاحدہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اکبر کا والد سلطان نصیرالدین ہمایوں اپنی حکومت کے لیے مدد حاصل کرنے کے لیے ایران چلا گیا تھا۔ اس وَجہ سے وہ صفوی حکومت کے جال میں پھنس گیا۔ سلطان جلال الدین (محمد اکبر اس تحریک کے ذریعے) صفوی حکمرانوں کے پھندے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نیز وہ اس بات کا بھی خواہش مند تھا کہ اُن جمود کے حامل فقہا کے تسلط سے بھی چھٹکارا حاصل کرلے، جو ہندوستان کے گزشتہ بادشاہوں کی یادگار تھے۔ اس لیے کہ وہ سلطان کے خاندان کی حکومت کے قیام میں ایک دیوار کی طرح رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اسی پس منظر میں اس (اکبراعظم) نے شیخ مبارک بن خضر سندھیؒ اور امیر فتح اللہ شیرازیؒ کو اکبر آباد (آگرہ) میں جمع کیا۔ یہ دونوں حضرات ایسے ہم عصر تھے کہ جنھوں نے علامہ جلال الدین دوّانیؒ اور علامہ صدرالدین شیرازیؒ کے شاگردوں سے حکمتِ عملی اور حکمتِ نظری (فلسفے) کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ مبارکؒ کی اولاد میں سے شیخ ابوالفیضؒ اور ابوالفضلؒ ان دونوں کے نقشِ قدم پر چلے۔

ان لوگوں نے وطنی حکومت کے ایسے پروگرام کی بنیاد رکھی، جس کی نظر میں تمام مذاہب یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ بہت سی سیاسی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے صابی ہندوؤں میں سے ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ (حکومت میں) داخل کرلیا، جو ان کے ساتھ اشتراک کرنا پسند کرتے تھے۔ یہ لوگ ''مصالح مرسلہ'' (عمومی فائدے کی سماجی مصلحتوں) کو سامنے رکھ کر کام کرنا پسند کرتے تھے۔ انھوں نے اہلِ سنت کے فقہا کی مقرر کردہ شریعتوں کا پابند رہنا گوارا نہیں کیا۔ اس طرح انھوں نے ایسا عمومی دین گھڑ لیا تھا، جس میں ''دینِ الٰہی'' کے نام سے ''دینِ حنیفیت'' اور ''دینِ صابیت'' (ویدک دَھرم) کو

ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ اِسے ہندوستان کی وطنی حکومت کا سرکاری مذہب قرار دے دیا تھا۔

یہ لوگ حکومتی امور کی ذمہ داریوں کے لیے صرف انھی لوگوں کو آگے بڑھاتے تھے، جو ان کے اس پروگرام سے اتفاق رکھتے تھے۔ البتہ عام عمالِ حکومت کو مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ ''دینِ الٰہی'' کو قبول کریں۔ تاہم سلطان کے ''دیوانِ عالی'' (مرکزی دفتر) کی رُکنیت صرف انھیں لوگوں کو دی جاتی تھی، جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں سے ''دینِ الٰہی'' کو قبول کرتے تھے۔

ایسے حالات میں امام مجدد شیخ احمد سہرندیؒ اور ان کے پیروکار اس نئے جاری کردہ پروگرام کی بدعت کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح سلطان جہانگیرؒ کے عہد میں امورِ حکومت میں اعتدال پیدا ہوگیا۔ جہانگیر کے دور میں اربابِ حکومت ''دینِ الٰہی'' کی مدد نہیں کرتے تھے۔ اہلِ سنت کے مقابلے پر شیعہ جماعت کی مدد کرنے لگے۔ مجددی حضرات کی کامیابیوں کی ابتدا سلطان شہاب الدین شاہ جہاںؒ کے دور میں ہوئی اور دینِ الٰہی کے اس پروگرام کا مکمل خاتمہ سلطان محی الدین عالم گیرؒ کے عہد میں ہوا، لیکن اس کے بعد (حکومت کے اُمرا میں) آپس کی لڑائیاں اور جھگڑے شروع ہوگئے، جنھوں نے (مغلیہ) سلطنت کو زوال تک پہنچا دیا۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۝۳۸[153] (اللہ کا مقرر کیا ہوا امر پورا ہو کر رہتا ہے)

نوویں دور (۱۰۳۶ھ/ 1627ء تا ۱۱۱۸ھ/ 1707ء) کے اہم نکات

ہندوستان میں بسنے والے لوگوں کی تاریخ میں یہ زمانہ (۱۰۳۶ھ/ 1627ء تا ۱۱۱۸ھ/ 1707ء) اسلام کے ادوار میں سب سے بہترین دور ہے۔ سلطان شہاب الدین محمد شاہ جہاں ''صاحبقرانِ ثانی'' نے تختِ سلطنت پر بیٹھتے ہی پہلے سال لوگوں کو بادشاہوں کے سامنے سجدۂ تعظیم کرنے سے منع کر دیا تھا۔ منشی ذکاء اللہ نے لکھا ہے:

''شاہ جہاں بارہویں روز ۸/ شہر (ماہ) جمادیٰ الثانی ۱۰۳۷ھ مطابق 6/ فروری 1668ء کو گھوڑے پر سوار ہو کر دولت خانۂ ارک دار الخلافہ اکبر آباد میں

آیا اور ساڑھے تین گھڑی بعد سر پر تاج اور تخت پر قدم رکھا۔ اربابِ سیف و قلم اور اعیانِ دولت و حشم نے مبارک باد دی۔...

جب شاہ جہاں نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا، تو اُس کو مراسم ملتِ مصطفویؐ و شریعتِ محمدیؐ کا — جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا — ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اوّل اُس نے یہ حکم دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا معبودِ حقیقی سزاوار ہے۔ اب آئندہ کوئی دوسرے کے لیے اپنی پیشانی کو خاکِ مذلت پر نہ رکھے۔ یعنی اکبری عہد میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا، وہ موقوف کیا۔ ...اور یہ مقرر کیا کہ جس وقت بادشاہ سے ملاقات ہو، تو **السّلام علیکم** کہا کریں۔ اور جب رخصت ہو تو فاتحہ پڑھیں۔'' (154)

یہ امامِ ربانی شیخ احمد سہرندیؒ کے تجدیدی کام کے اثر کو قبول کرنے کی سب سے بڑی ظاہری دلیل ہے۔ اس کے بعد سلطان شاہ جہاںؒ ہمیشہ شریعتِ اسلام رائج کرنے اور جو کچھ پہلے فساد ہو چکا تھا، اس کی اصلاح کرنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ اُن کے بعد ان کے بیٹے امام مجدد سلطان محی الدین محمد عالم گیرؒ آئے۔ انھوں نے اس تجدیدی کام کی تکمیل کی۔ اس طرح انھوں نے اپنی سلطنت کو — جو ہندوستان کے تمام علاقوں پر مشتمل تھی — علمی اور عملی حوالے سے دینی بنا دیا۔

علامہ (غلام علی بلگرامی) آزادؒ ''**مآثر الکرام**'' میں لکھتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اسلام کی بنیاد میں کمزوری اور کوتاہی نے راستہ پیدا کرلیا تھا۔ صاحبقرانِ ثانی (سلطان شاہ جہانؒ) نے ازسرِنو قوانینِ شریعت کی بنیاد رکھی اور سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ نے اُسے مکمل کیا۔ اِن دونوں بادشاہوں — حق تعالیٰ انھیں اپنی پناہ میں رکھے — نے اسلامیانِ ہند پر اپنا ایک بہت بڑا حق ثابت کردیا ہے۔'' (155)

حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے تجدیدی کام کی اہمیت

ہم نے اس دور (۱۰۳۶ھ تا ۱۱۱۸ھ) کے ائمہ میں سے امامِ ربانی (شیخ احمد سرہندیؒ) کو ایک امام مانا ہے۔ اگرچہ ان کی وفات (اس دور کے شروع ہونے سے) دو سال پہلے ۱۰۳۴ھ (1624ء) میں ہوگئی تھی۔ اس لیے کہ اگر اس دور میں دینی تجدید کے امام کے طور پر ان کا تذکرہ نہ کیا جائے تو اس دور کے تجدیدی کام کی رونق ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اگر ہم ان کا تذکرہ آنے والے باب (اگلے دور) میں کریں تو اُن کی اولاد اور ان کے متبعین کا سلسلۂ اسانید اچھے طریقے پر منظّم انداز میں مرتب نہیں ہوسکتا۔

امام ولی اللہ دہلویؒ نے امامِ ربانی (شیخ احمد سہرندیؒ) کے بارے میں کہا ہے کہ:

''ان سے مؤمن کے علاوہ اور کوئی محبت نہیں رکھتا۔ اور ان سے سوائے منافق کے کوئی بغض نہیں رکھتا۔''(156)

امامِ ربانی (مجدد الف ثانیؒ) سے محبت رکھنا' دین و اخلاص کے شعائر میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن لوگوں میں سے بنائے، جو حق کی اتباع کرتے اور اولیاء اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ باطل سے دور بھاگتے اور اللہ کے دشمنوں سے بغض و عداوت رکھتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہمیں اُن لوگوں میں شامل ہونے سے بچائے رکھے، جن کی مذمت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں کی ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ (157)

(اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی، تو اس کو مشہور کردیتے ہیں۔)

ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اُن لوگوں میں سے بنائے، جن کے بارے میں اللہ نے کہا ہے:

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ (158) (اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے

حاکموں تک تو تحقیق کرتے اس بات کی، جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں۔)

اس آیت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے، جو ممکن حد تک معاملات کی صحیح تحقیق کرتے اور درست استنباط و اجتہاد کرتے ہیں۔ انھیں جہاں مشکل پیش آتی ہے تو وہ (معاملات اور علوم کو صحیح طور پر سمجھنے والے) مجتہدین کے استنباط و اجتہاد اور فہم و بصیرت پر اعتماد کرتے ہیں۔

اب اگر اسلام کو محض عربی اقوام تک محدود کر دیا جائے اور عربوں کا عُروج و زوال' اسلام کے عُروج و زوال کے مترادف سمجھ لیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے اہلِ علم کا دستور بن گیا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی یہ تمام محنتیں جو بغداد، بخارا، غزنی، قاہرہ اور دہلی کے مرکزوں کو با اقتدار اور شان دار بنانے میں صَرف ہوئیں، یہ سب بے کار تھیں۔ یہ سارے کے سارے مرکز' اسلامی اجتماع کے حق میں دُنبل (پھوڑے) سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اسلام کی اساسی حکمت' بین الاقوامی ہے

ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے ہم نے اسلام کی اساسی حکمت کو بین الاقوامی قرار دیا ہے اور ہم قرآن عظیم کو انٹرنیشنل انقلاب کی دعوت کا حامل سمجھتے ہیں، اس وقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو جماعت یا گروہ بھی قرآن کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہو، خواہ وہ عربوں میں سے ہو یا عجم میں سے، وہ سب کے سب ایک ہی درجے پر سمجھے جائیں۔ چناں چہ اسی بنا پر ہمارے نزدیک قرآن کے مقاصد پورا کرنے والے عرب اور پھر ان کے بعد عجم ایک ہی درجے پر آ جاتے ہیں۔ جس طرح ہم قریش میں کسی خاص خاندان کا امتیاز نہیں مانتے، اسی طرح ہم اسلامی ملت میں عربوں کی انفرادیت کے قائل نہیں۔ ان کی قومی برتری یا شخصی بڑائی کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔

بے شک عرب' اسلام کی اجتماعی تحریک کے امام ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اسلام کے اُصولوں پر ایک اجتماع کی تشکیل کی۔ اس لحاظ سے وہ تمام انسانی نسلوں کے

www.rahimia.org

لیے قیامت تک قرآن کی اجتماعی زندگی کا ایک نمونہ ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب عربوں کی مرکزی قوت کمزور ہوگئی اور ان کا اقتدار باقی نہ رہا تو خدانخواستہ اسلام بھی ختم ہوگیا۔ ہمارے نزدیک امیرالمومنین حضرت امیر معاویہؓ کی فتوحات اور قسطنطنیہ پر ان کے حملے کی جس قدر عزت اور قدر ومنزلت ہے، سلطان محمود غزنویؒ کی کشورکشائیوں کی بھی ہم ویسی ہی قدر کرتے ہیں۔

غیر عرب اقوام کا شاہی دور

اسلام کی بین الاقوامی تحریک کا یہ چوتھا دور تھا۔ اس دور میں زمامِ اقتدار کلیتاً غیر عرب مسلمان اقوام میں آ گئی۔ خود عرب قوم اور اُن کا ملک تک عثمانی تُرکوں کے ماتحت ہوگیا۔ ان مسلمان اقوام پر ان کے ''قومی'' بادشاہ ہی حکومت کرتے تھے۔ یہ ان معنوں میں تو جمہور کے نمائندے نہ تھے کہ ان کے عزل ونصب کا اختیار جمہور کو ہوتا ہے۔ یہ تلوار کے زور سے تخت وتاج کے مالک بنتے تھے۔ جو اُن میں صالح ہوتا، وہ البتہ جمہور کی مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ حکمران بادشاہ جمہور سے دور ہٹتے چلے گئے۔ آخرکار ''شاہیت'' اپنے محکوموں کے لیے وبال بن گئی۔ بدقسمتی سے مسلمان جمہور میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان کو جو اَب محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، مسندِ اقتدار سے الگ کرکے خود ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ دنیائے اسلام میں قومی شاہی حکومتوں کے بجائے قومی جمہوری حکومتیں بن جاتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں تو جمہور نے بیدار ہوکر اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو یا تو تخت سے محروم کردیا، یا انھیں اپنی مرضی کے تابع بنا لیا، لیکن مسلمان جمہور خوابِ غفلت میں پڑے سوئے رہے۔ اگر کبھی ان کو جگانے کی کوشش بھی کی گئی تو جابر بادشاہوں نے اسے اپنے اقتدار کے خلاف سمجھ کر بارآور ہونے نہ دیا۔

☆

مقالہ 17

قومی جمہوری تحریکات اور حکومتوں کا جمہوری دور

(1731ء تا 1941ء)

www.rahimia.org

قومی آزادی کی تحریکوں کی مخالفت درست نہیں!

''اسلامی بین الاقوامیت کے نام سے قومی تحریکوں کی مخالفت کرنے والے غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ ان کی وَجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم ان اہل الرائے کی بات صحیح مان لیں، جن کے نزدیک قومی حکومتوں کا تصور اسلام کے خلاف ہے اور اسلامی حکومت صحیح معنوں میں صرف ایک بین الاقوامی حکومت ہی ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صدہا سال سے اسلامی حکومت اس دنیا سے ناپید ہے۔ پھر جہاں تک اس زمانے کے حالات کا تعلق ہے، بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی حکومت معرضِ وجود میں آسکے۔

اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جائے تو — **نعوذ باللہ** — اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ سلطنت کے' ان تیرہ سو سالوں میں صرف گنتی کے برس جی سکا اور اب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا بھی زیادہ امکان نہیں۔ جب اسلام کے نظام کی دیرپائی کا یہ عالَم ہو تو اس کے عقائد کی بلندی اور پاکیزگی سے دنیا کیا متأثر ہوگی۔ اسلام اور اس کی تاریخ کی اس طرح تعبیر کرنے والے دوستی کے پردے میں اسلام کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو بلند دعاوی وہ زبان سے پیش کرتے ہیں، اگر ان دعاوی کو عملی نقطۂ نظر سے پرکھا جائے تو نتیجہ ان دعاوی کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔''

قومی جمہوری تحریکات اور حکومتوں کا جمہوری دور

(1731ء تا 1941ء)

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اس ''شاہیت'' کے آخری دور میں کم و بیش ایک ہی زمانے میں ایسی تحریکیں شروع ہوئیں، جن کے مخاطب جمہور تھے۔ یہ تحریکیں قومی اور جمہوری تھیں۔ ان کے بانیوں کے پیشِ نظر ساری دنیا اسلام نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قوم کے جمہور تھے۔ چناں چہ ان قومی جمہوری تحریکات کا ایک مختصر جائزہ درجِ ذیل ہے:

1۔ عثمانی ترکوں کے ہاں اس تحریک نے تنظیمات کی شکل اختیار کی۔

(ترکی میں سلطنتِ عثمانیہ کے زمانہ میں سلطان عبد المجید کے عہد (1839ء تا 1861ء) میں ''تنظیمات'' کے نام سے قومی اصلاحات کا ایک نظام متعارف کرایا گیا، جنھیں بعد میں سلطنت کے نظامِ حکمرانی میں داخل کر دیا گیا۔ یہ اہم ترین اصلاحات 1856ء میں کی گئیں۔ انھیں کی اساس پر 1879ء میں قانونِ اساسی تشکیل دیا گیا۔ انھی اصلاحات کو ''تنظیمات'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔)

2۔ عربوں میں محمد بن عبدالوہاب نجدی پیدا ہوئے۔

(محمد بن عبد الوہاب کی ۱۱۱۵ھ/ 1704ء میں ریاض کے قریب (عینیہ) میں پیدائش ہوئی۔ انھوں نے سیاسی حوالے سے عربوں میں قومی بیداری کا کام کیا اور تُرکوں کے مقابلے پر ''عربیت'' کو فروغ دیا۔ امیر محمد بن سعود (امیر الدرعیہ) کے ساتھ مل کر 1856ء میں مسلح جدو جہد شروع کی۔ ان کا انتقال ۱۲۰۶ھ/ 1792ء میں ہوا۔)

3۔ شمالی افریقا میں امیر عبدالقادر الجزائری نے قوم کی زمامِ قیادت سنبھالی۔

(امیر عبد القادر جزائری 1808ء میں الجزائر (شمالی افریقا) میں پیدا ہوئے اور 1883ء میں دمشق میں انتقال ہوا۔ انھوں نے 1832ء سے 1847ء تک الجزائر کی قومی آزادی کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ فرانس کے خلاف کئی جنگیں لڑیں۔ پھر مجبوراً جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی اور دمشق آ گئے۔ وہیں پر انتقال ہوا۔ لیکن الجزائر کی قومی آزادی میں اُن کا کردار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔)

4۔ مصر میں خُدیو محمد علی اہلِ مصر کے قومی جذبات کے ترجمان بنے۔

(خُدَیو محمد علی (1769ء تا 1844ء) نے ترکی فوج میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ اسے 1789ء میں فرانسیسی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک فوج کے ساتھ مصر بھیجا گیا۔ ان کی فوجی قابلیتوں کی وَجہ سے جلد ہی اسے فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ 1801ء میں فرانسیسیوں کی شکست اور انگریزوں کے مصر چھوڑنے کے بعد مصر کا پُرانا نظامِ حکومت ٹوٹ چکا تھا۔

1571ء سے مصر ترکوں کی عمل داری میں تھا۔ اس کا نظامِ حکومت یہ تھا کہ سلطانِ ترکی کی جانب سے ایک پاشا یا نائب السلطنت مصر میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کی امداد کے لیے 20 مملوکوں پر مشتمل ایک کونسل ہوتی تھی۔ نپولین بوناپاٹ کے مصر پر پے در پے حملوں کے نتیجے میں مملوکین کا خاتمہ ہوا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد مصر میں پیدا ہونے والے قومی جذبات کے پیشِ نظر محمد علی نے اس نظام کو ختم کر کے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ اس نے پرانا نظامِ حکمرانی ختم کر کے نیا قومی نظام تشکیل دیا۔ اس کے دور میں قومی حوالے سے مصر کی علمی، ثقافتی اور معاشی ترقی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد ان کا بیٹا ابراہیم پاشا حکمران ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل پاشا حکمران ہوا۔ جس کو سلطان عبد العزیز نے ''خُدیو'' کا لقب دیا، جو بعد میں محمد علی کے تمام حکمران خاندان کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ''خُدیو'' مسلمان حکمرانوں کا لقب ہے۔ فارسی میں اس کا معنی وزیر ہے۔ یہ لفظ مصر کے حکمرانوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔

اسماعیل پاشا کے بعد اس کا بیٹا خُدیو توفیق اور پھر اُس کا بیٹا خُدیو عباس حلمی حکمران ہوا۔ اس پورے خاندان کو ''خاندانِ خُدیویہ'' کہا جاتا ہے۔)

5۔ ایران میں بھی قومی بیداری نے جنم لیا۔

(بیسوی صدی کے آغاز میں قومی جمہوریت کے حوالے سے ایران میں بھی بیداری کی کافی تحریکات اُٹھیں۔ مختلف لیڈروں نے اس حوالے سے انقلابی تحریکات چلائیں۔)

6۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے نام لیواؤں نے ہندوستان کے مسلمان جمہور کو منظّم کرنے کی کوشش کی (جس کی تفصیلات الگ مقالے میں آرہی ہیں)۔

1۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ دسویں دور (۱۱۱۸ھ تا ۱۱۷۴ھ/ 1707ء تا 1761ء) کے اماموں میں سے دوسرے طبقے کے لوگوں میں سے ہیں۔

2 اُن کے والد حضرت الامام شاہ عبدالرحیم بن وجیہ الدین دہلویؒ اس دور کے پہلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

3۔ امام شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ دہلویؒ گیارہویں دور (۱۱۷۴ھ تا ۱۲۷۴ھ/ 1761ء تا 1857ء) کے پہلے طبقے کے ائمہ میں سے ہیں۔

4۔ ہندوستانی تحریک کے چار اراکین:

(۱) صدر الشہید شیخ محمد اسماعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ دہلویؒ

(۲) صدر الحمید شیخ محمد اسحاق دہلویؒ، نواسہ امام عبدالعزیز (دہلوی)

(۳) صدر السعید شیخ عبدالحیٔ دہلویؒ، داماد امام عبدالعزیز (دہلویؒ)

(۴) امیر الشہید سیّد احمد حسنی دہلویؒ، خلیفہ امام عبدالعزیز (دہلویؒ)

گیارہویں دور کے اماموں میں سے دوسرے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

5۔ شیخ محمد یعقوب دہلویؒ، نواسہ امام عبدالعزیز دہلویؒ گیارہویں دور کے تیسرے طبقے اور بارہویں دور (۱۲۷۴ھ تا ۱۳۴۰ھ/ 1857ء تا 1922ء) کے پہلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

www.rahimia.org

اس طرح ہندوستان میں ولی اللّٰہی خاندان کی امامت تقریباً دو سو سال تک یعنی ۱۰۸۴ھ (1674ء) سے ۱۲۸۳ھ (1866ء) تک مسلسل قائم رہی ہے۔

جہاں تک ہمارے دیوبندی مشائخ کا تعلق ہے، تو اُن میں سے اہم ترین حضرات گیارہویں دور کے تیسرے طبقے اور بارہویں دور کے اماموں میں سے ہیں۔ چناں چہ دہلی کے مدرسہ (رحیمیہ) کے نقش قدم پر دیوبند کے مدرسے کی بنیاد ۱۲۸۳ھ (1866ء) میں رکھی گئی۔

بدقسمتی سے ان تحریکوں کا آغاز ہی ہوا تھا کہ یورپ کے جمہور جو تقریباً دو صدی پہلے بیدار ہو چکے تھے، مشرقی ملکوں پر (ان کے استحصال پسند حکمران) پل پڑے (چڑھ دوڑے)۔ اور بجائے اس کے کہ وہاں قومی بادشاہوں کی وارث قومی پارلیمانی حکومتیں بنتیں، یورپ والے بیچ میں آ گئے اور تمام دنیائے اسلام اِن ستم گاریوں سے تہہ و بالا ہوگئی۔

قومی جمہوری حکومتوں کا دور

(جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر) 1918ء سے اسلامی دنیا میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلامی ملکوں میں ایک صدی پہلے جن قومی جمہوری تحریکوں کا بیج بویا گیا تھا، گو یورپ کے سیلاب نے اسے برگ و بار لانے کا اس وقت موقع نہ دیا، لیکن وہ بیج اندر ہی اندر نشوونما پاتا رہا۔ جوں ہی گزشتہ جنگِ عظیم (1914ء تا 1918ء) ختم ہوئی اور محکوم قوموں کو سر اُٹھانے کی فرصت ملی تو تقریباً ہر اسلامی ملک میں عوام نے آزادی کے لیے جدوجہد شروع کر دی:

1۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے قومی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی۔

2۔ مصر میں سعد زغلول نے قومی پارلیمنٹ بنائی۔

3۔ شام، فلسطین، طرابلس، تیونس اور مراکش وغیرہ میں بھی قومی تحریکیں اٹھیں، لیکن وہاں کے جمہور اپنی آزاد حکومتیں بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

4۔ ہندوستانی مسلمان بعض مخصوص حالات کی بنا پر اپنے ملک کی قومی تحریک میں شامل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔

دُنیائے اسلام میں یہ قومی حکومتوں کا جمہوری دور ہے۔ اس دور میں ایک مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم کی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں اور نہ کسی اسلامی ملک کے جمہور اپنے مطلق العنان بادشاہ کی جابرانہ حکومت ہی گوارا کر سکتے ہیں۔ جن مسلمان بادشاہوں نے رعایا کے خلافِ مرضی من مانی حکومت کرنی چاہی، اُن کا حشر دنیا دیکھ چکی ہے۔ جس مسلم قوم نے دوسری مسلم قوم پر زبردستی حکومت کرنے کی کوشش کی، اس کا انجام گزشتہ جنگِ عظیم میں عربوں اور ترکوں کے معاملے میں واضح ہو چکا ہے۔

الغرض! اس دور میں ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ کسی نام سے بھی اپنے ملک میں دوسروں کی دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتا۔ نہ وہ دوسروں کے سر پر اپنی حکومت تھوپنے کا رَوادار ہے۔ چناں چہ ہر قوم اپنی زبان کو ترقی دے رہی ہے:

1۔ افغان پشتو کی ترویج کر رہے ہیں۔
2۔ ایران میں فارسی کو زندگی کے ہر شعبے میں لازمی بنا دیا گیا ہے۔
3۔ عربی بولنے والی قومیں عربی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہیں۔
4۔ اور ترک تو زبان کے معاملے میں کافی نام بھی پیدا کر چکے ہیں۔

اس دور میں اسلام کی بین الاقوامی تحریک کی حامل کوئی ایک قوم نہیں رہی۔ ان چودہ سو برسوں میں اسلام کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا ہے۔ اب عربوں کے علاوہ اَور قومیں بھی مسلمان ہوچکی ہیں۔ لہٰذا اب اگر کبھی کوئی بین الاقوامی اسلامی ادارہ بنے گا تو اس میں ساری مسلمان قومیں برابر کی شریک ہوں گی۔ یعنی ہر مسلمان قوم اور ہر اسلامی ملک اپنی جگہ آزاد ہو گا۔ پھر یہ آزاد قومیں اور ممالک باہم مل جل کر کسی بین الاقوامی ادارے کی تشکیل کریں گے۔

الغرض! اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ درجِ ذیل ان مختلف ادوار

میں سے گزر چکی ہے:

1۔ پہلا دور: حضورِ اقدس ﷺ سے حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۵ھ/ مئی 656ء) تک، جب کہ ساری اُمت متفق و متحد رہی، اسلامی حکومت کا مثالی دور ہے۔

2۔ دوسرا دور: حضرت علیؓ کا دورِ حکومت (۳۵ تا ۴۱ھ/ 656ء تا 660ء)، ''عربی قومی حکومت'' اور السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی مثالی حکومت کی بیچ کی کڑی ہے۔

3۔ تیسرا دور: حضرت امیر معاویہؓ سے مسلمان عربوں کی حکومت شروع ہوتی ہے:

(الف) دورِ بنواُمیہ: حضرت امیر معاویہؓ سے ہشام ابن عبد الملک تک:

(ربیع الاوّل ۴۱ھ/ جولائی 661ء تا ۱۳۲ھ/ اکتوبر 749ء)

(ب) دورِ بنوعباس: (ابوالعباس عبداللہ بن سفّاح اور اُس کے بھائی ابوجعفر عبداللہ) منصور سفّاح سے ہارون الرشید تک:

(۱۳۲ھ/ اکتوبر 749ء تا ۳ / جمادیٰ الثانیہ ۱۹۳ھ/ 24/ مارچ 808ء)

4۔ خلیفہ ہارون الرشید پر عربی سیادت کا دور ختم ہوجاتا ہے۔

5۔ مامون الرشید (۱۷۰ھ/ 786ء تا ۲۱۸ھ/ 833ء) سے زوالِ بغداد (۶۵۶ھ/ 1258ء) تک عباسی خلافت کے زیرِ سایہ عجمی قومیں برسرِ اقتدار آتی ہیں۔

6۔ زوالِ بغداد (۶۵۶ھ/ 1258ء) سے عربیت کا کلی خاتمہ ہوجاتا ہے اور خالص ترکی (سلطنتِ عثمانیہ) کا دور (۶۹۹ھ/ 1299ء تا صفر ۱۳۳۷ھ/ نومبر 1918ء) شروع ہوجاتا ہے۔

7۔ 1918ء میں (جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر) ترکی کی آخری نشانی یعنی عثمانی سلطنت کا چراغِ سحر بجھ جاتا ہے۔

8۔ یہاں سے قومی جمہوریتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

قومی آزادی؛ مسلمانوں کی نجات کا راستہ

ہمارا یہ دور قومی جمہوریتوں کا دور ہے، لیکن یہ قومی جمہوری رنگ اسلام کی بین

الاقوامی رُوح کے خلاف نہیں۔ مسلمانوں کی نجات اب اس میں ہے کہ پہلے تو وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد ہوں اور آگے چل کر یہ آزاد اِکائیاں اپنی کوئی بڑی وحدت بنا لیں، لیکن اس وقت تو مقدم یہ ہے کہ ہر ملک آزاد ہو۔ اسلامی بین الاقوامیت اس کے بعد کی چیز ہے۔

قومی تحریکوں کی مخالفت درست نہیں!

اسلامی بین الاقوامیت کے نام سے قومی تحریکوں کی مخالفت کرنے والے غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ ان کی وَجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگر ہم ان اہل الرائے کی بات صحیح مان لیں، جن کے نزدیک قومی حکومتوں کا تصور اسلام کے خلاف ہے اور اسلامی حکومت صحیح معنوں میں صرف ایک بین الاقوامی حکومت ہی ہوسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صدہا سال سے اسلامی حکومت اس دنیا سے ناپید ہے۔ پھر جہاں تک اس زمانے کے حالات کا تعلق ہے، بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ آئندہ کوئی اس طرح کی حکومت معرضِ وجود میں آسکے۔

اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جائے تو — **نعوذ باللہ** — اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ سلطنت کے، ان تیرہ سو سالوں میں صرف گنتی کے برس جی سکا اور اب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا بھی زیادہ امکان نہیں۔ جب اسلام کے نظام کی دیر پائی کا یہ عالَم ہو تو اس کے عقائد کی بلندی اور پاکیزگی سے دنیا کیا متأثر ہوگی۔ اسلام اور اس کی تاریخ کی اس طرح تعبیر کرنے والے دوستی کے پردے میں اسلام کے ساتھ دشمنی کررہے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو بلند دعاوی وہ زبان سے پیش کرتے ہیں، اگر ان دعاوی کو عملی نقطۂ نظر سے پرکھا جائے تو نتیجہ ان دعاوی کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔

اسلام کے نظریہ سازوں کا موہوم تصور

اسلام کے اس طرح کے نظریہ ساز پہلے تو اسلام کے متعلق ایک موہوم تصور پیش کرتے ہیں۔ جب اپنی گرد و پیش کی زندگی اور ماضی کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے اس

www.rahimia.org

موہوم تصور کو عملی جامہ پہنتے نہیں دیکھتے تو پھر اپنی ایک خیالی دنیا بساتے ہیں۔ لوگوں کو اس دنیا میں آباد ہونے کی بڑی گرم جوشی سے دعوت دیتے ہیں۔ چوں کہ اس کے لیے محض خیال آفرینی شرط ہے۔ ماحول سے چھیڑ چھاڑ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس لیے عمل پر خیال کو ترجیح دینے والے ذوق وشوق سے ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں اور بہ زعمِ خویش سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔

ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود تو کچھ نہیں کر پاتے اور نہ خیالی دنیا سے کبھی باہر قدم رکھتے ہیں، لیکن جو لوگ عملی زندگی کی دشواریوں، رکاوٹوں اور آلائشوں کی پروا نہ کرتے ہوئے' اپنی قوم کو جس پستی میں وہ ہے، اس سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن حالات میں وہ قوم گھری ہوئی ہوتی ہے، ان حالات کے مطابق قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک مردود اور گھٹیا انسان ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو کہے اور کچھ نہ کرے وہ ''مجددِ ملت'' اور جو کچھ کرنے کی کوشش کرے اور ظاہر ہے کام ہمیشہ گرد و پیش کے حالات کو مدنظر رکھ کر ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے بلندی سے نیچے اُترنا پڑتا ہے، وہ ''مردود'' ٹھہرے۔

☆

مقالہ 18

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیاسی تحریک

www.rahimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا انقلابی پروگرام

’’مسلمانوں کی قوت کا یہ ہمہ گیر سُقوط (مکمل زوال) سخت تشویش ناک تھا، لیکن اس پر گہری نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (دہلویؒ) نے ڈالی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا انتقال 1763ء میں ہو گیا، جب کہ 1789ء کا انقلابِ فرانس شاہ صاحبؒ کی وفات کے 26 سال بعد برپا ہوا، جسے جمہوریت و آزادی کا نشانِ راہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت کا بانی کارل مارکس بھی 55 سال بعد 1818ء میں پیدا ہوا، جسے اقتصادی اور معاشی انقلاب کا داعیٔ اوّل کہا جاتا ہے۔

لیکن کیا یہ بات قابلِ توجہ نہیں کہ انقلابِ فرانس سے تقریباً 50 سال قبل اور اشتراکی انقلاب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل حضرت شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) نے آنے والے دور کے لیے اسلام کے سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تہذیبی نظام کے وہ عالم گیر اُصول مدوّن کر کے پیش کر دیے تھے، جو قوموں کے پیچیدہ مسائل کا بہترین حل اور انسانیت کی نجات کے سب سے بڑے ضامن ہیں۔‘‘

www.rahimia.org

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیاسی تحریک

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل یعنی 1703ء میں مفکرِ اعظم، مجددِ ملت، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ (دہلوی) رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور 1763 عیسوی میں صرف 61 سال کی عمر میں آپؒ اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط

انگریز جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجتماعی طاقت کے ساتھ 1608 عیسوی میں ہندوستان میں تجارت کے لیے داخل ہوئے تھے، اپنی عیارانہ سازشوں کے تحت 1663 عیسوی میں اس قابل ہوگئے کہ ہر قسم کی جنگ کرنے کے لیے پَر تولنے لگے۔ تاہم عالَم گیر کے عہدِ حکومت تک انھیں سیاست میں دخل اندازی کا براہِ راست موقع نہ ملا۔ اگرچہ در پردہ وہ حکومت کی بعض باغی طاقتوں مثلاً مرہٹوں وغیرہ کو اُکساتے رہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب مرہٹوں نے شیوا جی کی قیادت میں دفعتاً (اچانک) سورت پر حملہ کر کے وہاں کے باشندوں اور تاجروں کو لوٹا تھا تو انگریز تاجروں کی کوٹھیاں محفوظ چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز کے ایما پر ہی یہ خفیہ چھاپہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مرہٹوں نے مارا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شروع دن سے ہی انگریزوں کے کیا عزائم اور کیا مقاصد تھے؟ وہ کس طرح ہندوستان کے حکمران بن جانے کے خواہش مند تھے؟

اس خطے کے علما اور رہنماؤں کی بالغ نظری

ٹھیک انھی دنوں میں علما کا ایک گروہ بھی یہ کوشش کر رہا تھا کہ ملک کا نظامِ سیاسی اسلامی عدل پر قائم ہو جائے۔ اس کے ذریعے تمام مفاسد کا سدِّ باب کر دیا جائے۔ یہاں سے علما کی بالغ نظری اور ان کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عالم گیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں مغلوں کی سیاسی قوت کا زوال شروع ہوگیا۔ پورا ملک تیزی سے انتشار کی گرفت میں چلا گیا۔ اس زمانے میں نادر شاہ نے دہلی کو لوٹا۔ وسطِ ہند اور مہاراشٹر صوبے میں مرہٹوں نے غلبہ حاصل کیا۔ مختلف صوبوں کے گورنر خودمختار بن گئے۔ شمالی ہند میں سکھوں کے فوجی گروہ نے سر اٹھایا۔ انگریزوں نے کھل کر ہندوستان کے اِن سیاسی حالات میں دخل دینا شروع کر دیا۔

شاہ ولی اللہؒ کا انقلابی پروگرام

مسلمانوں کی قوت کا یہ ہمہ گیر سُقوط (مکمل زوال) سخت تشویش ناک تھا، لیکن اس پر گہری نظر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (دہلویؒ) نے ڈالی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شاہ صاحبؒ کا انتقال 1763ء میں ہو گیا، جب کہ 1789ء کا انقلابِ فرانس شاہ صاحبؒ کی وفات کے 26 سال بعد برپا ہوا، جسے جمہوریت و آزادی کا نشانِ راہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت کا بانی کارل مارکس بھی 55 سال بعد 1818ء میں پیدا ہوا، جسے اقتصادی اور معاشی انقلاب کا داعیٔ اوّل کہا جاتا ہے۔

لیکن کیا یہ بات قابلِ توجہ نہیں کہ انقلابِ فرانس سے تقریباً 50 سال قبل اور اشترا کی انقلاب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل حضرت شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) نے آنے والے دور کے لیے اسلام کے سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تہذیبی نظام کے وہ عالم گیر اُصول مدوّن کر کے پیش کر دیے تھے، جو قوموں کے پیچیدہ مسائل کا بہترین حل اور انسانیت کی نجات کے سب سے بڑے ضامن ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ پریس اور پروپیگنڈے کی وہ طاقت جو مارکس کے متبعین کو حاصل

ہوئی اور انقلابِ فرانس کے داعیان نے حاصل کی، حضرت شاہ صاحبؒ کے افکار کی اشاعت کے لیے میسر نہ آسکی، ورنہ شاید دنیا کی تاریخ آج کچھ اَور ہوتی۔ بہر حال جیسے جیسے اس سرزمین پر انگریز کے قدم بڑھتے اور مضبوط ہوتے گئے، ویسے ویسے شاہ صاحبؒ کی قائم کردہ جماعتِ علما کی (حصولِ آزادی کے لیے) کوششیں بھی تیزتر ہوتی گئیں۔ شاہ صاحبؒ نے حالات کا گہرا مطالعہ فرمایا اور حال و مستقبل کے رُجحانات کا جائزہ لے کر اسلامی فکر و عمل کا مکمل دستور العمل پیش فرمایا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک جماعت کی تشکیل بھی کی۔

ولی اللّٰہی تحریک کے ارکانِ اوّل

اس زمانے میں اس جماعت کے ارکانِ خاص مندرجہ ذیل علما تھے، جن کا دائرۂ اثر دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا:

(۱) مولانا محمد امین ولی اللّٰہی کشمیری: یہ شاہ صاحبؒ کے جان نثار ساتھی تھے اور شاہ صاحبؒ کے بعد ان کی جماعت کے مربی رہے۔

(۲) مولانا محمد عاشق پھلتیؒ: یہ پُھلّت ضلع مظفر نگر کے رہنے والے شاہ صاحبؒ کے عزیز ترین و مخلص رفیق اور شاہ صاحب کے نظریاتِ انقلاب کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے بھی اس جماعت کی خصوصی تربیت فرمائی۔

(۳) حضرت مولانا شاہ ابوسعید رائے بریلیؒ: یہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے نانا تھے۔ انگریزوں کے خلاف سلطان ٹیپو اور اس کے والد کی کوششوں میں آپ کا زبردست تعاون تھا۔

(۴) حضرت مولانا نور اللہ بُڈھانویؒ: آپؒ کے ہی پوتے مولانا عبدالحئی بڈھانوی تھے، جو سیّد احمد شہیدؒ کے دو بڑے ساتھیوں میں ایک ہوئے۔

(۵) سِراجُ الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ: یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے فرزندِ جلیل تھے اور آپؒ کے بعد آپؒ کے جانشین اور آپؒ کی جماعت کے قائدِ

اعلیٰ تھے۔

(۶) حضرت مولانا مخدوم لکھنویؒ۔

(۷) مخدوم مُلّا معین الدین ٹھٹھویؒ: یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خلیفۂ اجل اور سندھ میں تحریک کے پھیلانے والے تھے۔

ولی اللّٰہی تحریک کا وسیع حلقۂ اثر

شاہ صاحبؒ کی یہ تحریک پورے ہند، وسطِ ایشیا اور بلادِ عرب تک پھیل گئی تھی۔ اس لیے ان اکابرین کے علاوہ (جن کا اوپر ذکر ہوا) دور و قریب کے بے شمار علما اس سے وابستہ تھے، جن کی تفصیل بڑی طوالت چاہتی ہے۔ اس تحریک کے مراکز؛ دہلی کے علاوہ اَوَدھ، جنوبی ہند، سندھ اور بیرونِ ہند کے کئی مقامات تھے۔ شاہ صاحبؒ کی اس تحریک کا نقطۂ آغاز ایک دینی مرکز ''مدرسۂ رحیمیہ'' سے ہوا۔ اور یہی سلسلہ بعد کے دور میں پھیلتا چلا گیا۔

اورنگ زیب عالم گیرؒ کا عہد

1707ء میں اورنگ زیب عالم گیرؒ نے وفات پائی۔ اور شہزادوں کی جنگِ اقتدار نے یورپ و ایشیا کی سب سے بڑی خوش حال سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ عظیم ترین انسانوں کی اکثر یہ بدنصیبی رہی ہے کہ ان کے وارث و جانشین عمومی طور پر نااہل ثابت ہوتے ہیں۔ عالم گیر وسیع ترین مغل سلطنت کا فرماں روائے اعظم تھا اور ان تمام خوبیوں کا حامل تھا، جو اتنے بڑے حاکم میں ہونی چاہئیں۔ وہ پابندِ دین مسلمان تھا۔ سلطنت اس نے قوتِ بازو سے حاصل کی تھی۔ اور پچاس سال تک اس عظیم سلطنت کا نظام سنبھالے رکھا۔ اس کے مشیر اور اس کی دینی زندگی کے رہنما علمائے کرام ہی تھے اور اس نے بھی علما کے ساتھ اپنے تعلق و نیازمندی کو آخر وقت تک قائم رکھا۔

سلطنتِ مغلیہ کا زوال

ایک بڑی سلطنت کا کمزور ہونا ایک پہاڑ کے ٹوٹ جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر ایک معمولی دیوار گرے تو سنبھالی جا سکتی ہے، لیکن اگر ایک پہاڑ ٹوٹنے لگ جائے تو اسے کسی طرح بھی قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ہندوستان کی مغل سلطنت ہی نہیں، دنیا کی ہر بڑی سلطنت کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے، جب وہ سلطنت کمزور ہوئی تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھل سکی۔

اکبر سے عالم گیر کے عہد (1556ء تا 1707ء) تک تو اس سلطنت کا وہ دور تھا جب اسے اسلامی عدل کی بنیادوں پر ہمیشہ کے لیے استوار کیا جا سکتا تھا، لیکن عالم گیر کے بعد اس کی یہ حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر اس حقیقت پر تھی۔ چناں چہ آپؒ نے اپنی تحریروں میں اس سلطنت کو "لُعبَۃُ الصِّبیَانُ"، یعنی "بچوں کا کھیل" سے تعبیر کیا ہے۔ (159) اور ایک نئے اسلامی انقلاب کو ہی اپنی جدوجہد کا مقصود قرار دیا۔

انگریز اور علما کے درمیان کشمکش

عالم گیر کی وفات (1707ء) کے بعد ہندوستان کی جو حالت تھی، اس میں اُمرا اور راجگانِ ہند کی آپس کی چپقلش تو محض ایک ظاہری حیثیت کی حامل تھی۔ اصل معرکہ انگریزوں اور ولی اللّٰہی جماعت کے علما کے درمیان تھا۔ یہ دو منظّم قوتیں ہی اس وقت میدانِ عمل میں تھیں:

1۔ ایک انگریز کی قوت جو تمام مادی وسائل و ذرائع اور خفیہ چالاکیوں اور مکاریوں کی ماہر تھی۔

2۔ دوسری ولی اللّٰہی جماعتِ علما کی طاقت، جو اگرچہ نظم و ضبط میں انگریزوں سے بھی بہتر تھی، لیکن دوسرے وسائل و ذرائع سے بالکل محروم تھی۔

یہ تو تھی اسلامی نظامِ عدل کی راہ ہموار کرنے کی ظاہری کوشش، جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ نے ان معاشی اور

اقتصادی مسائل کا حل، جو مارکس کے زمانے میں پیدا ہوئے، اور نظامِ سلطنت کے اُصول جن کا ارتقا انقلابِ فرانس سے شروع ہوا تھا، بہت عرصہ قبل مرتب کرڈالے تھے۔ دوسروں کے لیے چاہے یہ حیرانی کی بات ہو، لیکن وہ مسلمان جنھیں اللہ نے کتاب وسنت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، وہ جانتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ کے سامنے اسلام کے اصل ماخذ موجود تھے۔ آپؒ نے آئندہ زمانے کی ضروریات کا اندازہ فرما کر اِن مآخذ ہی سے یہ اُصول ترتیب دیے۔

شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کا نظریۂ حکمرانی

شاہ صاحبؒ نے نظامِ حکومت کے لیے جو تصور و نظریہ دیا، وہ ان کی مشہور کتاب ''البدور البازغہ'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آپؒ نے ایسی سلطنت کے بارے میں جو اعلیٰ تمدن رکھنے والی اور ترقی پذیر ہو، اس کی بنیادی ضرورتوں کے لیے پانچ شعبے تجویز کیے۔ جن کے چلانے کے لیے خاندان، نسل، رنگ، فرقے وغیرہ کے امتیاز سے بالا ہو کر اہلیت رکھنے والے ماہرین کا تقرر تجویز کیا۔ ایسی حکومت کی سربراہی کے لیے جامع اہلیت، اعلیٰ کارکردگی اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والا فرد ضروری قرار دیا، جس کا نام آپ نے ''امام الحق'' رکھا، لیکن اگر یہ امام الحق دستیاب نہ ہو تو پھر حکومت کے لیے یہ شکل تجویز فرمائی کہ:

''اِجتِمَاعٌ مِنْ عُقَلاَءِ الْقَوْمِ وَ مُبْرِزِيْهِمْ.'' (160)

(اولاً چند اربابِ فہم و دانش، اہل اور تجربہ کار افراد کی پارلیمنٹ مل کر یہ فریضہ انجام دیں۔)

شاہ ولی اللہؒ کے اقتصادی اصول

موجودہ عالمی مسائل میں اہم مسائل اقتصادیات و معاشیات کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کی اہمیت اب اتنی بڑھ چکی ہے کہ زندگی کے تمام شعبے ان سے متأثر اور ان کی گرفت میں ہیں۔ اقتصادیات و معاشیات کے مثبت و منفی پہلوؤں پر مبنی دو نظام ہمارے دور کی پیداوار ہیں:

(۱) ایک صنعتی سرمایہ دارانہ نظام (۲) دوسرا محنت کا اشتراکی نظام

یورپ میں ابھی ان مسائل نے جنم بھی نہیں لیا تھا کہ سرزمینِ مشرق کا ایک زبردست دینی عالم اور مفکرِ اعظم اسلام کی روشنی میں انھیں حل کر چکا تھا۔

چناں چہ شاہ صاحبؒ نے اقتصادیات کے بارے میں طے کیا کہ:

(۱) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوتِ کاسبہ (کمانے والی طاقت) ہیں۔ باہمی تعاون‘ شہریت کی رُوح رواں ہیں۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔

(۲) جُوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں، جن کی موجودگی میں تقسیمِ دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہوسکتا اور بغیر اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو، دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔

(۳) مزدور، کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوش حالی‘ ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے، وہ ملک کے لیے خطرہ ہے۔ اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

(۴) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دُشمن ہے۔ اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

(۵) ضرورت مند مزدور کی رضا مندی قابلِ اعتبار نہیں، جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امدادِ باہمی کے اُصول پر لازم ہوتی ہے۔

(۶) جو پیداوار یا آمدنی‘ تعاونِ باہمی کے اُصول پر نہ ہو تو وہ خلافِ قانون ہے۔

(۷) کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اَخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

(۸) تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ لہٰذا اس کو تعاون کے اُصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ بس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ ''بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے ''کمپٹیشن'' (مقابلے) سے روحِ تعاون کو نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

(۹) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں منحصر کر دے، ملک کے لیے تباہ کُن ہے۔

(۱۰) وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش وعشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کو اس مصیبت سے نجات دلائی جائے اور اُن کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے۔

سیاسیات کے بنیادی اصول

(۱۱) زمین کا مالکِ حقیقی اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے۔ باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقِ انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

(۱۲) سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ ملک، ملک الناس، مالکِ قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحبِ اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

(۱۳) اسٹیٹ کے سربراہِ کار کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولّی کی۔ وقف کا متولّی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔

بنیادی انسانی حقوق

حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ اور **البدور البازغہ** وغیرہ تصانیف میں ارتفاقات (مفاداتِ عامہ) کے عنوان سے بہت مفصل بحث موجود ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱۴) روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے، بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۱۵) اس طرح مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگانِ ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس کی حفاظت، حقِ ملکیت میں آزادی، حقِ شہریت میں یکسانیت ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(۱۶) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقے کا بنیادی حق ہے۔

بین الاقوامی تحفظات

(۱۷) ان حقوق کے حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے بنائے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں۔ ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ اپنے جیسے یونٹ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام میں منسلک ہوں، جو طاقت کے لحاظ سے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہو۔ اس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے، البتہ اس کا یہ فرض ضرور ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

مذہبیات

(۱۸) دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے۔ اس کے پیش کرنے والے ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

(۱۹) داعیانِ صداقت ہر ملک اور قوم میں گزرے ہیں۔ اُن سب کا احترام ضروری ہے۔

(۲۰) سچائی اور دین کے بنیادی اُصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں، مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ، یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں، البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

(۲۱) ساری مہذب دنیا کے سماجی اُصول اور اُن کا منشا و مقصد ایک ہے، مثلاً ہر ایک مذہب اور فرقہ جنسی انارکی (غیر قانونی تعلقات) کو ناپسند اور اَخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ جنسی تعلقات کے لیے مرد اور عورت میں ایک معاہدہ ہر ایک فرقے میں ضروری ہے، البتہ معاہدے کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ اپنے مُردے نظروں سے غائب کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔

جہاد

(۲۲) ایک مقدس فریضہ ہے، مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ کہ مقدس اُصول کے لیے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی اِن اصولوں کے لیے فنا کر دے۔ (161)

مندرجہ بالا اصول کی تشریح و اقتباسات

جو اُصول اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان کے ماخذ کا حوالہ دے دیا ہے۔ ان تمام کا ترجمہ پیش کرنا باعثِ طوالت ہے، البتہ شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کی کتابوں کے چند اقتباسات، جن سے شاہ صاحبؒ کے نظریات پر مجموعی طور پر روشنی پڑتی ہے، یہاں پیش کر دینے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اصل عبارتیں بہ خوفِ طوالت یہاں بھی نقل نہیں کی جا رہیں۔ صرف ان کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ترجمے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں وہ مشینیں اور کلیں، جن کی بنیاد پر اُنیس ویں اور بیس ویں

صدی عیسوی میں سرمایہ داری نے خاص شکل اختیار کی، اور وہ سوالات پیدا ہوئے، جنھوں نے کمیونزم کو کامیاب بنایا، بلاشبہ نہیں تھیں، مگر جاگیرداری اور خاص خاص منصبوں اور وظیفوں کی اجارہ داری نے اقتصادی توازن درہم برہم کر رکھا تھا۔

ملکی تباہی کے اسباب

بادشاہ، اُمرا اور بالادست حکام وہ چھوٹے بڑے جاگیردار تھے، جو شاہانہ زندگی اور عیش پرستانہ رنگ رلیوں کے لیے کاشت کاروں کا خون چوستے تھے۔ اور خانقاہ نشین پیشہ ور فقرا، سجادہ نشین اور نام نہاد علما نے گویا کلیسائی نظام کا نقشہ ہندوستان میں کھینچ رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقے محنت سے نا آشنا تھے۔ ملک کی دولت میں ان کے ذریعے کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ بہ قول شاہ صاحبؒ یہ ملک کے لیے بارِ گراں (بڑا بوجھ) تھے۔

چناں چہ **حُجّةُ اللّٰه البالِغه "مبحث الارتفاقات"** میں **"باب سياسة المدنيه"** کے آخر میں آپؒ فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں بربادیٔ ملک کا سبب زیادہ تر دو چیزیں ہیں:

(ا) خاص طبقے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے خاص خاص امتیاز کی بنا پر رقم بٹورتے ہیں، مثلاً اس لیے کہ وہ قاری اور عالم ہیں، یا ان کا تعلق شعرا، سجادہ نشینوں اور فقرا کے اس حلقے سے ہے، جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے ملتے رہتے ہیں، یا اسی قسم کی دریوزہ گری (گداگری) اور بھیک کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانۂ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں اور ملکی دولت کے وسیع دامن کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مقصود ملک کی کوئی خدمت کرنا نہیں، بلکہ رقمیں حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اپنا ذریعۂ معاش فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ ان مہذب مفت خوروں کا ایک گروہ جاتا ہے اور دوسرا گروہ آتا ہے۔ اس طرح باشندگانِ ملک کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک کے لیے بوجھ

بنتے رہتے ہیں۔

(۲) کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری ٹیکس مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے، جس کو دور کرنے کے لیے جبر و تشدد سے کام لینا پڑتا ہے اور بے انتہا فوجی طاقت صَرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور دفاع پر بہ قدرِ ضرورت صَرف کیا جائے۔''(162)

اقتصادی حالات کا اثر روحانی ترقی پر

برصغیر ہندو پاک اپنی اس خصوصیت پر ہمیشہ فخر کرتا رہا ہے کہ اس کی تہذیب و سیاست کبھی مذہب اور خدا پرستی سے بیگانہ نہیں ہوئی۔

ہندوستان کے بلند مرتبہ سپوت حضرت شاہ ولی اللہ (دہلوی) رحمتہ اللہ علیہ، جن کو تاریخ نے آج تک بھلائے رکھا ہے، اس خصوصیت کے آئینہ دار ہیں۔ وہ عالمِ دین، روحانیت اور فلسفۂ اَخلاق کے بہترین ماہر ہیں، یہاں تک کہ ان کے جاننے والے اُن کو ''شاہ'' کا لقب دیتے ہیں، جو روحانی بزرگوں کو ازراہِ عقیدت دیا جاتا ہے۔ لیکن اس عالمِ دین اور روحانی پیش وا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تباہی اور بدحالی جو مذہبی نقطۂ نظر سے سوسائٹی میں پائی جاتی ہے، اس کا بڑا سبب یہی اقتصادی بحران ہے، جس نے سرزمین ہند کو پُرشور بنا رکھا ہے۔

اس مذہبی رہنما کا یہ فیصلہ برصغیر کے خاص حالات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سر بہ فلک (آسمان تک بلند) قلعوں کو مسمار کیا ہے۔ اس لیے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح، مذہبی و اَخلاقی اصلاح اور روحانی کمالات کے لیے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مذہبی بادشاہ (شاہ ولی اللہؒ) سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیا علیہم

السلام کی تعلیم کا اہم جزو قرار دیتا ہے۔ چناں چہ اپنی مشہور تصنیف **"حُجّۃُ اللّٰہ البالِغہ"** میں ذرائعِ معیشت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت یہ تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلّفات کا مرض (جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدمِ توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا) ایران اور روم وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں اِلقا کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کرے کہ نہ صرف مرض ختم ہو، بلکہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے، جس کی وَجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اسباب و وجوہات پر غور فرمایا، جن سے اس مرض کے جراثیم نشو ونما پا رہے تھے۔ پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرما دی۔" (163)

یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگر چہ کسی قدر طویل ہے، مگر موضوع کی اہمیت اس طوالت کو جائز قرار دیتی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت (یعنی ساتویں صدی عیسوی میں) ایران اور روم کی سلطنتیں عروج پر تھیں، مگر اقتصادی عدمِ توازن نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان ہی دو سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور مشاہدے کے لیے اپنے زمانے کے بادشاہوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔

برصغیر کی اقتصادی تباہ حالی اور اس کی وجوہات

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

"ایران اور روم کی سابق تاریخ ہمارے لیے واضح مثال ہے۔ جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو، اس سے ایران اور روم کی حالت کا اندازہ

کرلو۔‘‘(164)

چناں چہ ایران و روم کی تعیّشانہ حالت بیان فرماتے ہیں:

’’دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا۔ نئی نئی صنعتیں رُونما ہوئیں اور ملک اپنے اس دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجے تک پہنچ گیا، لیکن بدقسمتی سے اہلِ ثروت اور حکمران طبقے میں عیش، فیشن اور اقتدار پرستی ایک دوسرے کے مقابلے میں تفاخر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے تاج میں زیادہ جواہر ٹکے ہوئے ہیں۔ اربابِ حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلّفات نبھانے کے لیے ہر صاحبِ اقتدار اپنے ماتحتوں کو لوٹنے لگا۔ زمین دار اور جاگیردارؑ کاشت کار کا خون چوسنے لگے۔ جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے، انھوں نے غریب مزدور کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب اس بااقتدار طبقے کی تمام عملی اور فکری قوتیں ترقیٔ ملک و دولت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلّفات، نفع اندوزی اور استحصال بالجبر (زبردستی چھیننے) پر صَرف ہونے لگیں۔ اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اُٹھانے والے گھوڑوں کی مانند ہو گئی۔ زرکشی اور زراندوزی کے لیے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔

مزدور اور کسان طبقہ اگر اُن سے سرتابی کرتا (یعنی ان کی حکم عدولی کرتا) تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا۔ اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار (بوجھ اُٹھانے والے) گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا۔ یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائشِ انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقے کو حد سے بڑھے ہوئے

عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا، اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکرِ مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہو گئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

اقتصادی عدمِ توازن اور طبقۂ اعلیٰ کی شان وشوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب اور سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا، جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا۔ ان میں بہت سے صاحبِ فن اور اہلِ علم بھی ہوتے تھے۔ وہ فن و علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے، مگر ان کا مقصد ملک کی خدمت نہیں، بلکہ اپنی ذاتی اغراض و ذاتی جاہ وجلال اور ذاتی اقتدار حاصل کرنا ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فن سپاہ گری کا ماہر ہے۔ بہترین جرنیل یا کمانڈر رہے۔ کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی، جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی۔ ایک جماعت فنونِ لطیفہ و ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی (وصول کرتی) تھی کہ شانِ خسروانہ (بادشاہ کی شان) یہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

بادشاہ یا اُمرا کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمیٔ مجلس پیدا کرنا' ایک فن قرار دے دیا گیا تھا۔ اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب، درباری آداب، ایک خاص فن بن گیا اور ایک گروہ اسی نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے، جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور ان کی

خوشنودی کے لیے صَرف کرتے تھے۔ ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی تمام مخلوق دن بہ دن افلاس اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی، یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا، جس کو آخرت کی فکر ہو۔ اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، تاکہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں۔ اور معیشت کے ایسے اُصول تلقین فرمائیں، جن سے اقتصادی امراض کے زہریلے جراثیموں کا قلع قمع ہو جائے۔'' (165)

حضرت شاہ صاحبؒ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے کہ اقتصادی حالات کا روحانی اصلاحات پر کیا اثر پڑتا ہے، ایک مثال پیش فرماتے ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت شاہ صاحبؒ جس حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں، اس کا نقشہ کیا ہے؟ آپؒ فرماتے ہیں:

''ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو، شاہانہ شان وشوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو، ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو، ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہو گی کہ وہ دین وملت کے کام انجام دے سکے، اَخلاقی اور روحانی ترقی حاصل کر سکے۔ لیکن اگر اس کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمائے کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کے ہوش وحواس گم ہو جائیں گے اور وہ انسانی شرف وعظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گی، جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔'' (166)

عوام کی خوش حالی کا اُصول

مذہب کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ سونے چاندی کے انباروں سے

زیادہ خطرناک وہ طرزِ معاشرت ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کر کے غریب کے دل میں سرمایہ داری کی ہوس اور شاہ پرستی کا شوق پیدا کرتی ہے۔ سونے چاندی کے برتن، زرق برق ریشمی لباس، فیشن اور تکلّفات، دولت مندوں کے دماغوں میں کبر و غرور اور تصورِ برتری پیدا کرتے ہیں۔ ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع کی وہ خواہش پیدا کرتی ہے جو ان کو زیادہ رشوت ستانی، چوری، خیانت، استحصال بالجبر اور عصمت فروشی وغیرہ پر آمادہ کر دیتی ہے۔ غرض! سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلّفات، سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک نظام ان کی اجازت دیتا رہے گا، سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی۔ دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں جرائم کی عادت بڑھتی رہے گی۔ شاہ صاحبؒ ایک طبقے کی ایسی خوش حالی کو جو ان تکلّفات سے مرصّع (مزیّن) ہو، جس سے اقتصادی توازن بگڑے، ''رفاہیتِ بالغہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سوسائٹی کے لیے اس کو بدترین جرم اور اس کے خلاف جنگ کو مقدس جہاد قرار دیتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی تصانیف ''رفاہیتِ بالغہ'' کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ جہاد

تحریکِ شاہ ولی اللہؒ کے عملی پروگرام میں ''جہاد'' کا لفظ استعمال کیا گیا اور گزشتہ صدی میں یورپ کے اربابِ صحافت اور مصنّفین لفظ ''جہاد'' کو اس قدر بدنام کر چکے ہیں کہ ایک سنجیدہ دماغ بھی اس لفظ سے اس کے اسلامی تصور تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تشریحات کے ضمن میں جہاد کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے نظریے کی وضاحت کر دی جائے۔

جہاد کا مفہوم اور دائرۂ کار

لغت کے لحاظ سے جہاد کے معنی ہیں ''زیادہ سے زیادہ درجے کی کوشش''۔ یہ کوشش اگر ذاتی اغراض سے علاحدہ ہو کر صرف حق کی فتح اور صداقت کی سربلندی کے لیے ہو تو اس کے مبارک اور مسعود ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم ذاتی اغراض تو

در کنار، گروہی یا نسلی اَغراض کا گرد و غبار بھی دامنِ جہاد پر برداشت نہیں کرتا۔ قرآن حکیم کی رو سے ہمہ گیر حق و صداقت، انسانی شرف و عظمت اور اعلیٰ اَخلاق کے نام پر جو جدو جہد ہو، وہ اسی وقت جہاد قرار دی جا سکتی ہے، جب کہ نہ گروہی یا نسلی اقتدار کا تصور سامنے ہو اور نہ فرقہ پرستی اور دھڑے بندی کی کوئی شکل کسی فتنہ و فساد کو پیدا کر سکے۔

وہ اپنی ذاتی اغراض اور اپنے نفس کی خواہش سے یہاں تک دست بردار ہو چکا ہو کہ بہادری کی نمائش اپنے قبیلے یا خاندان کی عزت یا شہرت، سیاسی دنیا میں نام آوری یا صفحاتِ تاریخ میں تذکرے کا تصور بھی اس کے دماغ میں نہ ہو۔ اس جدوجہد (جہاد) کے وقت (بُرائی کے مرکز) ایک فریق کو شکست دے کر ختم کر دینے کا جذبہ یقیناً کارفرما ہوگا، مگر یہ جذبہ ہر قسم کی خود غرضی اور تنگ نظری سے بالکل پاک ہوگا۔ اور اس وقت ہوگا جب کہ اصلاح کی تمام کوششیں ختم ہو چکی ہوں اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی حفاظت کے لیے اس آپریشن کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا ہو۔ اس بنا پر اس جذبے کو پاک جذبہ اور اس عداوت کو مقدس عداوت کہا جائے گا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ جن مختصر اور جامع الفاظ میں ''جہاد'' کی تعریف کر رہے ہیں، وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ:

> ''ایک مقدس عداوت، جو ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات سے بالکل پاک، صرف عمومی مفاد اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد اور بلند تر مصالح کے لیے ہو، قتل کرنے یا قید کرنے کی صورت میں اس پاک عداوت کا پُرشوکت ظہور ''جہاد'' ہے۔''(167)

عداوت اور دشمنی کے ساتھ پاک کا لفظ بہت ہی اجنبی ہے، مگر جہاد کے لیے یہی اجنبی صفت لازمی شرط ہے۔ کیوں کہ اپنی جان دینے یا دوسرے کی جان لینے کے لیے کسی بھی ذاتی غرض یا کسی بھی نفسانی خواہش کی ذرّہ بھر پلیدی کی آمیزش ہو گی تو یہ جہاد نہیں، بلکہ جہالت، وحشت اور ظلم ہوگا۔ (معاذ اللہ) شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ ہے کہ جہاد کے

وقت ایک حق پرست اپنے آپ کچھ نہیں ہو گا۔ وہ جو کچھ ہو گا، مقاصدِ حق کا آلۂ کار ہو گا۔ حق و صداقت کا جو تقاضا ہو، وہ اس کی عین تمنا اور آخری آرزو ہو گی۔ اسی کی تکمیل کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہو گا۔

شاہ صاحبؒ کا عقیدہ ہے کہ خود غرض انسانوں کی اغراض پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کر کے ملک کے امن و امان، باشندگانِ ملک کے اطمینان، آرزو، کاروبار، خوش حالی، آزادیٔ رائے وغیرہ حقوقِ انسانیت اور حقوقِ شہریت پر ڈاکے ڈالنے لگے تو ایسی بے رحم، ظالم و جابر طاقت کا ختم کر دینا حق و صداقت کا تقاضا اور عدل و انصاف کا مطالبہ ہو گا۔ کیوں کہ یہ بے رحم ظالم و جابر طاقت سارے انسانوں کے لیے سرطان جیسا مرض ہے۔ ہر ایک ہمدردِ انسانیت کا فیصلہ یہی ہو گا کہ اس کا آپریشن کر دیا جائے، ورنہ ساری انسانیت موت کے گھاٹ اُتر جائے گی۔ لہٰذا ایک حق پرست کا مذہبی اور اَخلاقی فرض ہو گا کہ اس سرطان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے جان کی بازی لگا دے۔

اسلام کی تعلیم اور شاہ صاحبؒ کے عقیدے کے مطابق جہاد کا مقدس فرض پورے تقدس کے ساتھ وہی پارٹی انجام دے سکتی ہے، جس کی تربیت خاص مقاصد کے لیے خاص طور پر کی گئی ہو۔ جس کا ہر ایک فرد اپنی ذاتی اغراض ختم کر کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے زندگی وقف کر چکا ہو۔

اس موقع پر عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ جہاد کی اصل قوت ضبطِ نفس، صبر و استقامت، ذوقِ فنا اور وہ جذبہ ہے جو مصیبت کو راحت اور موت کو جامِ خوش گوار بنا دے۔

تحریکِ ولی اللّٰہی کا نصب العین؛ ہمہ گیر انقلاب

گزشتہ ابواب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے روم اور ایران کی جابرانہ شہنشاہیتوں اور ان کے ظالمانہ نظام کی وَجہ سے عوام کی اقتصادی بدحالی کی مثال میں اپنے زمانے کے نظامِ حکومت کو پیش کیا تھا اور ایسے نظام کو ختم کر دینا انبیا علیہم السلام، خصوصاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا

تھا۔ یہاں آپؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کے ایک مختصر اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ فرمالیجیے:

''تباہ حال شہر جن پر درندہ صفت انسانوں کا تسلط ہو اور اُن کو اپنی حفاظت اور دفاع کی پوری طاقت حاصل ہو، یہ (ظالم و جابر پارٹی) جسدِ انسانیت کے لیے سرطان (کینسر) ہے کہ انسان اس وقت تک تندرست نہیں ہوسکتا جب تک اس سرطان کو کاٹ کر نہ پھینک دیا جائے۔ جو طبیب بھی اس انسان کے مزاج کو درست کرنے اور اس کی صحت بحال کرنے کی طرف توجہ کرے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے اس سرطان کا پورا آپریشن کرڈالے۔ تھوڑی سی بُرائی کو عمل میں لانا جب کہ اس کا نتیجہ خیرِ کثیر اور بہت بڑی بھلائی ہو، واجب اور ضروری ہوجاتا ہے۔''(168)

فَکُّ کُلِّ نِظام؛ پروگرام

ممکن تھا کہ اس زمانے کے جنگ جُو سرداروں کی طرح شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور فوج بھرتی کر کے اِس شہر پر قبضہ کر لیتے، یا کسی جنگ جُو حکمران کے ساتھ مل کر اس کو تقویت پہنچاتے، مگر اس طرح وہ ''ہمہ گیر انقلاب'' جو پارٹی کا نصب العین تھا، پورا نہ ہوتا، بلکہ آپؒ بھی کسی حکمران کا ضمیمہ بن جاتے۔ نصب العین کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی تھی، جب رائے عامہ آپؒ کے انقلابی نظریات کو اپنا لیتی۔ اس کے لیے جنگ و جہاد سے پہلے تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ لہٰذا پارٹی کا پہلا پروگرام یہی قرار دیا گیا اور اس مقصد کے لیے ملک میں مختلف مراکز قائم کیے گئے۔

☆

www.rahimia.org

مقالہ 19

ولی اللّٰہی نظریۂ نبوت، انسانی اجتماعیت اور اقتصادیات

www.rahimia.org

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

''فتمسّ الحاجة إلٰی رجل قوی مؤیّد من الغیب، منقاد للمسئلة الکلّیة لیغیّر رسومهم إلٰی الحقّ بتدبیر لا یهتدی لهٗ فی الأکثر إلّا المؤیّدون من الرّوح القدس ...

فاعلم! أنّ أصل بعثة الأنبیاء و إن کان لتعلیم وجوه العبادات أوّلاً و بالذّات، لٰکنّهٗ قد تنضمّ مع ذٰلک إرادة إخمال الرّسوم الفاسدة، و الحثّ علٰی وجوه من الارتفاقات.'' [169]

(ایسی صورت میں ایک ایسے مضبوط آدمی کی ضرورت پیش آتی ہے، جسے غیب سے اللہ کی تائید حاصل ہو۔ وہ مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھے، تا کہ فاسد معاشرے میں موجود غلط رسومات اور نظام کو تبدیل کرے۔ وہ ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ عام طور پر روح القدس (جبرائیل امینؑ) کی رہنمائی کے بغیر عدل و انصاف اور حق کا نظام بنانا ممکن نہیں ہوتا۔

اگر تم نے ان تمام باتوں کا علمی طور پر پورا احاطہ کرلیا تو یہ بات اچھی طرح جان لو کہ انبیا علیہم السلام کی سب سے پہلے اور اصل بعثت اگرچہ عبادات کے طریقوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہوتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کا ارادہ رسوماتِ فاسدہ کو ختم کرنے اور لوگوں کو ارتفاقات درست طور پر قائم کرنے کے لیے اُبھارنے کا بھی ہوتا ہے۔)

ولی اللّٰہی نظریۂ نبوت، انسانی اجتماعیت اور اقتصادیات

شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کے فلسفے کے اساسی اُصول پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''حُجّۃُ اللّٰہ البالِغہ'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک انبیا علیہم السلام کی تعلیمات نے جس طرح انسان کی باطنی استعدادوں کے تزکیے اور ان کی اصلاح کے بعد اسے اس قابل بنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیدار) کا اہل ہوسکے، اسی طرح انھوں نے تہذیبِ جوارح (اعضائے انسانی کے شرعی اعمال) اور ارتفاقات کی درستگی کا فرض بھی ادا کیا۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ نبوت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے میں نبوت کا مقصد انسان کی پوری زندگی کی اصلاح اور تہذیب ہے اور نبوت ''حسنۃً فی الدّنیا '' اور ''حسنۃً فی الآخرۃ'' (دنیا و آخرت کی بھلائی) دونوں پر حاوی اور دونوں کی نگران ہے۔ (چناں چہ شاہ صاحبؒ ''حُجّۃُ اللّٰہ البالِغہ'' میں ''باب إقامۃ الارتفاقات و إصلاح الرّسوم'' کے تحت ''إقامۃ الارتفاقات و إخمال الرّسوم من مقاصد النّبوّۃ'' (نبوت کے مقاصد میں ارتفاقات کا صحیح نظام قائم کرنا اور فاسد نظام کی رسومات کو ختم کرنا) کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ اس باب میں شاہ صاحبؒ ''حُجّۃُ اللّٰہ البالِغہ'' کے گزشتہ تمام ابواب کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے درجِ ذیل چار نکات واضح کرتے ہیں۔ پھر نبوت کی ضرورت اور اس کے مقاصد بیان کرتے ہیں:

1۔ انسان جبلی اور فطری طور پر ارتفاقِ ثانی اور ارتفاقِ ثالث پر پیدا کیا گیا ہے۔

اسی وَجہ سے انسان باقی تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ یہ بات محال ہے کہ انسان ان دونوں ارتفاقات کو سِرے سے چھوڑ دیں، یا انھیں بے کار بنائیں۔

2۔ ان دونوں ارتفاقات سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لیے انسانوں کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے، جو معاشرے کی حکمتوں اور انسانی ضروریات کو سمجھنے اور جاننے والا ہو اور انھیں پورا کرنے کے ارتفاقات کو بھی جانتا ہو۔ نیز وہ مصلحتِ کلیہ (مفادِ عامہ) کے تابع بھی ہو۔ ایسا رہنما یا تو اپنے غور و فکر اور سوچ و بچار سے ان ارتفاقات کا حل کرے، یا وہ ایسا فرد ہو کہ جس کی قوتِ ملکیہ (روحانی قوت) پر فطری طور پر ملاءِ اعلیٰ (فرشتوں اور مقربین کی اعلیٰ مجلس) کے علوم نازل ہوتے ہوں۔ ملاءِ اعلیٰ سے حاصل ہونے والے علوم سے ارتفاقات سے متعلق مسائل حل کرنے کا طریقہ زیادہ کامل اور زیادہ بااعتماد ہے۔

3۔ انسانی معاشرے میں چاروں ارتفاقات کے عملی طور طریقے اور رسومات کی وہی حیثیت ہے، جو انسانی جسم میں دل کی ہے۔

4۔ بسا اوقات انسانی معاشرے میں مفادِ عامہ کی عقلِ کلی نہ رکھنے والے لوگوں کی حکمرانی کی وَجہ سے ملکی نظام اور رسومات میں بہت سے مفاسد پیدا ہوجاتے ہیں۔ چناں چہ وہ درندگی، جنسی شہوت اور شیطانی اعمال اور طور طریقے اختیار کرلیتے ہیں۔ پھر اکثر لوگ اُن کی پیروی کرتے ہیں۔ نیز دیگر وجوہات سے بھی معاشروں میں مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

ایسی صورت میں ایک ایسے مضبوط آدمی کی ضرورت پیش آتی ہے، جسے غیب سے اللہ کی تائید حاصل ہو۔ وہ مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھے، تاکہ فاسد معاشرے میں موجود غلط رسومات اور نظام کو تبدیل کرے۔ وہ ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ عام طور پر روح القدس (جبرائیل امینؑ) کی رہنمائی کے بغیر عدل و انصاف اور حق پر مبنی نظام بنانا ممکن نہیں ہوتا۔

اگر تم نے ان تمام باتوں کا علمی طور پر پورا احاطہ کرلیا تو یہ بات اچھی طرح جان لو کہ انبیا علیہم السلام کی سب سے پہلے اور اصل بعثت اگرچہ عبادات کے طریقوں کی تعلیم و

تربیت کے لیے ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کا ارادہ ارتفاقات کی رسوماتِ فاسدہ کا خاتمہ اور لوگوں کو انھیں درست طور پر قائم کرنے کے لیے اُبھارنے کا بھی ہوتا ہے۔)(170)

اس طرح شاہ صاحبؒ نے اپنے فلسفے کے تناظر میں عقلی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ انسانی معاشروں کی ترقی کے لیے انبیا علیہم السلام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے صرف آخرت سے متعلق لطائفِ انسانی کی تہذیب کے لیے ہی رہنمائی نہیں دی، بلکہ اُن کے مقاصد میں دنیا سے متعلق امور میں انسان کے ''لطیفۂ جوارح'' کی تہذیب بھی شامل ہے۔ اس طرح دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے عقلی طور پر انبیاؑ کی ضرورت ثابت کی ہے۔

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایک دوسری جگہ پر بھی نبوت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''إعلم! أنّ النّبوّةَ من تحت الفطرة، و كما أنّ الإنسان قد يدخل في صميم قلبهٖ و جذر نفسهٖ علوم و إدراكات .... كذٰلك كُلّ قوم و أقليم لهم فطرة فطروا عليها، ليبتنى عليها اُمورهم كُلّها ... فإنّما يجيء النّبيء يتأمّل فيما عندهم من الاعتقاد و العمل، فما كان منها موافقاً لتهذيب النّفس يثبتهٗ لهم، و يرشدهم إليه. و ما كان يخالف تهذيب النّفس، فإنّهٗ ينها هم عنهُ ... فالنّبوّة بمنزلة تسوية الشّيء و تهذيبهٖ و جعلهٖ كأحسن ما ينبغي. (171)

(جاننا چاہیے کہ نبوت فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسا کہ انسان کے دل کی گہرائی میں اور اُس کے نفس میں علوم و ادراکات آتے ہیں، ایسے ہی ہر قوم اور ملک کی بھی ایک فطرت ہوتی ہے، جس پر فطری طور پر وہ پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے تمام اُمور اُسی فطرت کی بنیاد پر اُستوار ہوتے ہیں۔

جب نبی کسی قوم کی طرف آتے ہیں تو اُن کے اعتقادات اور اعمال میں فطری طور پر جو کچھ ہوتا ہے، اُس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ پس اُن میں سے جو اُن کے نفس کی تہذیب کے مطابق ہوتا ہے، اُسے اُن کے لیے باقی رکھتے ہیں

www.rahimia.org

اور انھیں اُس کے کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور جو تہذیبِ نفس کے خلاف عقائد واعمال ہوتے ہیں، اُن سے انھیں روکتے ہیں۔

پس نبوت کا کام کسی شئے کو درست کرنے اور مہذب بنانے کی مانند ہے۔ اور اُسے مناسب طور پر خوب صورت بنانا ہے۔)

علامہ ابنِ خلدونؒ کا نظریۂ نبوت

نبوت کی اگر یہ تعریف سمجھ میں آ جائے تو نبوت کے متعلق ابنِ خلدونؒ نے جو نظریہ پیش کیا ہے، اس کا غیر صحیح ہونا صاف نظر آ جائے گا۔ ابنِ خلدونؒ کی رائے یہ ہے کہ انسان کو نبوت کی ضرورت فقط اس زندگی کے بعد جو آخرت کی زندگی ہے، اس کے امور معلوم کرنے کے لیے پڑتی ہے۔ جہاں تک اس دنیا کی معیشت کا تعلق ہے، انسان اپنے ان معاشی نظاموں کے لیے نبوت کا محتاج نہیں۔ (چناں چہ انھوں نے ''تاریخ ابنِ خلدون'' کے مقدمے کے اوّلین باب میں پہلا مقدمہ ہی یہ قائم کیا ہے کہ:

''لوگوں کو ایک ایسا حکمران چاہیے، جسے اُن پر غلبہ، حکومت اور طاقت وقوت حاصل ہو، تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرسکے۔ کسی ملک کے قائم ہونے کا یہی مطلب ہے۔ اس سے تمھارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ مملکت کا قائم کرنا انسان کا طبیعی خاصہ ہے۔ حکما نے ذکر کیا ہے کہ بعض جانوروں میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو اپنا سربراہ بنا لیتے ہیں، جو اپنی جسمانی تخلیق اور طاقت وقوت کی وَجہ سے اُن کا نظم ونسق قائم کرتا ہے۔ جیسا کہ شہد کی مکھی اور ٹڈی دل کا سربراہ ہوتا ہے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوق میں ایسا فطری تقاضے سے ہوتا ہے۔ وہ کسی غور وتدبر اور سیاسی تقاضے سے نہیں ہوتا۔...

اس عقلی بُرہان پر فلاسفہ نے مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس دلیلِ عقلی سے نبوت کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ نبوت بھی انسانیت کا طبیعی خاصہ ہے۔ وہ اس دلیلِ عقلی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسانیت کی ترقی کے لیے ایک قطعی حکم کی ضرورت ہے۔ وہ حکم شرعی فریضے کی صورت میں اللہ کی طرف

سے ایک انسان (نبی) پر نازل ہوتا ہے۔ وہ انسان دیگر تمام لوگوں سے اس حوالے سے ممتاز ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُس میں رہنمائی دینے کے ایسے خواص رکھے ہوتے ہیں، جس سے لوگ اُسے قبول اور تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کا حکم لوگوں میں مکمل طور پر غالب آ جاتا ہے اور بغیر کسی کے انکار اور اُس میں کمی کے، وہ لوگوں پر نافذ ہو جاتا ہے۔

فلاسفہ اور حکما کی یہ بات جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ منطقی طور پر غیر عقلی ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کا وجود اور اُن کی زندگی نبوت کے بغیر بھی مکمل ہوتی ہے۔ چناں چہ کوئی حکمران از خود یا لوگوں پر اقتدار رکھنے والی غالب اجتماعی عصبیت کی طاقت سے کوئی حکم جاری کرے تو وہ نافذ العمل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں اہلِ کتاب اور انبیاؑ کی اتباع کرنے والے تھوڑے ہیں اور کوئی کتاب نہ رکھنے والے مجوسی پوری دنیا میں اکثریت میں ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ نہ صرف نبوت کو تسلیم نہ کرنے والوں کا وجود قائم ہے، بلکہ اُنھیں حکومتوں اور ممالک کی طاقت بھی حاصل ہے۔ آج اس زمانے میں بھی شمال اور جنوب میں اُن کی حکومتیں کسی نہ کسی صورت میں قائم ہیں۔“ (172)

علامہ ابن خلدونؒ آخر میں مزید لکھتے ہیں کہ:

”و بھٰذا یتبیّن لک غلطھم فی وجوب النّبوّات، و أنّہٗ لیس بعقلیّ، و إنّما مدرکۂ الشّرع کما ھو مذھب السّلف من الامّۃ.“ (173)

(اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عقلی طور پر نبوتوں کو واجب قرار دینے والے فلاسفہ کی بات غلط ہے۔ اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ نبوت عقلی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت اور ادراک صرف شریعت سے ہے، جیسا کہ اُمت کے گزشتہ لوگوں کا مذہب ہے۔)

ابن خلدونؒ کے اس نظریے کے عربوں کی ذہنیت پر بُرے اثرات

نبوت کے متعلق ابنِ خلدونؒ کے اس نظریے نے عربوں کی ذہنیت پر بہت بُرا اثر

ڈالا ہے۔ عرب ابنِ خلدونؒ سے بڑھ کر اپنے ہاں کوئی اَور حکیم نہیں پاتے اور ابنِ خلدونؒ کا یہ حال ہے کہ وہ نبوت کو محض آخرت کی گتھیاں سلجھانے کے لیے وقف مانتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیاوی ترقی کے لیے انبیاؑ کی ضرورت ہی نہیں۔ (ابنِ خلدونؒ کا کہنا ہے کہ:

"مقصود الشّارع بالنّاس صلاح آخرتهم" (174) (نبوت کا کام صرف اس زندگی کے بعد کے مسئلوں کو ہی حل کرنا تھا۔)

لامحالہ ابنِ خلدونؒ کا یہ فکر انسان کو دنیا کے معاملات میں انبیاؑ کی تعلیمات سے مستغنی کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ افراد اور قوم کے حق میں کبھی خوش آئند نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ نبوت کو صرف امورِ اُخروی کا مُداوا سمجھنے سے یہ ہوا ہے کہ آج کے عرب دنیاوی امور کو حل کرنے کے لیے بہ آسانی یورپی حکما کے افکار اور ان کے پروپیگنڈے کے شکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن شاہ صاحبؒ نے نبوت کی جو تشریح کی ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی حکمت پڑھنے والا اِس مصیبت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

انسانی اَخلاقیات اور اقتصادیات کا باہمی تعلق

شاہ صاحبؒ نے انسان کے اعضائے رئیسہ کے ابتدائی لطائف (نفس، قلب اور عقل) کے بعد اس میں "لطیفۂ جوارح" (انسانی اعضا) بھی مانا ہے۔ اس "لطیفۂ جوارح" کو انسانی زندگی کی بنیاد قرار دینے سے شاہ صاحبؒ نے ایک اور اہم مشکل کو بھی حل کر دیا ہے۔ عام طور پر تصوف اور فلسفے کی ابتدا اَخلاق سے کی جاتی ہے۔ گو انسان کی حیوانی زندگی کے لیے اقتصادی ضروریات بے شک ضروری مانی جاتی ہیں، لیکن انسانیت کی اعلیٰ زندگی کا — جو تصوف اور فلسفہ کا موضوع ہے — اقتصادی ضروریات کے ساتھ براہِ راست تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ انسانی زندگی کو اس طرح سمجھنے کا اثر یہ ہوا کہ ہماری سیاست بالکل کھوکھلی ہوگئی ہے۔ ہمارے ہاں کے عقل مند اور وہ لوگ جو زیادہ بااَخلاق مانے جاتے ہیں، سیاسی سرگرمیوں سے الگ رہنا انسانیت کا کمال سمجھتے ہیں۔ چناں چہ ان کے نزدیک سیاست، جو زندگی کے روزمرہ کے کاموں کو سلجھانا اپنا مقصد قرار دیتی ہے، ایک ادنیٰ اور ناقابلِ التفات چیز ہے۔

اس کے برعکس شاہ صاحبؒ نے "حُجّةُ اللّٰه البالِغه" میں متعدد مواقع پر اس امر

کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی اَخلاقی زندگی کا دارومدار بہت حد تک اس کی اقتصادی زندگی کے حُسنِ انتظام پر ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

’’انسانیت کے اجتماعی اَخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لیے کام کریں۔ جب کبھی انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس مصیبت سے نجات دینے کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نکالتا ہے۔ اور اس کا اپنے کسی بندے کو الہام بھی کرتا ہے۔ فرعون کی ہلاکت، قیصر وکسریٰ کی تباہی اِسی اُصول پر نبوت کے لوازم میں سے شمار ہوتی ہے۔‘‘(175)

اقتصادی ضروریات پوری ہونے سے ہی روحانیت ترقی کرتی ہے

اگر انسانی زندگی کو اس کی اقتصادی ضروریات سے لے کر اس کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل تک ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھی جائیں تو اس انسانی زندگی کے لیے جو بھی فلسفہ بنے گا، وہ مکمل ہوگا۔ اور تمام زندگی کو بہ حیثیتِ مجموعی ایک سمجھ کر اس کے لیے نظام مرتب کرے گا۔ اس لیے انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا اقتصادی نظام ہونا چاہیے، جو اس کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرے۔ چناں چہ جب انسان اپنی حیوانی زندگی کی ضروریات سے مطمئن ہوں گے اور ان کے پاس روٹی کپڑے کے دھندوں سے کچھ فاضل وقت بچے گا تو پھر کہیں وہ اپنی اعلیٰ تر استعدادوں اور دوسرے بلند لطائف کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو سکیں گے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اگر یہ کہا جائے کہ: ’’جو نظامِ فکر یا فلسفہ؛ اقتصادی زندگی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرتا ہے، وہ فلسفہ نہ تو مکمل ہے اور نہ صحیح‘‘ تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

اقتصادی مصیبت سے نجات؛ نبوت کا ایک مقصد

انسانیت جب کبھی اس قسم کی اقتصادی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اس کو نجات دینے کے لیے کبھی تو انبیاؑ کے ذریعے الہامِ خداوندی صورت پذیر ہوتا ہے اور کبھی یہ الہام کسی صدیق اور حکیم کو اپنے اظہار کا واسطہ بناتا ہے۔ چناں چہ ان کی کوششوں سے جب

اجتماعِ انسانی کا یہ اقتصادی نظام درست ہو جاتا ہے، تب کہیں جا کر انسانیت کے سامنے اپنے اَخلاق کی تکمیل کے لیے راستہ کھلتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں اگر انسان کے اَخلاق اس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچیں تو مرنے کے بعد اس کو قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات مل جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیات بعد الموت میں انسان کا جنت کی نعمتوں سے مستفید ہونا‘ دراصل اسی تکمیلِ اَخلاق کا نتیجہ ہے، جو انسان دنیا کی اس زندگی میں کرتا ہے۔

اب حیاتِ انسانی کا ایک درجہ تو دنیا کی یہ زندگی ہے۔ انسان اس میں اپنے اَخلاق کی تکمیل کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر موت کی راہ طے کر کے جنت میں پہنچتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی ترقی کا قدم رُک نہیں جاتا، وہ اَور آگے بڑھتا ہے اور زندگی کے تیسرے درجے میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں اسے ’’رؤیتِ ربّ العالَمین‘‘ (تجلّیٔ الٰہی کا دیدار) کی سعادتِ کبریٰ سے سرفراز ہونے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔

شاہ صاحبؒ کے فکر کی جامعیت اور عالم گیریت

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انسانی زندگی کی ابتدا سے لے کر اس کے آخری درجے تک شاہ صاحبؒ کی اس حکمت کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ شاہ صاحبؒ کا نظامِ فکر اتنا جامع، عالم گیر اور ہمہ گیر ہے کہ وہ انسان کی ابتدائی ضروریات — جنھیں ہم حیوانی زندگی کے لوازم کہتے ہیں — سے لے کر انسانیت کی ترقی کی آخری اور ارفع ترین منزل تک جتنے ارتقائی مراحل اور مقامات ہیں، ان سب کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔

اب اگر اس نظامِ فکر کی اساس؛ نبوت کو مان لیا جائے اور جہاں نبوت نہ ہو، وہاں انبیاؑ کے پیروکاروں میں سے ’’صدیق‘‘ اور ’’حکیم‘‘ یہ کام کریں تو اس تشریح کے بعد نبوت‘ انسانیت کے لیے کس قدر فطری چیز بن جاتی ہے۔ اور جیسا کہ عام طور پر غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔ پھر نبوت کی تعلیم صحیح معنوں میں ’’حسنۃً فی الدّنیا‘‘ اور ’’حسنۃً فی الآخرۃ‘‘ کی حامل بھی بن جاتی ہے۔ یہ ہے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حکمت اور ان کے فلسفے کی روح، جس کا ہم نے تعارف کرایا ہے۔ o..o..o

www.rahimia.org

مقالہ 20

باشعور اور اہل انقلابی قیادت کی عصری اہمیت

www.rahimia.org

اہل قیادت کی خصوصیات

ارشادِ خداوندی ہے:

''اور (مصر کے) بادشاہ نے کہا: لے آؤ اس (حضرت یوسفؑ) کو میرے پاس، میں خالص کر رکھوں گا اس کو اپنے کام میں۔ پھر جب بات چیت کی اس سے، کہا: واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس جگہ پائی معتبر ہو کر۔ یوسف نے کہا: مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر، میں نگہبان ہوں خوب جاننے والا۔''[176]

نا اہل قیادت سے متعلق ارشادِ نبویؐ

''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں ہمارے درمیان تشریف فرما تھے اور لوگوں سے گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک دیہاتی آیا اور اُس نے سوال کیا:

''متیٰ السّاعة؟'' (قیامت کب آئے گی؟)...

آپؐ نے فرمایا: ''فإذا ضُیّعت الأمانة، فانتظرِ السّاعة.''

(جب امانتیں ضائع ہونے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو۔)

اُس نے پوچھا کہ: ''کیف إضاعتها؟'' (وہ کیسے ضائع ہوتی ہیں؟)

آپؐ نے فرمایا:

''إذا وُسِّد الأمر إلٰی غیر أهلهٖ، فانتظر السّاعة.''[177]

(جب معاملات نا اہلوں کے سپرد ہو جائیں تو قیامت کا انتظار کرو۔)''

باشعور اور اہل انقلابی قیادت کی عصری اہمیت

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ''التّمہید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

مَیں (آخر اکتوبر 1923ء میں) استنبول آیا۔ وہاں تقریباً تین سال رہا۔ اس دوران خلافتِ عثمانیہ کی تاریخ کے مطالعے میں مشغول رہا۔ خاص طور پر (خلیفۂ عثمانی) سلطان عبدالعزیز خان شہید کے زمانے (1861ء تا 1876ء) سے ''اتحادِ اسلام'' کی تحریک سے متعلق ابتدائی اُمور کا میں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔

ہمارے دیوبندی مشائخ (حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ اور اُن کے ساتھیوں) نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد حجازِ مقدس میں پناہ لی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے کاموں کے لیے مرکز بنا لیا تھا۔ ان حضرات کا حکومتِ استنبول سے تھوڑا بہت تعلق باقی رہ گیا تھا۔ میں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اس سلسلے میں بہت سی روایات اور حکایات سنی تھیں۔ پھر بعد میں ہم نے اس کا اثر دارالعلوم سے شائع ہونے والے رسائل میں نہیں دیکھا۔

تُرکوں اور عربوں کا باہمی اختلاف

مجھے ہمیشہ سے یہ شوق رہا کہ معاملات کی گہرائی میں جا کر جائزہ لوں، تا کہ باہم برسرِ پیکار جماعتوں کے دعوؤں کے ذیل میں چھپی حقیقت کا سراغ لگایا جاسکے۔

مجھے اس وقت بڑا افسوس ہوا، جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوئی کہ عربوں اور ترکوں کے درمیان باہمی اختلاف اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس میں خیر کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ پھر اس وقت مجھے مزید جھٹکا لگا، جب میرے سامنے یہ حقیقت کھلی کہ سیّد

جمال الدین افغانی (1838ء تا 1897ء) ''خلافتِ عثمانیہ'' کے خاتمے کی بنیاد پر ''خلافتِ عربیہ'' قائم کرنے کے بڑے داعیوں میں سے ایک تھے۔ نیز مجھ پر یہ بھی واضح ہوا کہ برطانوی لیڈروں کی نظر میں مشرقی مسئلے کی کچھ حیثیت نہیں ہے۔ میں نے اس سلسلے سے متعلق ان کے (دیے گئے بیانات میں) اشاروں اور کنایوں کو خوب اچھی طرح سمجھا۔

مسلمان معاشروں کے فرسودہ طبقات

اس مطالعے کے نتیجے میں میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ خلافتِ عثمانیہ میں ''جمہوریت'' اور ''قومی آزادی'' کے نام پر مسلمانوں کو اپنے سیاسی ارتقا کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ کابل میں (خلافتِ عثمانیہ کے وزیراعظم) مِدحت پاشا (1822ء تا 1883ء) کے بیٹے علی حیدر کی لکھی ہوئی اس کی سوانح عمری اور مصری لیڈر فرید بک کی کتاب ''تاریخِ دولتِ عثمانیہ'' پڑھنے کے بعد ''جمعیت اتحاد و ترقی'' کے ارتقا اور پھیلاؤ کے بارے میں مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ چناں چہ عصری تعلیم کے بانی ہندوستانی لیڈر سر سیّد احمد خان کے نظریات و خیالات اور عثمانی لیڈر صدر اعظم مدحت پاشا کی زندگی میں مَیں کوئی خاص فرق تلاش نہ کر سکا۔

مسلمان معاشروں کی نااہل قیادت

اپنے مطالعے سے مَیں اس تجزیے تک بھی پہنچا کہ مسلمان معاشروں میں جو کچھ اجتماعی طاقت باقی ہے، وہ بادشاہوں کی وراثت کے علاوہ اَور کچھ نہیں ہے۔ اس سے میری مراد وہ تمام طبقات ہیں، جن میں کچھ تو عیاش اور مفاد پرست حکمران طبقے اور مال دار جماعتیں ہیں، اور کچھ ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے گمراہ کرنے والے علما اور حیلہ ساز انقلابی لیڈر ہیں، جن میں دورِ حاضر کی سیاست کی سمجھ بوجھ اور اس کا مزاج قطعاً موجود نہیں ہے۔ چناں چہ میرا تجزیہ ہے کہ:

☆ بادشاہوں کی وراثت پر مبنی اس زوال پذیر قوت پر اعتماد کرنا،

☆ ''دین'' اور ''قوم'' کے نام پر اس وراثت کی حفاظت کی کوشش کرنا،

☆ ''جمہوریت'' یا ''بادشاہت'' کے نام سے کسی خاندان کی حکومت قائم کرنا،
☆ ان کے کسی ایک فرد کو ملتِ اسلامیہ کے کمانے والے طبقات پر زبردستی حکمران بنانا،
☆ ملتِ اسلامیہ کی اصلاح اور ترقی کو ان حکمرانوں کی اصلاح اور ترقی سے وابستہ کرنا،
سوائے اپنے آپ کو دھوکہ دینے اور جہالت کو قبول کرنے کے اَور کچھ نہیں۔

انقلابی اصولوں پر کام کرنے کی اہمیت

اس مطالعے اور تجزیے سے مجھے اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ انقلابی اصولوں کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیں۔ یہ کام بے شک فوری نہ ہوسکے، بلکہ ہر ایک ملک میں جدوجہد کی نوعیت اور اس کے درجات میں فرق کی وَجہ سے اگرچہ کچھ زمانے کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔لیکن یہ بات طے ہے کہ نجات کا واحد راستہ انقلابی اصولوں کے اپنانے میں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اہل علم علما میں سے سوائے حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے اَور کوئی ایسا عالم نہیں ہے کہ جس کی پیروی اس جیسے عظیم (انقلابی) کام کے سرانجام دینے کے سلسلے میں کی جائے۔

انقلابی پروگرام کی ترتیب اور اس کی اشاعت

اس تجزیے کے بعد میرے لیے یہ آسان ہوگیا کہ ہندوستانی انقلابی جماعت کے نام سے ایک ''سرور اجی'' (عوامی) سیاسی پروگرام مرتب کرسکوں۔ ہمارے نزدیک ہندوستان کی حکومت جمہوریت کے سوا کسی اَور نظریے پر قائم نہیں ہونی چاہیے۔ یہ جمہوری حکومت بھی عدمِ مرکزیت کے اصول پر کام کرے۔ اس لیے کہ پورا ہندوستان ایک ملک نہیں ہے، بلکہ وہ یورپ کی طرح ایک ایسے خطے کا نام ہے، جو کئی ممالک کا مجموعہ ہے۔ اس میں لسانی اور تہذیبی شناختیں رکھنے والی بہت سی اقوام رہتی ہیں۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایسا نیا اجتماعی اور اقتصادی نظام تشکیل دیا جائے، جس میں:

1۔ تمام معاشی معاملات سود سے قطعاً پاک ہونے چاہئیں۔

2۔ زمینوں کو افراد کی ملکیت کے بجائے اقوام کے لیے وقف کر دیا جائے۔

اس طرح یہ ممکن ہوگا کہ اس پروگرام کی مشرقی ممالک، خاص طور پر مسلمان ملکوں کے ساتھ مطابقت پیدا ہو جائے۔

زمینوں کو وقف کرنے کے دلائل

اقوام کے لیے زمینوں کو وقف کر دینے کے حوالے سے ہم نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کی بنیاد امیرالمؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ہے۔ تمام صحابہ کرامؓ نے اس پر اجماع کیا ہے۔ ہم یہاں امام ولی اللہ دہلویؒ کی تحریر کے متعلقہ حصے درج کرتے ہیں، تاکہ اہلِ علم حضرات کو اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے افکار سے پوری آگاہی ہو سکے۔ یہ معاملہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم (کی اکثریت) پر کسی طرح بھی شک وشبہ کا سبب نہ بنے۔ امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''**إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء**'' میں حضرت عمر فاروقؓ کے فقہی اجتہادات پر مبنی ایک کتاب ''**فقهِ عمر**'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کے ''**باب قسمة الفىء**'' میں تحریر فرماتے ہیں:

زمینوں کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت

حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کے بارے میں بھی مشاورت کی۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نے مہاجرین اوّلین سے مشورہ کیا تو ان میں بھی اختلاف ہوگیا۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کی رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے، جب کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کی رائے وہ تھی جو حضرت عمرؓ کی رائے تھی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دس انصاری صحابہؓ کو پیغام دے کر اپنے پاس بلوا بھیجا۔ جن میں سے پانچ قبیلہ اوس کے تھے اور پانچ قبیلہ خزرج کے تھے۔ اس طرح آپؓ نے ان کے بڑے بڑے رہنماؤں اور معززین کو مشاورت کے لیے بلا لیا۔

زمینوں کو وقف کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے دلائل

جب تمام صحابہؓ جمع ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اللہ کی حمد وثنا بیان کی۔

پھر ارشاد فرمایا کہ:

''میں نے تم کو اس لیے بلوایا ہے کہ تم لوگ میری خلافت کی اس امانت میں شریک ہو، جو تمھارے امور کی انجام دہی کے لیے میرے سپرد کی گئی ہے۔ میں تمھارے میں سے کسی ایک آدمی کی طرح کا ایک فرد ہوں۔ آج کے دن تم حق پر قائم رہو۔ جو میری مخالفت کرنا چاہے، وہ کھل کر مخالفت کرے۔ جو میری موافقت کرنا چاہے تو کھل کر موافقت کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کی اتباع اور پیروی کرو۔ تمھارے پاس اللہ کی کتاب ہے، جو حق کے اصولوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ اللہ کی قسم اس پر کہ اپنی زبان سے میں ایسی بات کہوں کہ جس سے میرا ارادہ کچھ اور ہو۔ ایسا نہیں، بلکہ میرا ارادہ سوائے حق کے اور کچھ نہیں۔''

تمام لوگوں نے کہا کہ:

''اے امیر المؤمنین! ہم آپ کی بات اچھی طرح سنیں گے۔''

اس پر حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا:

''تم نے ان لوگوں کی بات سن لی ہوگی، جن کا یہ خیال ہے کہ میں ان کے حقوق پر ظلم کر رہا ہوں۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ظلم کو جائز سمجھوں۔ اگر میں ان پر کسی ایسی چیز کے بارے میں ظلم کروں جو اُن کی ہو، اور وہ ان کے علاوہ کسی اور کو عطا کروں تو بے شک میں بدبخت ہوں۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسریٰ (ایران) کی زمین کے فتح ہونے کے بعد اب کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ اللہ نے ہمیں ان کا مال، ان کی زمین اور ان کے متعلقہ چیزیں بطورِ مالِ غنیمت کے عطا کی ہیں۔ پس جو مال بھی مجھے ملا، میں نے اُسے تقسیم کر دیا۔ ان کو اس کا وارث بنا دیا۔ البتہ میں نے اس کا خُمس (20 فی صد) لے لیا۔ میں نے اس کو مصارف (اہلِ قرابت یتیم بچے، مساکین اور مسافرین) کے مطابق خرچ کر دیا۔ ابھی تک میں اسی کو درست کرنے میں لگا ہوا ہوں۔

اس کے بعد میں نے یہ دیکھا کہ زمینوں کو کاشت کاروں سمیت روک

لوں۔ ان پر خراج اور ٹیکس لگا دوں اور ان لوگوں پر اتنا جزیہ (تحفظ ٹیکس) لگا دوں، جو وہ آسانی سے ادا کرسکیں۔ اس طرح یہ مسلمانوں کے لیے ایک مستقل ذریعۂ آمدنی ہو جائے گا۔ جو تمام مسلمانوں کی اولاد اور مجاہدین کے لیے ہوگا، بلکہ بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے بھی ہوگا۔

کیا تم ان سرحدوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے لیے مردوں کی ایک فوج کی ضرورت ہے، جو ہر وقت اس کی حفاظت کرے۔ کیا تم ان بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کو نہیں دیکھتے: جیسے شام، الجزائر، کوفہ، بصرہ، مصر وغیرہ کہ جن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لشکروں کی ضرورت ہے۔ نیز وہاں کے لوگوں میں مال تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر میں یہ زمینیں اور ان کی متعلقہ چیزیں آج ان میں تقسیم کردوں تو پھر باقی تمام کے لیے میں کہاں سے مال لاؤں گا؟"

زمینوں سے متعلق صحابہ کرامؓ کا متفقہ فیصلہ

حضرت عمرؓ کے دلائل سن کر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اَجمعین نے کہا کہ:

"ہماری رائے وہی ہے جو آپ کی رائے ہے۔ آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ اور بہت اچھی رائے دی۔ واقعی اگر فوجوں کے ذریعے سے ان سرحدوں کی حفاظت نہ کی گئی اور ان شہروں میں فوجوں کو بھیجا نہ گیا اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مال نہ بھیجا گیا کہ جس سے وہ قوت حاصل کریں۔ ایسی صورت میں یہ سارے شہر اہل کفر کی طرف لوٹ جائیں گے۔"

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

"اب میرے لیے معاملہ پوری طرح واضح ہوگیا۔"(178)

زمینوں کے وقف کے سلسلے میں فقہاؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا:

”زمینوں کو فاتحین میں تقسیم نہ کرنے کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ایسی رائے قائم کرنا اور اس کی دلیل کے طور پر اللہ کی کتاب میں سے آیات پیش کرنا' یہ اللہ کی جانب سے ان کو بڑی توفیق دی گئی۔ اس میں تمام مسلمانوں کے لیے بڑی بھلائی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ٹیکس جمع کرنے کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اور اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، یہ بھی مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے لیے عمومی نفع کا سبب بنا۔ اس لیے کہ اگر یہ زمینیں لوگوں کو عطیات دینے اور ان کے کھانے پینے کے بندوبست کے لیے وقف نہ کی جاتیں تو سرحدوں کی حفاظت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اور نہ ہی جہاد کے لیے لشکروں کی تیاری کرنا ممکن ہوتا۔ اور جب جہاد کرنے والے لوگوں سے شہر خالی ہوجاتے اور ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہوتا تو کافروں کو اپنے شہروں کی طرف لوٹنے سے روکنا ممکن نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ خیر کے کاموں کو زیادہ جانتا ہے، جو وہ کرتا ہے۔“

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

”ایرانیوں اور رومیوں نے زمینوں کے (کاشت کار) مالکوں پر زبرستی قبضہ کیا ہوا تھا۔ وہ ان سے ٹیکس لیتے تھے۔ جب کہ یہ ایرانی اور رومی ان زمینوں اور کاشت کاروں کے خود مالک نہ تھے۔ اور نہ ان کے آباؤ اجداد میں اس کی وراثت چلی آتی تھی۔ مسلمانوں نے آکر ان زبردستی قبضہ رکھنے والے ایرانیوں اور رومیوں کے ساتھ لڑائی کی۔ ان کو شام اور عراق کی زمینوں سے دور دھکیل دیا۔

جہاں تک زمین کے مالکان اور کاشت کاروں کا تعلق ہے تو وہ اپنی زمینوں کو کاشت کرتے تھے اور اس پر رہائش پذیر تھے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے زمانے سے وراثت کے طور پر ان زمینوں میں کام کرتے چلے آرہے تھے۔ ان کی اکثریت نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کر لی اور (طے شدہ) خراج دینا اپنے

اوپر لازم قرار دے دیا۔

ان میں سے بعض لوگوں نے رومیوں اور فارسیوں کی مدد بھی کی تھی۔ ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑائی بھی کی تھی۔ اس طرح لوگوں پر ان کا معاملہ مشتبہ ہوگیا۔ عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ زمینیں اس لیے مالِ غنیمت ہیں کہ مالکانِ اراضی میں سے کچھ لوگ لڑنے والوں میں شامل تھے۔ جب کہ خاص لوگوں نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اصل میں جن سے لڑائی لڑی گئی تھی، وہ تو ان زمینوں پر زبردستی کے مسلط تھے۔

جہاں تک زمین میں رہائش رکھنے والے مالکان کا تعلق ہے، تو ان کی اکثریت نے مسلمانوں سے صلح کرلی۔ اس طرح مسلمانوں نے بغیر جنگ کیے صلح کے ذریعے سے یہ زمینیں فتح کی تھیں۔ انھوں نے جو لڑائی لڑی تھی، وہ تو دوسرے ظالم لوگوں سے ہوئی تھی۔

اسی لیے حضرت عمرؓ نے اس مسئلے میں مالِ فئے والی آیت تلاوت کی تھی۔ البتہ بہت تھوڑے لوگ وہ تھے، جنھوں نے ایرانیوں اور رومیوں کے لشکر کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑائی لڑی تھی۔ ایسے لوگوں کی زمینیں مالِ غنیمت ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو وقف کرتے ہوئے مجاہدین سے رضامندی حاصل کی تھی۔ جو راضی نہیں ہوا تھا، اسے معاوضہ ادا کردیا تھا۔'' (179)

حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے (فتاویٰ عزیزیہ میں) تحریر فرمایا کہ:

''شیخ جلال الدین تھانیسریؒ نے ہندوستان کی تمام زمینوں کے بارے میں یہ حکم لگایا ہے کہ یہ سب وقف ہیں۔ جیسا کہ عراق کی زمینیں وقف ہیں۔'' (180)

انقلابی پروگرام کے تقاضے

استنبول میں قیام کے دوران مجھے اس کا موقع ملا کہ میں اپنے انقلابی پروگرام کے اصولوں پر مشرقی ممالک سے تعلق رکھنے والی جماعتوں سے مکالمہ وگفتگو کروں۔ چناں چہ ترکوں، مصریوں، ایرانیوں اور چینیوں سے اس سلسلے میں باہم گفتگو و مکالمہ جاری رہا۔ پھر

مجھے اپنے اس پروگرام کو اردو زبان میں شائع کرنے کی توفیق ہوئی۔ اس کے بعد انگریزی میں بھی یہ پروگرام طبع ہوا۔ اسے دنیا بھر میں موجود ہندوستانی اور دیگر لوگوں تک اس کو پھیلانے کی بھی مجھے توفیق ہوئی۔ [181]

میں چاہوں گا کہ ہر ایسے آدمی کو ـــ جو مسلمانوں میں سے سیاسی کاموں میں مشغولیت رکھتا ہو ـــ یہ پروگرام ضرور پڑھنا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ ان انقلابی اصولوں کو بغیر کسی فہم و بصیرت کے جلد بازی میں قبول نہ کرے۔ اس لیے کہ جو آدمی انقلاب کے میدان میں قدم رکھنا چاہتا ہے اس کی زندگی کا لازمی تقاضا اور اہم فریضہ اپنے انقلابی مسلک کے مطابق آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ انقلابی نظریہ اپنانے کے بعد اُلٹے قدم پیچھے کی طرف جانا قطعاً جائز نہیں ہوتا۔

تمام دینی اور لادینی جماعتوں میں انقلابیوں پر آگے بڑھنا لازمی فرائض میں سے ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ اسلام میں مرتد کی سزا سوائے قتل کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ مسلمانوں کی اکثریت انقلاب کا مفہوم نہیں سمجھتی، اس لیے یہ لوگ اگر ایک دن دنیائے عالم پر انقلاب کا جھنڈا لہرانے کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں، تو کچھ دنوں کے بعد ان کا خیال ہوتا ہے کہ انقلاب؛ ان کے دینی اور ملّی حقوق کے حوالے سے پیدا ہونے والی خواہشات کے خلاف ہے۔ اس طرح وہ انقلاب کے خیال سے واپس لوٹ جاتے ہیں اور یوں درمیانِ راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں۔

ہندوستان چھوڑنے کے بعد سے جب بھی ہم نے انقلابی جمعیت اکٹھا کرنے کی کوشش کی تو ایسی حالت میں ہم رجعت پسندوں کو راستے سے ہٹانے کا حکم تو نافذ نہیں کر سکتے تھے، لیکن ہم نے اس بات کا حلف لینے کی صورت اختیار کی کہ جس شخص پر انقلابی جماعت کی جانب سے رجعت پسندی کا الزام ثابت ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس انقلابی راستے سے ہٹا لے۔

مسلمانوں نے اعلیٰ درجے کے مفکرین کی بے قدری کی

ہندوستانی مسلمان دو سو برس سے سوتا رہا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ درجے کے مفکرین

کی بے قدری کی۔ اس نے اپنے خیر خواہوں کو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل کرایا۔ اس قسم کی غلطیاں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت سے تنہا تنہا بار ہا ہوتی رہی ہیں، ورنہ (فتح علی) ٹیپو سلطان (شہادت 4/مئی 1799ء) اور مولانا (شاہ) محمد اسماعیل (شہادت 6/مئی 1831ء) کی جماعتیں یوں شہید نہ ہوتیں۔ انقلاب کا مرکز بننے کی جو قدرتی صلاحیت ہندوستان کے مسلمان میں مضمر تھی، ان غلطیوں سے وہ انفرادی استعداد برباد ہو چکی ہے۔[182]

مسلمانوں کی ترقی کا پروگرام؛ نوجوانوں پر اعتماد

اس کے بعد اگر آپ ہم سے مسلمانوں کی ترقی کا پروگرام پوچھیں تو ہم آپ کو اس وقت اس سے زیادہ نہیں بتلائیں گے کہ آپ اپنے نوجوان پر جو انقلابی یورپ سے آشنا ہے اور ہر قدم پر تبدیلی کو نہایت غور سے دیکھتا ہے، اس پر پورا اعتماد کیجیے۔

ہم اس کی قوتِ اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے حالات کے مطابق اپنے لیے راستہ نکال لے گا۔ ہم نے دس بیس نوجوانوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ اگر افغان نوجوان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو ان سے آگے رہتے ہیں۔ اس کے بعد یورپ کی مسلم اور غیر مسلم قوموں میں کام کرنے میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

انقلابی پروگرام کے اہم نکات

پروگرام کی تفصیلات کو آخری شکل میں معین کرنے کا تو یہ وقت نہیں ہے، مگر ہم چند ایسے اہم نکات ضرور بیان کرنا چاہتے ہیں، تا کہ ہمارا نوجوان دھوکا نہ کھائے۔

1۔ اسلام؛ انسانیت کا عالم گیر پروگرام

اسلام حقیقت میں ایک انٹرنیشنل پروگرام ہے، جو انسانیت کے لیے ضروری ہے۔ قرآن عظیم نے عربی نیشن کو بہ طورِ واسطہ استعمال کیا تھا۔ چناں چہ اس کے تھکنے پر عجمی قوموں (عثمانی خلفا اور مغل حکمرانوں وغیرہ) نے وہ بوجھ اپنے سر لیا۔ حجاز اور دمشق کے بعد بغداد، بخارا، غزنی اور دہلی کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

مگر آج ہم اپنے نوجوان کو انٹرنیشنلسٹ بننے سے روکتے ہیں۔ کیوں کہ اسلامی انٹرنیشنلزم کا تو کوئی اجتماعی مرکز رہا نہیں اور لادینی انٹرنیشنلزم کا زور شور سے منظّم پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اپنے مطلب میں کامیاب ہونے کے لیے نہایت عمیق (گہری) چالیں چل رہے ہیں۔ ہم ڈرتے ہیں کہ ہمارا نوجوان دھوکے سے لادینی نہ بن جائے۔ اس معاملے میں ہم اپنے تجربے رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہم ایک ہندوستانی عالم کو اس سے روکتے ہیں کہ وہ کسی مسلمان بادشاہ کا انتظار کرے، جو باہر سے آئے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب کوئی مسلمان بادشاہ تو باہر سے آ نہیں سکتا اور یہ بھولا مسکین کسی لادینی دولت (حکومت) کے پیچ (داؤ) میں نہ پھنس جائے۔

2۔قومی جمہوری نظام کی اہمیت

ہمارا نوجوان جمہوری نظام کے سوا کسی اَور نظام کو نہ مانے۔قوم کے جمیع (تمام) افراد کی پوری طاقت استعمال کرنا بجز اس نظام کے ممکن نہیں۔ ہماری قوم کا اعلیٰ طبقہ عموماً برباد ہو چکا ہے۔ بجز (سوائے) اِن چند نیک بندوں کے، جو پس ماندہ (باقی رہنے جانے والی) جماعت کے اُٹھانے میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ اسی نظام کو ہم جمہوری مانتے ہیں۔ نکمّے مال داروں اور رہبانیت سکھانے والے عالموں کا اس نظام میں کوئی دخل نہیں۔

3۔اسلامی تعلیمات کی اساس پر قومی جمہوری جماعت کی اہمیت

ہماری تلقین کے موافق جس جماعت نے نیشنل اِزم اور جمہوریت پر یقین پیدا کر لیا ہو، اس کو پوری ذمہ داری سے قبول کیجیے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ لادینیت سے بچنے کے لیے ایک مستحکم حصار کا کام دے گا۔ اس کا تجربہ ہم اپنی ذات پر یورپ میں کر چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں لادینیت کا پروپیگنڈا عموماً اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ اپنے سیاسی مرکز کی ڈکٹیٹرشپ کو وسیع کیا جائے، لیکن جب ایک نیشنلسٹ کو یہ لوگ اپنے اندر شامل کرنے سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اس پروپیگنڈے کا رخ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

www.rahimia.org

4۔ اپنی پارٹی کو ان اعلیٰ اصول پر منظّم کیجیے

اپنی پارٹی کو ان اعلیٰ اصول پر منظّم کیجیے، جہاں آپ کا مذہب اور دنیا کا اقتصادی نظام باہم مل جاتے ہیں۔ اس پارٹی کا آئیڈیا (نصب العین) نہایت معقول اور نظام نہایت مضبوط ہو۔ ممبروں کی کمی و زیادتی پر نظر نہ رکھی جائے۔ ہندوستانی مسلمان کی طاقت بہت زیادہ ہے، جسے وہ خود محسوس نہیں کرتا۔ ایک عقل مند اقلیت بھی اپنی پارٹی کو ملک کی رہنما جماعت بنا سکتی ہے۔ اور ہندوستان کی دوسری قوموں سے مسلمان میں یہ صلاحیت زیادہ ہے۔

اس کے ساتھ ہم نوجوان کو وصیت کرتے ہیں کہ اپنے ہم مسلک (آزادی پسند) نیشنلسٹ ہندوستانیوں کو اپنی پارٹی میں جمع کرتا رہے۔ اور نکمّے مال داروں کو نزدیک نہ آنے دے۔ اور چند روز کی بھوک سے نہ گھبرائے۔

5۔ قوم کی صحیح تعریف قبول کیجیے

ہر ایسے اجتماع کو جو ایک زبان بولتا ہے اور معاشرت میں متقارب (باہم قریب) ہے، ایک قوم تسلیم کرے۔ اس کی زمین کو صوبہ (Province) نہ کہے، بلکہ اسے اسٹیٹ (State) بنا دیا جائے۔ اسی طرح آبادی میں مذہبی قلت و کثرت کا اثر صوبوں تک محدود ہو جائے گا۔ ہر ایک اسٹیٹ میں قانونی طاقت تو اکثریت کے قبضے میں ہوگی، مگر قوتِ تنفیذ (انتظامیہ) میں اقلیت کے لائق افراد پوری عزت اور احترام کے ساتھ شریک رہیں گے۔ اس طرح قلت اور کثرت کا اتنا فرق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاوے گا۔ [183]

دینی انقلاب میں دنیا و آخرت کی جامعیت

یہاں پر ہم مسلمانوں میں سے ہر اُس آدمی کو جو انقلاب کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے، ایک اہم فائدے پر مشتمل تنبیہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ دینی تحریکات دنیا اور آخرت دونوں کی ترقی اور کامیابیوں کو باہم جمع کرنا چاہتی ہیں۔ جب ہم دنیاوی ترقی کو پوری جامعیت کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دینی تحریک دراصل انقلابی تحریک ہوتی ہے۔ یعنی وہ مستضعفین اور کمزور لوگوں کو ظلم سے بچانا

چاہتی ہیں۔ انھیں حکومت کا اہل اور اس کا وارث بنانا چاہتی ہیں۔ (184)

تعلیماتِ انبیاؑ میں ایک انقلابی کے لیے توحید پر ایمان کی شرط

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انبیاؑ میں سے شرائع الٰہیہ کے آئمہ اور ان کی اتباع کرنے والے لوگ یہ شرط لگاتے ہیں کہ ان کی انقلابی جماعت میں جو آدمی داخل ہو، وہ توحیدِ خداوندی کو ماننے والا ہو، مشرک نہ ہو۔ اس میں حکمت کیا ہے؟ جو بات میرے نزدیک تحقیقی طور پر ثابت ہوچکی ہے، وہ یہ ہے کہ جو آدمی فائدوں کو حاصل کرنے اور نقصان دہ چیزوں سے بچنے کے لیے اپنے ربّ، خالق و مالک کو چھوڑ کر کسی دوسرے پر اعتماد کرے گا تو اسے اپنے آپ پر بھی مکمل اعتماد حاصل نہیں ہوسکتا۔

انسانی روح کا بنیادی تقاضا اور ''محبتِ ذاتیہ'' کی حقیقت

اس سلسلے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُـجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' کے ''باب الإيمان'' میں ''العبادة حقُّ اللّٰه تعالٰی علٰی عبادهٖ'' (انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں) کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جاننا چاہیے کہ انسان کی روح میں ایک نورانی لطیفہ ہے، جو طبعی طور پر اللہ کی جانب ایسا میلان اور جھکاؤ رکھتا ہے، جیسا کہ لوہا مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو ہے، جو وجدانی طور پر معلوم ہوتا ہے..... اللہ کی طرف اس نقطۂ نورانی کے میلان کو ''محبتِ ذاتیہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسا کہ دیگر تمام وجدانی چیزوں کی ہوتی ہے۔ کہ جن کے لیے عقلی دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے بھوکے آدمی کی بھوک اور پیاسے کی پیاس..... وہ تمام کام جنھیں انسان کے لیے کرنا ضروری ہے۔ وہ درحقیقت اس لطیفۂ نورانی کا حق ہے۔ جو اللہ کی طرف کھینچتا ہے..... یہ بات چوں کہ بہت گہرائی کی حامل ہے۔ نیز باریک بینی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اس لطیفے کو انسانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا عام طور پر لوگ نہیں جانتے۔ اس لیے ضروری تھا کہ

''حق'' کی نسبت اُن اعمال (نماز، روزہ اور عدل و انصاف، انسانی حقوق کی فراہمی وغیرہ) کی طرف کی جائے جن کی طرف اس لطیفۂ نورانی کا میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے اور جس کو مقصود بنایا جاتا ہے.....

جب ہم نے یہ کہا کہ ''عبادت کرنا اللہ کے بندوں پر اللہ کا حق ہے''، تو یہ دراصل اختصار ہے اس بات کا کہ اس لطیفۂ نورانی کا حق ہے کہ وہ اللہ کی طرف اپنا میلان اور جھکاؤ رکھے۔ مناسب ہے کہ اسی پر قرآن کا حق، رسول کا حق، مظلوموں کا حق، والدین کا حق، رشتہ داروں کے حقوق وغیرہ کو قیاس کرلیا جائے۔ دراصل یہ تمام حقوق انسان پر اللہ کا حق ہے، تاکہ اس کے کمالات کی تکمیل ہوسکے اور وہ اپنے آپ پر ظلم نہ کرے۔ اس لیے حق کی نسبت اُن چیزوں کی طرف کی گئی، جن کے ساتھ ان کا معاملہ پیش آیا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو اور ظاہر پرستوں کی طرح مت ہو، بلکہ اصل حقائق تک پہنچنے والے محققین کی طرح بنو!'' انتھٰی بتصرّف (185)

توحیدِ الٰہی سے انسان میں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوتا ہے

میں کہتا ہوں کہ اس قیاس کی بنیاد پر اعتماد علی اللّٰہ (اللہ پر اعتماد) کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے تعلق سے ہمارے اندر اپنے آپ پر اعتماد کرنا آجائے۔ جب کسی آدمی کو اپنے آپ پر اعتبار کرنے کے لیے کسی دوسرے کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس طرح وہ پکا موحد بن جاتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہوجاتا ہے، جنھیں اپنے اوپر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے بالکل الگ ہوجاتا ہے، جنھیں اپنے اوپر اعتماد کرنے کے لیے کچھ دوسرے لوگوں کے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات کسی ایسے آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جو انقلاب کے معنی پورے طور پر جانتا ہو۔ یاد رہے کہ انقلاب کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک انسان کو اپنے اوپر مضبوط اعتماد نہ ہو۔

☆

حوالہ جات وحواشی

www.rahimia.org

حوالہ جات و حواشی
شعور و آگہی

1۔ دیکھئے! **انفاس العارفین** از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مطبوعہ دیوبند۔ نیز **القول الجلی فی مناقب الولی**، مؤلفہ شاہ محمد عاشق پھلتی، مطبوعہ دہلی۔

2۔ **القول الجلی فی مناقب الولی**، ص11۔

3۔ **انفاس العارفین** ص404۔

4۔ ایضاً ص405۔

5۔ ایضاً۔

6۔ **القول الجلی**، خلاصہ، ص: 136 تا 138۔

7۔ ایضاً، ص148۔

8۔ ایضاً، ص150۔

9۔ ایضاً ص151، 154۔

10۔ ایضاً ص156۔

11۔ ایضاً ص157۔

12۔ شاہ صاحب نے **ھمعات** کے آخر میں اس کی تاریخِ تالیف لکھی ہے، ''جمادی الآخر ۱۱۴۸ھ (اکتوبر/ نومبر 1735ء)'' اور **ہمعات** میں اخلاقِ اربعہ کی بحث کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہر کہ این را بہ تفصیل خواہد باید کہ بہ کتابِ ما ''**حُجّة اللّٰه البالغه**'' رجوع کندہ''

(ھمعات ص96)

(جو آدمی ان اخلاقِ اربعہ کی تفصیل کا خواہش مند ہے، وہ ہماری کتاب ''**حُجّة اللّٰه البالغه**'' کا مطالعہ کرے۔) اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے جمادیٰ الاخریٰ ۱۱۴۸ھ/ اکتوبر 1735ء سے پہلے آپؒ نے اپنی کتاب ''**حُجّة اللّٰه البالغه**'' تحریر فرمائی تھی۔ شاہ صاحبؒ

کی حرمین شریفین سے واپسی رجب ۱۱۴۵ھ/ جنوری 1733ء کو ہوئی۔ اندازہ ہے کہ حرمین شریفین کے سفر کے فوراً بعد آپؒ نے "**حجّة اللّٰه البالغه**" لکھنی شروع کی۔ اور دو سال کے عرصے میں ۱۱۴۷ھ میں مکمل کر لی۔ (آزاد)

13۔ **حُجّةُ اللّٰه البالِغه**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، باب الرسوم السائرہ فی الناس، ص 104، طبع بیروت۔

14۔ **همعات** ص135، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد، سندھ۔

15۔ **القول الجلی** ص198۔

16۔ ایضاً، 194۔

17۔ **مقدمه فتح الرحمن** ص الف، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور 1986ء۔

18۔ **القول الجلی**، ص 208۔

19۔ ایضاً، ص311۔

20۔ القرآن: 3:5:24۔

21۔ ایضاً، ص330۔

22۔ ایضاً، ص346۔

23۔ ایضاً ص362۔

24۔ ایضاً 365، 366۔

25۔ **التّمهيد لتعريف أئمّة التّجديد**، از حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ۔ ص8۔

26۔ ایضاً۔

27۔ ایضاً۔

28۔ ایضاً، ص 36۔

29۔ خطبات ومقالات مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ص: 25-224۔

30۔ ایضاً، ص: 28-227۔

31۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ۔ مرتبہ: پروفیسر محمد سرور مرحوم، ص: 6، طبع: سندھ ساگر اکیڈمی لاہور۔

32۔ ایضاً۔

33۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ افکار و خدمات از مولانا دین محمد وفائی، ص 25-24، مرتبہ: ڈاکٹر

ابوسلمان شاہ جہان پوری، ص 25-24۔ طبع: المحمود اکیڈمی، اردو بازار لاہور

34۔ شاہ ولی اللہ سے امام عبید اللہ سندھیؒ تک، از ڈاکٹر ظہیر الحق دین پوریؒ، ص: 125، طبع: دین پور، خان پور

35۔ خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ص: 330، خطبہ افتتاح ٹھٹھہ (سندھ) ضلع کانگریس کمیٹی کانفرنس، منعقدہ 12/ جولائی 1940ء۔

36۔ القرآن 124:2۔

37۔ صحیح بخاری، کتاب الصّلوٰۃ، حدیث 438۔

38۔ سنن ترمذی، حدیث 2641۔

39۔ فُیوضُ الحرمین، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص: 88-89، مطبع احمدی دہلی۔ اردو ترجمہ، ص: 266، 270، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

40۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، المبحث الرّابع؛ مبحث السّعادة، باب: 4، ج: 1، ص: 160 و 164، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔

41۔ القرآن 17:13۔

42۔ یہ شعر یمن کے باعلوی خاندان سے تعلق رکھنے والے بزرگ شیخ الاسلام عبداللہ بن علوی بن محمد الحداد یمنی تریمی کا ہے۔ یہ سلسلۂ عیدروسیہ ولی اللّٰہیہ کے بزرگ ہیں۔ ان کا ایک دیوان "دیوان الإمام الحدّاد المسمّٰی الدّرّ المنظوم لذوی العقول و الفهوم" کے عنوان سے ہے، جس میں ایک قصیدے کا یہ پہلا شعر ہے (دیکھئے ص 288)۔ ان کی ولادت ۵/ صفر ۱۰۴۴ھ 31/ جولائی 1634ء کو ہوئی اور انتقال ۷/ ذوقعدہ ۱۱۳۲ھ/ 10/ ستمبر 1720ء میں ہوا۔ یمن کے تریم شہر میں ان کا مقبرہ ہے۔

(دیکھئے کتاب "الإمام الحدّد مجدّد القرن الثّانی عشر الهجری، سیرتهٗ - منهجهٗ، تالیف: ڈاکٹر مصطفیٰ حسن بدوی، طبع: دار الحاوی للطّباعة و التّوزیع و النّشر، بیروت لبنان، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۴ھ/ 1994ء)

43۔ یہ ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے، جس کے یہ الفاظ ہیں: "یا ایّها النّاس! إنّ ربّکم واحد، و إنّ أباکم واحد، ألا! لا فضل لعربی علیٰ عجمی، و لا عجمی علیٰ عربی، و لا لأحمر علیٰ أسود، و لا لأسود علیٰ أحمر، إلّا بالتّقویٰ."

(مسند احمد، ج: 5، ص: 411، حدیث 23536)

www.rahimia.org

44۔ جیسا کہ "حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه" کی قسمِ اوّل میں بیان کردہ قواعدِ کلیہ کے بارے میں شاہ صاحبؒ خود لکھتے ہیں: "قسم القواعد الکُلّیة الّذی تنتظم بها المصالح المرعیة فی الشّرائع و أکثرها کانت مسلّمة بین المِلل الموجودة فی عهد النّبیّ صلّی اللّٰه علیه و سلّم، و لم یکن فیها اختلاف بینهم، و کان الحاضرون مستغنین عن سوالها." (مقدمہ "حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه"، ص 55)

45۔ **همعات** (فارسی)، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ہمعہ نمبر 17، ص: 79 تا 92، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد۔ اردو ترجمہ، ص: 150، مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور۔

46۔ ایضاً، ص 94-93۔

47۔ جیسا کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ "حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه" میں لکھتے ہیں:
"فهّمنی أنهٗ إنّما بُعِث الأنبیاءُ لِلدّعوة إلیها، و الحثّ علیها، و أنّ الشّرائع تفصیل لها، و راجعةٌ إلیها." (ص: 160)
(اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے یہ بات بھی سمجھائی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت انھی چار اَخلاق کی دعوت دینے اور ان پر اُبھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور ان پر نازل ہونے والی شریعتیں انھی چار اَخلاق کی تفصیلات ہیں اور وہی ان شریعتوں کا محور و مرکز ہیں۔)

48۔ ملتوں کی حقیقت کی وضاحت کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "البُدور البازغه" میں بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے لیے دیکھئے! البُدُور البازغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، المقالة الثّالثة فی بیان الملل و الشّرائع، فصل: 1، ص: 41-240، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد، سندھ۔

49۔ القرآن 29:55۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ "لمحات" میں لکھتے ہیں: "فالرّحمٰن بحسب فعلهٖ فی الطّبیعة المدبّرة الکلّیة ما فی الکون، بیدهٖ المیزان دائماً، تتّزن الأسباب، و تخفض، و یرفع، و یعرف الرّاجح منها، و یحکم الرّاجحة المرجوحة. قال تعالیٰ: "کُلّ یوم هو فی شأن."
(لمحات، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، لمحہ نمبر 29)
(اللہ تبارک و تعالیٰ جو کچھ کائنات کی طبیعتِ کلیہ میں کام سرانجام دیتے ہیں، تو اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک میزان ہے، جس کے ذریعے سے دنیا کے اسباب کا وزن کرتے رہتے ہیں۔ اور انھیں اٹھاتے اور جھکاتے رہتے ہیں۔ اور ان میں سے جس سبب کو ترجیح دینی

ہوتی ہے، اسے جانتے ہیں اور اُسے دوسرے اسباب پر غالب کرتے رہتے ہیں۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کہ ''ہر دن اللہ کی ایک شان ہے۔'')

50۔ رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ المصابیح، حدیث 928۔

51۔ بوستان از شیخ سعدیؒ، بابِ دوم ''در احسان''، حکایت در اَخلاقِ پیغمبراں، ص: 82، طبع: مطبع مجیدی، کانپور۔ و ص 70، مطبوعہ مکتبہ شرکتِ علمیہ، ملتان۔

52۔ صحیح مسلم، کتاب البرّ و الصّلۃ، باب فضل عیادۃ المریض، حدیث 6556۔ صحیح ابن حبّان، کتاب الإیمان، حدیث 269.

53۔ القرآن 70:17۔

54۔ مسند احمد، ج: 5، ص 411، حدیث 23536۔

55۔ القرآن 9:61۔

56۔ القرآن 18:5۔

57۔ حُجَّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَہ، المبحث الارتفاقات، باب الرسوم السائرہ فی النّاس، ص 149۔

58۔ ایضاً، مبحث البرّ و الإثم، باب الآثام الّتی ھی ما بینہ و بین النّاس، ص 236۔

59۔ ایضاً، باب الرّسوم السائرۃ فی النّاس، ج: 1، ص: 151۔

60۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصل عبارت حُجَّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَہ میں یہ ہے:

''فلمّا عظُمت ھٰذہٖ المصیبۃ، و اشتدّ ھٰذا المرض، سخط علیھمُ اللّٰہ و الملائکۃ المقرّبون؛ و کان رِضائہٗ تعالیٰ فی معالجۃ ھٰذا المرض بقطع مادّتہٖ، فبعث نبیّاً اُمّیاً ﷺ لم یخالط العجم و الرّوم، و لم یترسّم برسومھم، و جعلہٗ میزاناً یعرف بہٖ الھدی الصّالح، المرضیّ عند اللّٰہ من غیر المرضیّ، و أنطقہٗ بذمّ عادات الأعاجم، و قُبح الاستغراق فی الحیاۃ الدّنیا، و الإطمئنان بھا، و نفث فی قلبہٖ أن یحرّم علیھم رؤس ما اعتادہٗ الأعاجم، و تباھوا بھا. ... و قضٰی بزوال دولتھم بدولتہٖ، و ریاستھم بریاستہٖ، و بأنّہٗ ھلک کسرٰی فلا کسرٰی بعدہٗ، و ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ.''

(حجۃ اللّٰہ البالغۃ، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مبحث السّادس؛ السّیاسۃ الملّیۃ، باب إقامۃ الارتفاقات و إصلاح الرّسوم، ج: 1، ص 303-04)

(جب قیصر وکسریٰ کے ظلم وستم کی یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور مرض شدت اختیار کر گیا تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے مقرب فرشتے ان پر ناراض ہوئے۔ اللہ کی رضا اس میں تھی کہ اس مرض کو جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے نبی اُمیؐ کو بھیجا، جس کا عجمیوں اور رومیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے ان کی رسومات اختیار نہیں کی ہوئی تھیں۔ اللہ نے انھیں اللہ کے پسندیدہ طریقے اور ناپسندیدہ طریقے کے لیے عدل کی ترازو قرار دیا۔ انھوں نے آکر عجمیوں کی عادات کی مذمت کی۔ دنیا کی زندگی میں مست اور مطمئن رہنے کی خرابیاں بیان کیں۔ اُن کے دل میں عجمیوں کی بڑی بڑی غلط عادتوں — جن پر وہ فخر کرتے تھے — کی حرمت ڈال دی گئی۔ ...حضورؐ کی حکومت اور ریاست کے ذریعے ان کی حکومتوں اور ریاستوں کو ختم کر دیا گیا۔ چناں چہ کسریٰ ہلاک ہوگیا، اس کے بعد کوئی کسریٰ پیدا نہیں ہوا۔ قیصر ہلاک ہوگیا، اس کے بعد کوئی قیصر پیدا نہیں ہوا۔)

61۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، باب إقامة الارتفاقات**، ص: 301۔

62۔ ''کلیلہ دمنہ'' کی اصل عبارت درجِ ذیل ہے:

''و لا سيّما فى هٰذا الزّمان الشّبيه بالصّافى و هو كدر؛ ...

فإنّا قد نرىٰ الزّمان مُدبّراً بكلّ مكان:

فكأنَّ أُمورَ الصّدق قد نُزعت من النّاس، فأصبح ما كان عزيزاً فقدهٗ مفقوداً، و موجوداً ما كان ضائراً (أى مُضِرّاً) وجودُهٗ.

و كأنّ الخيرَ أصبح ذابلاً، و الشّرَّ أصبح ناضراً (أى زاهياً).

و كأنّ الفهم أصبح قد زالت سُبلهٗ.

و كأنّ الحقّ ولّٰى كسيراً و أقبل الباطل تابعهٗ.

و كأنّ اتّباع الهوىٰ، و إضاعة الحكم أصبح بالحُكّام موكّلاً؛ و أصبح المظلوم بالحيف (أى الظّلم و الجَور) مُقِرّاً و الظّالم لنفسه مستطيلاً (أى معظّماً).

و كأنّ الحرص أصبح فاغراً فاهُ من كلّ جهة، يتلقّف ما قرُب منهٗ و ما بعُد.

و كأنّ الرِّضا أصبح مجهولاً.

و كأنّ الأشرار يقصدون السّماء صعوداً.

و كأنّ الأخيار يريدون بطن الأرض؛ و أصبحت المُروء ة مقذوفاً بها من

أعلٰی شرَفٍ إلٰی أسفل درکٍ؛ و أصبحت الدّناء ۃ مکرّمۃً ممکّنۃً؛ و أصبح السّلطان (أی السّلطنۃ و الحکومۃ) منتقلاً عن أھل الفضل إلٰی أھل النّقص.

و کأنّ الدّنیا جذلۃ (أی فرحۃ) مسرورۃ تقول:

"قد غُیّبت الخیرات، و أُظھرت السّیّئات."

(کلیلہ دمنہ، باب برزویہ، ص81-80، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی)

63۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اپنے مطالعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے "التّمھید لتعریف أئمّۃ التّجدید" میں لکھتے ہیں:

"پھر مَیں (آخر اکتوبر 1933ء میں) استنبول آیا۔ وہاں تقریباً تین سال رہا۔ اس دوران خلافتِ عثمانیہ کی تاریخ کے مطالعے میں مشغول رہا۔ خاص طور پر سلطان عبدالعزیز خان شہید کے زمانے (1861ء تا 1876ء) سے اتحادِ اسلام کی تحریک سے متعلق ابتدائی اُمور کا میں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔

ہمارے دیوبندی مشائخ نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد حجاز مقدس میں پناہ لی تھی۔ اسے اپنے کاموں کے لیے مرکز بنا لیا تھا۔ ان حضرات کا حکومتِ استنبول سے تھوڑا بہت تعلق باقی رہ گیا تھا۔ میں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اس سلسلے میں بہت سی روایات اور حکایات سنی تھیں۔ پھر بعد میں ہم نے اس کا اثر دارالعلوم سے شائع ہونے والے رسائل میں نہیں دیکھا۔ مجھے ہمیشہ سے یہ شوق رہا کہ معاملات کا گہرائی میں جا کر جائزہ لوں، تاکہ باہم برسرِ پیکار جماعتوں کے دعووں کے ذیل میں چھپی حقیقت کا سراغ لگایا جاسکے۔

مجھے اس وقت بڑا افسوس ہوا، جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوئی کہ عربوں اور ترکوں کے درمیان باہمی اختلاف اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس میں خیر کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ پھر اس وقت مجھے مزید جھٹکا لگا، جب میرے سامنے یہ حقیقت کھلی کہ سید جمال الدین افغانی "خلافتِ عثمانیہ" کے خاتمے کی بنیاد پر "خلافتِ عربیہ" قائم کرنے کے بڑے داعیوں میں سے ایک تھے۔ نیز جب مجھ پر یہ واضح ہوا کہ برطانوی لیڈروں کی نظر میں مشرقی مسئلے کی کچھ حیثیت نہیں ہے۔ میں نے اس سلسلے سے متعلق ان کے (دیے گئے بیانات میں) اشاروں اور کنایوں کو بڑی اچھی طرح سمجھا۔

میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ خلافتِ عثمانیہ میں "جمہوریت" اور "قومی آزادی" کے نام پر

مسلمانوں کو اپنے سیاسی ارتقا کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ کابل میں مدحت پاشا کے بیٹے علی حیدر کی لکھی ہوئی اس کی سوانح عمری اور مصری لیڈر فرید بک کی کتاب ''تاریخ دولتِ عثمانیہ'' پڑھنے کے بعد ''جمعیت اتحاد وترقی'' کے ارتقا اور پھیلاؤ کے بارے میں مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ چناں چہ عصری تعلیم کے بانی ہندوستانی لیڈر سرسید احمد خان کے نظریات وخیالات اور عثمانی لیڈر صدر اعظم مدحت پاشا (1822ء تا 1884ء) کی زندگی میں مَیں کوئی خاص فرق تلاش نہ کرسکا۔

میرا یہ بھی تجزیہ ہے کہ مسلمان معاشروں میں جو کچھ اجتماعی طاقت باقی ہے، وہ بادشاہوں کی وراثت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس سے میری مراد وہ طبقات ہیں جن میں کچھ تو عیاش اور مفاد پرست حکمران طبقات اور مال دار جماعتیں ہیں، اور کچھ ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے گمراہ کرنے والے علما اور حیلہ ساز انقلابی لیڈر ہیں، جن میں دورِ حاضر کی سیاست کی سمجھ بوجھ اور اس کا مزاج قطعاً موجود نہیں ہے۔

چناں چہ میرا تجزیہ یہ ہے کہ:

1۔ بادشاہوں کی وراثت پر مبنی اس زوال پذیر قوت پر اعتماد کرنا۔
2۔ ''دین'' اور ''قوم'' کے نام پر اس وراثت کی حفاظت کی کوشش کرنا۔
3۔ ''جمہوریت'' یا ''بادشاہت'' کے عنوان سے ان میں سے کسی خاندان کی حکومت قائم کرنا۔
4۔ ان میں سے کسی ایک فرد کو ملتِ اسلامیہ کے کمانے والے طبقات پر زبردستی حکمران بنانا۔
5۔ ملتِ اسلامیہ کی اصلاح اور ترقی کو ان حکمرانوں کی اصلاح اور ترقی سے وابستہ کرنا۔

اپنے آپ کو دھوکہ دینے اور جہالت کو قبول کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

چناں چہ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ انقلابی اصولوں کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیں۔ یہ کام بے شک فوری نہ ہوسکے، بلکہ ہر ایک ملک میں جدوجہد کی نوعیت اور اس کے درجات میں فرق کی وَجہ سے اگرچہ کچھ زمانے کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ نجات کا واحد راستہ انقلابی اصولوں کے اپنانے میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اہلِ علم علما میں سے سوائے حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے اور کوئی ایسا عالم نہیں ہے کہ جس کی پیروی اس جیسے عظیم (انقلابی) کام کے سرانجام دینے

www.rahimia.org

کے سلسلے میں کی جائے۔''
(برصغیر میں تجدیدِ دین کی تاریخ، ساتواں باب، فصل (1): استنبول آمد اور ''ترکی'' کی تاریخ کا تجزیہ، ''**التّمهيد لتعريف أئمّة التّجديد**''، تالیف: مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ مترجم: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوریؒ، ص 15-214، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

64۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ؛ حالاتِ زندگی، تعلیمات، از پروفیسر محمد سرور، ص: 86-85، طبع: سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور

65۔ اس حدیث کا اصل متن یہ ہے:
''**عن ابن عمر، قال: سمعتُ رسول الله ﷺ يقول: ''إذا تبايعتم بالعينة، و أخذتم أذناب البقر، و رضيتم بالزّرع، و تركتم الجهاد، سلّط الله عليكم ذلًّا لا ينزعهٗ حتّٰى ترجعوا إلٰى دينكم.**'' (سنن ابی داوٗد، حدیث 3462)

66۔ پروفیسر سی۔ای۔ایم جوڈ' یورپ کے بعض محقق اہلِ قلم کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھتے ہیں۔

67۔ القرآن 201:2۔

68۔ ''**أنفاس العارفين**'' میں شاہ صاحبؒ کی عبارت درجِ ذیل ہے:
''حضرتِ ایشاں ... غالبًا در حلقۂ یاراں بیرون از تلاوت ہر روز دو سہ رکوع بر تدبر و بیانِ معانی آں مے خواندند ... و در آخر تفسیر شروع کردہ بودند چوں از بیانِ زہراوین (سورت البقرہ وآلِ عمران) فارغ شدند ضعف غالب آمد۔ وآں رشتہ موقوف ماند۔ ایں فقیر بارہا از زبانِ ایشاں استماع کردہ کہ ما ہرچہ یافتیم بہ دولت درود وتوجہِ مجرد یافتیم۔''
(**أنفاس العارفين** (فارسی)، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ''**بوارق الولاية**'' در انفاسِ نفیسہ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ، ص85، طبع: اسلامی کتب خانہ، ملتان)

69۔ **حُجّة الله البالغه، باب إقامة الارتفاقات و إصلاح الرّسوم**، ج1، ص 04-303.

70۔ ''**فيوض الحرمين**''، عربی اُردو، ص266۔

71۔ القرآن 41:13۔

72۔ **فتح الرّحمٰن بترجمة القرآن**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، **تفسیر سورت الرّعد**.

73۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ایک سوانح میں یہ تذکرہ موجود ہے:
''جب شاہ صاحبؒ نے فارسی میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت کی تو ایک تہلکۂ عظیم کٹ ملانوں کے گروہ میں برپا ہوگیا۔ اور وہ یہ سمجھ گئے کہ ہماری روزی کی عمارت

ڈھا دی گئی۔ اب جہلا کبھی ہمارے قبضے میں نہ آئیں گے اور وہ ہر بات پر بحث کرنے کو تیار ہوجائیں گے۔ اس خیال نے اُن کے دل میں ایک آگ بھڑکا دی۔ اور علاوہ کفر کے فتوے دینے کے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جانی دشمن ہوگئے۔ اور اب ان میں مشورے ہونے لگے کہ شاہ صاحبؒ کو کیونکر قتل کیا جاوے؟ ان کٹ ملانوں نے جن کا اثر بہت کچھ شہر کے بد وضع لوگوں، اکھاڑوں اور پٹے بازوں پر پھیلا ہوا تھا، چند بدمعاش جمع کیے اور اب وہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تاک میں رہنے لگے۔.....

چناں چہ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپؒ عصر کی نماز فتح پوری (مسجد) میں پڑھا رہے تھے اور آپؒ گویا محمدیوں کی جماعت کے امام تھے۔ ابھی آپؒ نے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازوں پر شور وغل کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ اور لوگ کچھ غیر معمولی شپر کرتے ہوئے معلوم ہوئے۔......

جب شاہ صاحبؒ کو تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ میرے قتل کے لیے نرغہ کرکے آئے ہیں تو انھوں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ تم جان بچا کر چلے جاؤ اور مجھے ان منافقوں کے ہاتھوں شہید ہونے دو۔ لیکن ان کی حمیتِ اسلامی نے یہ گوارا نہیں کیا۔ اور وہ تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ جب تک جان میں جان باقی ہے، آپ پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحبؒ اپنے ہاتھ میں صرف ایک پتلی سے لکڑی لے کر اللہ اکبر کہہ کر اٹھے اور کھاری باؤلی والے دروازے کی طرف چلے۔...

اس وقت شاہ صاحبؒ کو جلال آ گیا تھا اور ابراہیمی مصفّٰی خون آپ کی رگوں میں زور زور سے حرکت کرنے لگا تھا۔ آپؒ نے اپنے غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر کا ایک نعرہ مارا اور اُس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلتے چلے گئے۔ کل بدمعاش اور منافق کٹ ملا دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ کوئی شاہ صاحبؒ پر حملہ کرتا۔

حقیقت میں یہ بہت صحیح ہے　ع

دشمن اگر قوی است ، نگہبان قوی تر است

(حاشیہ ''حیاتِ ولی'' تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، از مولانا رحیم بخش دہلویؒ، ص 307 تا 309، طبع: مکتبہ طیبہ، بلال گنج، لاہور، 1972ء)

74۔　البدور البازغہ، المقالۃ الاولیٰ، ص: 125۔

75۔　ایضاً، فصل فی بیان تحقیق الملّۃ، المقالۃ الثّالثہ، ص240۔

76۔ قرآنی ترجمہ نگاری کی اہمیت اور اصول وقوانین، مقدّمہ فتح الرّحمٰن بترجمة القرآن، ص 140، طبع: رحیمیہ مطبوعات لاہور۔

77۔ جُرجی زیدان ''تاریخ التّمدن الإسلامی'' میں لکھتا ہے:

''اختص صدر الإسلام برجال توفّرت فیهم خصال النّصر، و قد امتاز ذٰلک العصر بنبوغ الرّجال العظام .... فکأنّ اللّٰه قدّر للعرب النصر فاختصّهم بقواد من نخبة رجال العالم فی الحرب، و السّیاسة، و الدّهاء، و الحکمة کخالد بن ولید ...... و مثل عمرو بن العاص ... و أبی بکر الصدیق، و عمر بن الخطاب، من أهل الحزم و التّقوٰی، و صدق العزیمة. فنبوغ هؤلآء الرّجال و أمثالهم فی أوائل الإسلام، کان من أکبر العوامل فی سرعة نجاحه.''

(تاریخ التّمدن الإسلامی، از جُرجی زیدان، الجزء الأوّل، الفتوح الإسلامیة فی صدر الإسلام، ص: 68، طبع: مؤسّسة هنداوی للتّعلیم و الثّقافة، القاهرة، 2012ء)

78۔ القرآن 9:61۔

79۔ إزالة الخفاء عن خلافة الخفاء، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مقصدِ اوّل، فصل سوم، تفسیر آیاتِ خلافت، ج:1، ص 165، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی۔

80۔ ایضاً، ص 175۔

81۔ التّفهیمات الإلٰهیة، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، المقالة الوضیة فی النّصیحة و الوصیة، تفہیم نمبر 246، ج:2، ص 296، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد۔

82۔ شاہ صاحبؒ اس زمانے میں فساد کے اسباب بیان کرتے ہوئے بھاری ٹیکسز کی خرابیاں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''إنّما تصلح المدینة بالجبایة الیسیرة و إقامة الحفظة بقدر الضّرورة.''

(حجة الله البالغه، مبحث الارتفاقات، باب سیاسة المدنیه، ص 141)

83۔ أنفاس العارفین (فارسی)، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ''بوارق الولایة'' درانفاسِ نفیسہ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ، ص 200۔

84۔ ایضاً، ص 84۔

85۔ ایضاً، ص 82۔

www.rahimia.org

86۔ ایضاً، 83۔

87۔ ایضاً،ص 200۔

88۔ **حُجّةُ اللّٰه البالغه، مبحث السياسة الملة، باب الأحكام التى يجر بعضها ببعض،** ص309۔

89۔ ایضاً۔

90۔ ایضاً۔امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ہے:"**باب بيع السّلاح فى الفتنة و غيرها**" اور اس میں یہ جملہ لائے ہیں کہ "**كره عمران بن حُصين بيعهٔ فى الفتنة**". **صحيح بخارى، كتاب البيوع،** باب نمبر37۔

91۔ **ملخّص من "حُجَّةُ اللّٰهِ الُبَالِغه"، مبحث السعادة،** ص152۔
واضح رہے کہ حسن و قبح کے حوالے سے یہاں جو بحث کی گئی ہے، وہ انسان کے نوعی خواص کی جانچ پڑتال سے متعلق ہے۔ جب کہ ایک دوسرا مسئلہ حسن و قبح کے حوالے سے یہ ہے کہ کیا حسن و قبح کا تعین عقل سے ہوتا ہے؟ یا شریعت جسے اچھا کہہ دے وہ اچھا ہے اور جسے بُرا کہہ دے وہ بُرا ہے؟ یہ ایک الگ موضوع ہے، جس پر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "انفاس العارفین" میں نہایت بسط سے بحث کی ہے۔

92۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الُبَالِغَه، مبحث السياسة الملة، باب الأحكام التى يجر بعضها ببعض،** ص307۔

93۔ برصغیر میں تجدید دین کی تاریخ، اردو ترجمہ "**التّمهيد لتعريف أئمّة التّجديد**، مترجم: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، ص 163، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور۔

94۔ **صحيح مسلم، كتاب الإيمان،** حدیث 93۔

95۔ **الطاف القدس فى معرفة لطائف النفس،** از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، فصل چہارم؛ در تہذیبِ جوارح، ص: 57-56، طبع: نصرۃ العلوم، گوجرانوالا۔

96۔ **التّفهيمات الإلٰهيه،** تفہیم 227، ج:2، ص 243۔

97۔ **الهام الرحمٰن فى تفسير القرآن،** از مولانا عبیداللہ سندھیؒ، ج:1، ص 26۔ طبع: حیدرآباد، سندھ۔

98۔ **تكميل الأذهان،** از امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ، **الباب الثّالث فى الأمور العامّة،** ص 105، طبع: نصرۃ العلوم، گوجرانوالا۔

99۔ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت یہ ہے:
”إعلم! أنّ الرّسوم من الارتفاقات: هی بمنزلة القلب من جسد الإنسان، و إيّاها قصدت الشّرائع أوّلاً و بالذّات، و عنها البحثُ فی النّواميس الإلٰهية، و إليها الإشارات؛ و لها:
أسباب: تنشأ منها، كاستنباط الحكماء و كإلهام الحقّ فی قلوب المؤيّدين بالنّور الملَكی. و أسباب: تنتشر بها فی النّاس، مثل كونها سنة ملك كبير، دانت له الرّقاب، أو كونها تفصيلاً لما يجدهٗ النّاس فی صدورهم، فيتلقّونها بشهادة قلوبهم. و أسباب: يعضّون عليها بالنّواجذ لأجلها: من تجربة مجازاة غيبيّة علٰى إهمالها، أو وقوع فساد فی إغفالها، و كإقامة أهل الآراء الرّاشدة الأئمّة علٰی تركها، و نحو ذٰلك.“ (”حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه“، مبحث الارتفاقات، باب الرّسوم السائرة فی النّاس، ص:149)

100۔ القرآن 9:61۔

101۔ القرآن 32:9۔

102۔ القرآن 128:2۔

103۔ تورات، کتابِ پیدائش، باب نمبر 25، آیت نمبر 16، (عبرانی سے اُردو ترجمہ)، ص 57، طبع: پاکستان بائبل سوسائٹی۔

104۔ مسند احمد (مسند انس ابن مالک) حدیث نمبر 12433 (مرفوع)، ج: 25، ص: 479۔

105۔ صحيح مسلم، حدیث نمبر 4710۔ نیز متفق عليه، مشكوٰة شريف، باب مناقب قريش، ج:2، ص 550، مطبوعہ محمد سعید اینڈ کمپنی، کراچی۔

106۔ القرآن 285:2۔

107۔ القرآن 29:48۔

108۔ مشكوٰة المصابيح، باب ثواب هٰذهٖ الاُمّة، ج:2، ص 584۔

109۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی افتراق هٰذهٖ الامة، حدیث نمبر 6525۔

110۔ القرآن 6:1۔

111۔ القرآن 4:69۔

112۔ القرآن 32:9۔

113۔ القرآن 100:9۔

114۔ ایضاً۔

115۔ **صحیح بخاری، کتاب الرّقاق، حدیث: 6429۔**

116۔ **إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء. المقصد الأوّل، فصل چھارم، أحادیثِ خلافت، مسند عبداللّٰه بن مسعودؓ، ج: 1،ص: 87-286۔**

117۔ چناں چہ امام بخاریؒ نے حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے نقل کیا ہے کہ:

”**أنّهٗ دخل علٰی الحجّاج، فقال: یا ابن اکوع! إرتددتَّ علٰی عقبیک تعرّبت؟ فقال: ”لا، و لکن رسول اللّٰه صلّی علیه و سلّم أذن لی فی البدو.**“

(**صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب التّعرّب فی الفتنة، حدیث 7087**)

(جب وہ حجاج بن یوسف کے پاس تشریف لے گئے تو حجاج نے اُن سے کہا: ”کیا آپ واپس لوٹ کر دیہاتی بن گئے ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں! لیکن حضورؐ نے مجھے دیہات میں رہنے کی اجازت دی تھی۔“)

یاد رہے کہ حضرت سلمہ بن اکوعؓ مدینہ منورہ چھوڑ کر ربذہ کے دیہات میں رہنے لگے تھے۔ اس پر حجاج نے یہ سوال کیا تو انھوں نے دیہاتی ہونے کی تردید کی۔

چناں چہ علامہ ابن خلدونؒ نے لکھا ہے کہ: ”جاننا چاہیے کہ اہلِ مکہ پر ابتدائی اسلام میں ہجرت فرض ہوئی تھی، تاکہ وہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ہر جگہ پہنچ کر اُن کے ساتھ تعاون اور مدد اور اُن کی حفاظت کریں۔ یہ ہجرت دیہات میں رہنے والے اعراب پر واجب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اہلِ مکہ کو قریش کے حوالے سے جو عصبیت حضور اقدسؐ سے تھی، وہ دیہات میں رہنے والے دیہاتی اور اعرابی لوگوں کو نہیں تھی۔ یہی وَجہ ہے کہ:

”**و قد کان المهاجرون یستعیذون باللّٰه من التعرُّب، و هو سُکنیٰ البادیة، حیث لا تجب الهجرة.**“ (مہاجرین دیہات میں رہنے سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔ اس لیے کہ اُن پر ہجرت کرنا واجب نہیں تھا۔)

(**مقدمہ ابن خلدون، الفصل الرّابع**، ص 33-132،طبع: دارالکتب العلمیة، بیروت)

118۔ امام ابوحنیفہؒ کی تدوینِ قانونِ اسلامی، از ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ص 17، طبع: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع پنجم بہ اضافہ: ۱۳۸۵ھ/ 1965ء۔

119۔ شاہ صاحبؒ نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ: ”**و الّذی أعتقدهٗ أنّ إن اتّفق غلبة**

الهنود مثلاً علٰی إقليم هندوستان، غلبةً مستقرّةً عامةً وجب فی حكمة اللّٰه أن يُلهم رؤسائهم التّديّن بدين الإسلام، كما اُلهمت التُّرك. و ذٰلك منشعب عن عموم نبوّتهٖ، و انعقاد كونهٖ صاحبِ ملّة." (میرا یہ اعتقاد ہے کہ مثال کے طور پر اگر پورے ہندوستان پر ہندوؤں کا مکمل غلبہ ہوگیا تو اللہ کی حکمت میں یہ بات لازمی ہے کہ اُن کے رہنماؤں کو دینِ اسلام اختیار کرنے کا الہام کردیا جائے گا، جیسا کہ ترکوں کے دل میں الہام کیا گیا تھا۔ یہ کام حضورؐ کی نبوتِ عامہ سے پھوٹے گا۔ اس سے آپؐ کی ملت کا دائرہ پھیلے گا۔) (التّفهيمات الإلٰهيه، (عربی)، تفہیم نمبر 69، ج:1، ص 269)

120۔ القرآن 100:9۔

121۔ صحيح بخاری، كتاب الحدود، باب رجم الحُبلٰی فی الزّناء إذا أحصنت، حدیث 6830۔

122۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ:

"أنّ الأنصار لمّا طلبوا الإمامة احتجّ عليهم ابوبكرؓ بقولهٖ عليه السّلام: "الأئمّة من قريش". و الأنصار سلّموا تلك الحُجّة."

(التفسير الكبير، از امام فخرالدين رازیؒ، سورت البقره، آيت 81، ج:3، ص 135، طبع: دارالكتب العلمية، بيروت)

یہ روایت مسند ابو داؤد الطيالسی میں حضرت انس بن ثابتؓ سے بھی مروی ہے۔ مسند انس، حدیث نمبر 2247، ج:2، ص: 543، طبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت۔

123۔ سير أعلام النُّبلاء، تاليف: إمام شمس الدين ذهبی، عصر الخلفاء الرّاشدين، ج:1، ص229، طبع: دار الكتب العلمية، بيروت.

124۔ رواہ البخاری، کتاب الرقاق، حدیث: 6429۔ وعن عمران بن حصین، حدیث: 2651۔

125۔ إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء. المقصد الأوّل، فصل چهارم، أحاديثِ خلافت، مسند عبداللّٰه بن مسعودؓ، ج:1، ص: 87-286۔

126۔ البدايه و النهايه، حافظ ابن کثیر، ج8، ص135، طبع: دارالفکر، بیروت۔

127۔ ''اسلام کا تاریخی کارنامہ''، مصنف ایم۔ این رائے، بابِ سوم، ''اسلام کا سماجی اور تاریخی پس منظر'' انگریزی ایڈیشن، مطبوعہ 1958ء سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور۔ و اُردو ترجمہ از علی امام، مطبوعہ رسالہ ''عالمگیر''۔

128۔ ''تمدنِ عرب'' از موسیو لیبان۔

129۔ ایضاً۔

130۔ **تاریخ الاُمم و المُلوک،** از امام محمد بن جعفر طبریؒ، ج:4، ص:29، طبع: **دارالکتب العلمیہ، بیروت. و تاریخ الخلفاء،** از علامہ جلال الدین سیوطیؒ، ص:178، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی۔

131۔ قریش کے بارہ خلفا کے بارے میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: **''لایزال الإسلام عزیزا إلی إثنی عشر خلیفةً ... کلهم من قریش.''** (صحیح مسلم، حدیث 4708) (اسلام اس وقت تک ہمیشہ غالب رہے گا، جب تک کہ بارہ خلیفہ رہیں گے۔اور وہ تمام کے تمام قریش سے ہوں گے۔)

ایک دوسری روایت میں ہے: **''لایزال هٰذا الدّین عزیزاً منیعًا إلی إثنی عشر خلیفة... کلهم من قریش.''** (صحیح مسلم، حدیث 4710) (ہمیشہ یہ دین زبردست اور غالب رہے گا، جب تک بارہ خلفا ہوں گے۔اور وہ تمام قریش سے ہوں گے۔)

مولانا سندھیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے **''التّمهید''** میں دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''ان بارہ خلفا سے مراد درجِ ذیل خلفا ہیں: (1) حضرت ابوبکر صدیقؓ، (2) حضرت عمر فاروقؓ، (3) حضرت عثمان ابن عفانؓ، (4) حضرت علی کرم اللہ وجہہ، (5) حضرت امیر معاویہؓ (حضرت حسنؓ سے صلح کے بعد) (6) عبدالملک ابن مروان اُموی (حضرت عبداللہ ابن زبیر کے بعد)، (7) ولید ابن عبدالملک اُموی، (8) سلیمان ابن عبدالملک اُموی، (9) عمر بن عبدالعزیز اُموی، (10) منصور عباسی، (11) مہدی عباسی، (12) ہارون الرشید عباسی (متوفی 193ھ)۔ان بارہ خلفا کے زمانے میں اسلام مضبوط اور مستحکم رہا۔ان کے درمیان کے باقی حکمرانوں اور بعد کے حکمرانوں کے زمانے میں انتشار اور کمزوری رہی۔ ان کا زمانہ تقریباً دوسو سال کا بنتا ہے۔(**التّمهید لتعریف أئمّة التّجدید،** ص19-318)

132۔ تلخیص از تاریخ فقہ اسلامی، تالیف: علامہ شیخ محمد خضری بک، اردو ترجمہ، ص:192، طبع: دارالاشاعت، کراچی۔

133۔ **روض النّضیر شرح مجموع الفقه الکبیر،** از شرف الدین حسین بن احمد صنعان، طبع: کتبہ خانہ مؤسسہ علمی، فرہنگی دارالحدیث، قم، ایران۔

134۔ امام ابراہیم بن میمون صائغ مروزیؒ: یہ امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ اور عطا ابن ابورباحؒ کے

www.rahnuma.org

شاگردوں میں سے ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں حسان بن ابراہیمؒ، امام نسائیؒ اور امام ابوداوٗدؒ ہیں۔ امام نسائی "سنن نسائی" میں ان کے بارے میں کہا کہ: "ان سے حدیث لینے میں کوئی حرج نہیں۔" یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ: "یہ ثقہ ہیں۔" ابن حبانؒ نے بھی ان کا تذکرہ ثقہ لوگوں میں کیا ہے۔ امام سمعانیؒ کہتے ہیں کہ: یہ بڑے فقیہ اور فاضل آدمی تھے۔ ابو مسلم خراسانی نے انھیں ۱۳۱ھ/ 749ء میں مرو میں شہید کر دیا تھا۔

(الجواهر المضیئة۔ ج:01۔ص:50-49)

علامہ ذہبیؒ نے "سیر اعلام النبلاء" میں لکھا ہے کہ:

"یزید نحوی نے فرمایا کہ: میرے پاس ابراہیم صائغؒ آئے اور مجھ سے کہا کہ: "کیا تو یہ دیکھ نہیں رہا ہے کہ یہ طاغوتی جماعت کیا کام کر رہی ہے؟ کیا ہمارے اہل علم کے سوا لوگ اس (ابومسلم خراسانی) کے ساتھ مال و دولت کی وجہ سے نہیں ہیں؟"

میں نے ان سے کہا کہ: "کاش میں جانتا کہ میرے اچھی بات کہنے اور بُری بات کے روکنے پر وہ (ابومسلم خراسانی) میرے ساتھ گفتگو کرے گا یا قتل کرے گا تو میں ایسا ضرور کرتا، لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم پر مصیبت نہ آجائے۔ میں بوڑھا آدمی ہوں اور مصیبت برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔"

اس پر (ابراہیم) صائغ نے کہا کہ: "میں اس سے باز آنے والا نہیں ہوں۔" چناں چہ وہ (ابومسلم خراسانی) کے پاس گئے اور صحیح بات کا حکم دیا اور غلط باتوں سے روکا تو اس نے انھیں قتل کر دیا۔"

(سیر اعلام النبلاء، تذکرہ ابومسلم خراسانی، ج:5،ص:334،طبع: دارالکتب العلمیہ بیروت)

135۔ أحکام القرآن ۔ از امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازیؒ۔ تفسیر سورۃ آلِ عمران. "باب فرض الأمر بالمعروف و النهی عن المنكر" ۔ ج:02۔ص:33۔ طبع: سہیل اکیڈمی، لاہور۔

136۔ فیوضِ یزدانی، مجلس نمبر 23، اردو ترجمہ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ، ص: 40-139، طبع: دارالاشاعت، کراچی

137۔ القرآن 55:12۔

138۔ فیوضِ یزدانی، مجلس نمبر 21۔

139۔ القرآن 2-3:62۔

140۔ ہمیں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی کتاب ''التّمہید'' کا ایک ابتدائی مسودہ دستیاب ہوا ہے، جس پر کتاب لکھنے کے آغاز کی تاریخ ۸؍شوال ۱۳۴۷ھ/ 1929ء درج ہے۔ اس مسودے میں تاریخ سے متعلق چند ابتدائی باتیں حضرت سندھیؒ نے تحریر کی ہیں۔ اسی مسودے میں تاریخ کے ادوار و مراحل کا تعین کرنے کے لیے حضرت سندھیؒ نے درجِ ذیل اصول اور ضابطہ بیان کیا ہے:

''مبدأ أدوار التّاریخ لایکون إلاّ إنقلابًا عمومیًّا، یتغیّر بهٖ ذهنیة عامّة النّاس من الحالة السّیّئة إلیٰ الحالة الحسنة، أو فتنة إرتجاعیة یفسد بها النّظام الإرتقائی، فالفتن الّتی حدثت في الإسلام قبل تمکّن الحکومة فی الهند لانبحث عنها إلاّ إجمالاً.'' (عکس قلمی مسودہ تحریر کردہ: امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی، ص55، بتاریخ: 8؍شوال 1347ھ/ 19؍ مارچ 1929ء)

141۔ إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء. المقصد الأوّل، فصل چهارم، أحادیثِ خلافت، مسند عبدالله بن مسعودؓ، ج1، ص: 87-286۔

142۔ حُجَّةُ اللّٰهِ البالِغه، المبحث الخامس مبحث البرّو الإثم، باب الإیمان بأنّ العبادة حقّ اللّٰه تعالیٰ علیٰ عبادهٖ، ج:1، ص:204 تا 206، طبع: بیروت۔

143۔ الانتباه فی سلاسل أولیاء اللّٰه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص:130، طبع: دہلی۔

144۔ سلطان خسرو شاہ بن بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن سلطان مودود بن سلطان محمود غزنوی نے اپنے والد سلطان بہرام شاہ کی وفات کے بعد حالات کی خرابی کے باعث غزنی چھوڑ کر لاہور آنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اس طرح اس کے زمانے میں غزنوی سلطنت، غزنی سے لاہور منتقل ہوگئی۔

اس حوالے سے منشی ذکاء اللہ ''تاریخ ہندوستان'' میں لکھتے ہیں:

''سلطان بہرام شاہ نے جب وفات پائی تو بہ اتفاقِ امر خسرو شاہ تختِ (سلطنت) پر بیٹھا، لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ غزنی میں علاؤالدین غوری آن پہنچا ہے، تو وہ مع اہل عیال کے ہندوستان کو روانہ ہوا اور لاہور میں اقامت (اختیار) کی۔ یہاں ہندوؤں نے اس کی نہایت تعظیم وتکریم کی۔ ان سب کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کے شہر میں ایک سلطنت قائم ہوگئی۔ اس طرح غزنی کی سلطنت ہندوستان میں منتقل ہوگئی۔''

(تاریخ ہندوستان از منشی ذکاء اللہ۔ ج:1،ص:43-342۔ طبع: سنگِ میل، لاہور)

145۔ یہ بات طے ہے کہ سلطان خسرو شاہ کی حکومت کا آغاز اس کے والد سلطان بہرام شاہ کی وفات سے ہوا۔ البتہ سلطان بہرام شاہ کے سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس کا انتقال ۵۴۲ھ/ 1147ء میں ہوا، جب کہ دوسری روایت کے مطابق اس کا انتقال ۵۴۷ھ/ 1152ء میں ہوا۔

مولانا سندھیؒ نے پہلے سنِ وفات کو ترجیح دی ہے، البتہ منشی ذکاء اللہ کے مطابق دوسری روایت صحیح ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''صحیح روایت کے موافق ۵۴۷ھ/ 1152ء میں اس (سلطان بہرام شاہ) کی وفات ہوئی۔ اس کی سلطنت کی مدت کوئی (سالِ وفات ۵۴۲ھ / 1147ء کے مطابق) 35 سال اور کوئی (سالِ وفات ۵۴۷ھ/ 1152ء کے مطابق) 41 سال بتاتا ہے۔'' (حوالہ بالا)

146۔ تاریخِ ہندوستان از منشی ذکاء اللہ، ج:1،ص:43-342۔ طبع: سنگِ میل، لاہور۔

147۔ تاریخِ فرشتہ (مترجم)، ج:1،ص:60-159، طبع: دوست ایسوسی ایٹس، لاہور۔

148۔ تاریخِ ہندوستان، از منشی ذکاء اللہ، ج:2۔ص:206۔

149۔ ایضاً، ج:2،ص:127۔

150۔ منشی ذکاء اللہ نے ''تاریخ ہندوستان'' میں لکھا ہے کہ:

''سلطان سکندر لودھی کے عہد سے پیش تر مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں ہندوؤں میں فارسی زبان پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ جب سلطان کو نوکری کے لیے فارسی خوان ہندوؤں کی ضرورت ہوئی تو اُس نے فرمایا کہ:

''کدام ہندو بچہ است کہ فارسی مے داند؟'' (کون سا ہندو بچہ ہے، جو فارسی جانتا ہے؟)

جواب ملا کہ: ''کوئی نہیں۔'' اس پر اس نے ہندوؤں سے درخواست کی کہ وہ فارسی زبان پڑھیں۔ چناں چہ شودروں میں سے کائستوں نے، جو پہلے سے سنسکرت کی لکھائی کی اُجرت سے گزر اوقات بسر کرتے تھے، بہ سرو چشم اس حکم کو قبول کیا۔ اپنے حاکموں کی زبان سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں کے عہدِ سلطنت میں اُن کا پہلے سے زیادہ عروج ہوگیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے علوم سے ایسی آگاہی ہوگئی کہ وہ ان علوم کا درس دینے لگے۔ پنڈت ڈوگرمل تو شاعر بھی ہوگئے۔

بادشاہ کو تصنیفات کا ایسا شوق تھا کہ وہ ہر علم میں کتابیں علما سے تصنیف کرواتا۔ اُس نے

www.rahmia.org

اپنے حکم سے مہاویدک کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی زبان میں کرایا۔ اُس نے خراسان اور ہندوستان کے طبیبوں کو جمع کیا۔ دونوں طرح کی طب کی کتابوں سے اُس نے انتخاب کرایا۔ اس کا نام ''طبِ سکندری'' رکھا، جو ایک معتبر کتاب علم طب میں سمجھی گئی۔''

(تاریخ ہندوستان۔ جلد:02۔ ص:79-378)

151۔ بابا گرونانک کی پیدائش 1469ء کی ہے اور ان کا انتقال 1539ء کو ہوا۔ یہ شیخوپورہ کے قریب ہندو کھتریوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں انھوں نے دولت خان لودھی کے پاس بہ طورِ اکاؤنٹنٹ ملازمت کی، جو شمالی ہندوستان کے قصبے سلطان پور کا حاکم تھا۔ اسی عرصے میں 18 یا 22 سال کی عمر کے دوران نانک نے مذہبی تجربہ کیا اور ایک مسلم گویے کے ہمراہ بصیرت کی تلاش میں طویل اسفار کیے۔ بالآخر 1520ء میں شمالی ہندوستان کے خطے پنجاب میں واپس آئے۔

ان کی زندگی کے باقی سال لاہور سے شمال کی جانب واقع ایک گاؤں ''کرتارپور'' میں بسر ہوئے۔ اوّلین روایات کے مطابق نانک نے بغداد اور مکہ مکرمہ کے سفر بھی کیے۔ بعد میں دیگر جگہوں کی سیاحت بھی کی۔ نانک کی تعلیمات کو مختصراً ایک عقیدۂ نجات کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔ (عالمی انسائیکلوپیڈیا۔ ج:2۔ ص:2055۔ طبع: فیصل ناشران، لاہور)

152۔ تذکرۃُ الرّشید، ج:2، ص:232، طبع: مکتبہ مدنیہ، اردو بازار، لاہور۔

153۔ القرآن: 38:33۔

154۔ تاریخِ ہندوستان، از منشی ذکاء اللہ، ج:7، ص:53، 55، 56۔

155۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ حاشیے میں لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یہ حوالہ ''مآثر الکرام'' میں نہیں ملا۔ اور اللہ زیادہ جانتا ہے۔''

156۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تصنیف کردہ ایک رسالے ''ردّ روافض'' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جس کا نام ''المقدّمة السَنِية فی إنتصار الفرقة السُّنّية'' رکھا تھا۔ یہ رسالہ انھوں نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران حضرت شیخ ابوطاہر کردی کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ اس رسالے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''الرّسالة الّتی أنشاء ها أوحد زمانه، و فرید أوانه، الجهبذ الرّاسخ فی الشّریعة و الطّریقة، و الطّود الشّامخ فی المعرفة و الحقیقة، ناصر السّنة،

قامع البدعة، سراج اللّٰه الموضوع يستضىء به مَن شاء مِن عبادهٖ المؤمنين، و سيف اللّٰه المسلول علٰى أعدائه من الكفرة و المبتدعين، الإمام العارف، العالم الألمعى مولانا الشّيخ أحمد الفاروقى، الماتريدى، الحنفى، النّقشبندى، السّهرندى. جزاهُ اللّٰه سبحانهٗ عن المسلمين خير الجزاء، و أحلّه بحبوبه الخلد، و بوّاهُ حظيرة الرّضا.“

(یہ رسالہ لکھنے والی شخصیت وہ ہے، جو اپنے زمانے میں منفرد ہے۔ اپنے وقت کی یکتا ہے۔ شریعت اور طریقت میں بڑے راسخ اور ماہر عالم ہیں۔ معرفت اور طریقت کے اونچے پہاڑ ہیں۔ سنت کی مدد کو پھیلانے والے ہیں۔ بدعت کا قلع قمع کرنے والے ہیں۔ اللہ کا ایسا چراغ ہیں، جس سے اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، منور کرتا ہے۔ اللہ کے دشمنوں، کافروں اور بدعتیوں کے مقابلے پر اللہ کی کھلی تلوار ہیں۔ امام، عارف، ذہین عالم مولانا شیخ احمد فاروقی ماتریدی، حنفی، نقشبندی، سرہندی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مسلمانوں کی جانب سے انھیں اچھی جزا دے اور انھیں جنت الفردوس میں پہنچائے اور اپنی رضامندی کے حظیرۃ القدس میں ٹھکانہ دے۔)

اسی رسالے میں حضرت مجدد صاحبؒ کے پانچ تجدیدی امور کا ذکر کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:

”ان امور کی وجہ سے شیخ کی یہ حالت ہے کہ سوائے مؤمن متقی کے اور کوئی ان سے محبت نہیں کرتا۔ سوائے بدبخت فاسق و فاجر کے کوئی ان سے بغض و عداوت نہیں رکھتا۔“

(**المقدّمة السَّنِية فى انتصار للفرقة السُنّية**، تصنیف: امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص:43، طبع: حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ، دہلی، 1983ء)

157۔ القرآن: 83:4۔

158۔ ایضاً۔

159۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ: خلیق نظامی، ص:12، طبع: ادارۂ اسلامیات، لاہور۔

160۔ **البُدور البازغه** (عربی)، ص94۔

161۔ مندرجہ بالا پیش کردہ 22 اُصول کے ماخذ درج ذیل کتب ہیں:

1. حُجّة اللّٰه البالغه: باب سياست المدينه. البُدور البازغه، مبحث الارتفاق الثّالث، الخير الكثير.

2. أیضاً، باب ابتغاء الرزق 3. أیضاً

4. أیضاً، باب سیاست المدینه، باب الرُّسوم السّائره بین الناس

5. أیضاً، باب ابتغاء الرزق 6. ایضاً

7. أیضاً، باب إقامة الارتفاقات و إصلاح الرُسوم و باب ضبط المبهم

8. أیضاً، باب البیو ع المنهی عنها

9. أیضاً، باب الارتفاق الرّابع و باب البیو ع

10. إزالة الخفاء جلد دو م عهد فاروق اعظم

11. حُجّة اللّٰه البالغه: باب أصل الدّین واحد

12. البُدور البازغه: فصل حقائق الارتفاقات اور مقاله ثالثه وغیره)

162۔ حُجّة اللّٰه البالغه، باب سیاسة المدینه، مبحث الارتفاقات۔

163۔ ایضاً، باب إقامة الارتفاقات و إصلاح الرّسوم، ج:1،ص303۔

164۔ ایضاً۔باب إقامة الارتفاقات و إصلاح الرّسوم.

165۔ ایضاً۔

166۔ ایضاً۔

167۔ الخیر الکثیر، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص: 262، طبع: قرآن محل، کراچی۔

168۔ حُجّة اللّٰه البالغه، باب الجهاد، ج:2،ص434۔

169۔ ایضاً، باب الارتفاقات و إصلاح الرّسوم"، ص 99-298.

170۔ ایضاً، ص 99-298.

171۔ التّفهیمات الإلٰهیه، ج: 1، تفهیم نمبر 28، ص 92.

172۔ علامہ ابن خلدونؒ نے "مقدمه ابن خلدون" میں "الکتاب الأوّل" کے "الباب الأوّل فی العمران البشری علی الجملة" کا پہلا مقدمہ ہی یوں تحریر کیا ہے:

"فیکون ذٰلک الوازع (الحاکم) واحداً منهم، یکون لهٗ علیهم الغلبة، و السّلطان، و الید القاهرة؛ حتّٰی لا یصل أحد إلٰی غیرہٖ بعدوان؛ و هٰذا هو معنی المُلک. و قد تبیّن لک بهٰذا أنّهٗ خاصّةً للإنسان طبیعیّةٌ، و لا بُدّ لهم منها ......و تزید الفلاسفة علٰی هٰذا البُرهان: حیث یحاولون: إثبات النّبوّة بالدّلیل العقلی، و أنّها خاصّة طبیعیة للإنسان، فیقرّرون هٰذا البُرهان إلٰی

غـايتـهٖ: و أنـّهٗ لا بُدّ للبشر من الحكم الوازع، ثمّ يقولون بعد ذٰلک، و ذٰلک الحُكم يكون بشرع مفروض من عند اللّٰه يأتى به واحد من البشر. و أنّهٗ لا بُدّ أن يكون متميّزاً عنهم بما يودِع اللّٰه فيه من خواصّ هدايتهٖ، ليقع التّسليم لهٗ و القبول منهٗ، حتّٰى يتمّ الحكم فيهم و عليهم من غير إنكار و لا تزييف. و هٰذهٖ القضيّة للحكماء غير بُرهانية كما تراهٗ؛ إذ الوجود و حياة البشر قد تتمّ من دون ذٰلک بما يفرضهٗ الحاكم لنفسهٖ، أو بالعصبية الّتى يقتدر بها علٰى قهرهم و حملهم علٰى جادّتهٖ، فأهل الكتاب و المتّبعون للأنبياء قليلون بالنّسبة إلٰى المجوس ــ الّذين ليس لهم كتاب ــ فإنّهم أكثر أهل العالَم؛ و مع ذٰلک فقد كانت لهم الدُّول و الآثار فضلاً عن الحياة؛ و كذٰلک هى لهم لهٰذا العهد فى الأقاليم المنحرفة فى الشّمال و الجنوب بخلاف حياة البشر فوضى دون وازع (حاكم) لهم البتّة، فإنّه يمتنع. (تاريخ ابن خلدون، از علامه ابن خلدون، المقدمه، الجزء الأوّل، الكتاب الأوّل، الباب الأوّل فى العمران البشرى علٰى الجملة، ص 44 تا 46، طبع: دارالكتب العلمية، لبنان)

173۔ ایضاً۔

174. ایضاً. الفصل الخامس و العشرون فى معنى الخلافة و الإمامة، ص 102.

175. حُجّة اللّٰه البالغه، مبحث السّادس؛ السّياسة الملّية، باب إقامة الارتفاقات و إصلاح الرّسوم، ج: 1، ص 04-303.

176۔ القرآن 12:55-54۔

177۔ صحيح بخارى، كتاب العلم، باب من سئل علماً، حدیث 59۔

178۔ إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، ج:3،ص:474۔

179۔ ایضاً،ص487۔

180۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا یہ مفصل فتویٰ ''فتاویٰ عزیزیہ'' میں موجود ہے۔ اس کی اصل عبارت درج ذیل ہے:

''حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ در رسالۂ خود (احکامِ اراضئ ہند) اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سوادِ عراق کہ در عہدِ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ مفتوح شدہ بود، موقوف بر مِلکِ بیت المال است، و زمین داراں را بیش از تولیت و

دار وغگی تر دد، وفراہم آوردن مزارعین، واعانت وزراعت وحفظ دخلے نیست۔‘‘

(فتاویٰ عزیزیہ از حضرت امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، ج:1، ص:43، طبع مجتبائی، دہلی انڈیا)

(حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری نے اپنے رسالے میں یہ مؤقف اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اپنی فتح کے زمانۂ ابتدا سے ہی عراق کی زمینوں کی طرح (جو کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے۔ اور زمین داروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور وفکر میں رہنے کے سوا اور کوئی حق نہیں ہے۔ اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔)

چناں چہ اس کی بنیاد پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے لکھا ہے کہ:

’’علمائے اسلام کے فتاویٰ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کی زمین حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے .... علمائے اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضیٔ ہند پر جو تصرفات قائم رکھے، نیز بادشاہ شاہ عالم نے سرطامس روکو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمین داروں کے متعلق جو معاہدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالے کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معاہدہ کیا، وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت، اراضیٔ ہند کو زمین دار اور تعلقہ دار کی ذاتی اور شخصی ملکیت نہیں سمجھتے۔ اور حکومت کی مِلک شمار کرتے ہوئے ان کو نگران اور قیم کی حیثیت دیتے تھے۔‘‘

(اسلام کا اقتصادی نظام، از حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، ص411 تا 416، طبع مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور)

181۔ مولانا سندھیؒ کا ترتیب دیا ہوا یہ انقلابی پروگرام ’’آزاد برصغیر کا دستوری خاکہ‘‘ کے عنوان سے 15 ستمبر 1924ء کو ترکی سے طبع ہوا تھا، لیکن 1925ء میں حکومتِ برطانیہ نے اس پر پابندی عائد کردی تھی۔ پھر 1926ء میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ اس کے ابواب قائم کرکے بہ ظاہر جزوی تبدیلیاں کر کے دوبارہ شائع کیا گیا، تاکہ پابندی کی زد میں نہ آئے۔ فروری 1956ء میں یہ پروگرام ’’انجمن ترقی اردو (پاکستان)‘‘ کراچی کے سہ ماہی مجلّے ’’تاریخ و سیاست‘‘ کے شمارے میں طبع ہوا۔ بعد میں پروفیسر محمد سرور (مرحوم) نے حضرت سندھیؒ کے ’’خطبات و مقالات‘‘ ترتیب دیے تو اس میں شامل ہو کر طبع ہوا۔ ستمبر

2002ء میں راقم سطور نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے خطبات و مقالات کو نئی ترتیب اور مزید مقالوں کے اضافے کے ساتھ مرتب کیا ہے اور اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں دیکھئے! صفحات 131 تا 191۔

182۔ خطبات و مقالات مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مرتبہ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، ص365، مطبوعہ دارالتحقیق والاشاعت، لاہور

183۔ ایضاً، ص 368 تا 372۔

184۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ یہ بات لکھتے ہوئے قرآن حکیم میں سورت القصص کی اس آیت مبارکہ سے استدلال کررہے ہیں:

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ (5:28)

(اور ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں، جو ملک میں کم زور کردیے گئے تھے۔ اور انھیں سردار بنا دیں۔ اور انھیں وارث بنا دیں۔)

185۔ **حجّة الله البالغه**، ج:1، ص: 206 تا 208، طبع بیروت۔

☆......☆......☆

www.rahimia.org

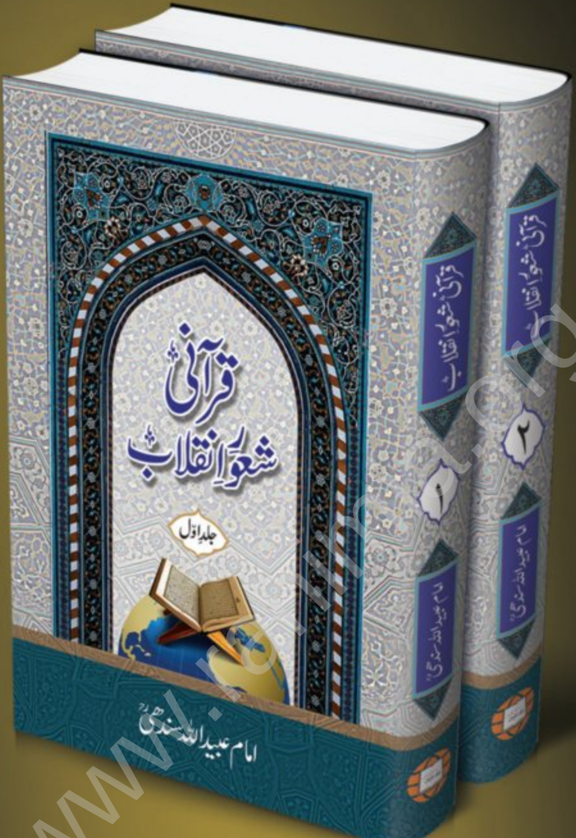

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org
info@rahimia.org /rahimiainstitute